سہ ماہی

اُردو

جوبلی نمبر

« تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اُردو »

•

مرتبہ

سید ہاشمی فرید آبادی

جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو پاکستان

رسالۂ اردو

جلد نمبر ۳۲	جولائی و اکتوبر ۱۹۵۳ء	نمبر ۳ و ۴

غلط نامہ

(کتابت کی چھوٹی موٹی غلطیاں جابجا رہ گئی ہیں۔ کم سے کم اغلاط ذیل درست کرلی جائیں)۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰	۱۳	بیچ	بیج
۱۲	۹	سیاسی شعور	سیاسی شورش
,,	۱۵	نا مصنفانہ	نامنصفانہ
۲۰	۱۳	ابن مشکویہ	ابن مسکویہ
۲۶	۱۹	ہوں	ہُوئے
۲۷	۱۶	۱۹۱۴ء	۱۹۱۴ع سے
۳۱	۴	اصطلاحات علم	اصطلاحات علوم
۴۰	۶	دکن لغات	دکنی لغات
۴۰	۲۱	عربی الاصل . . بھیجتے تھے	(پوری سطر خارج کی جائے)
۴۲	۱۰	سحی	سچّی
۴۹	۲۴	اس	اُسی
۵۸	۱۰	حکانے	چُکانے
۶۲	۲۲	ھندستان کے	ھندستان کی
۶۳	۲۳	مقلدوبےخبر	مقلّد و بے خبر
۶۵	۸	مسلماں	مسلمانوں
۶۵	۱۵	,,کد	کہ
۶۸	۲۱	چالیس	پینتالیس
,,	۲۴	۳۳	۳۷
۷۳	۱۹	تعلق میں	تعلق ہے
۷۸	۲۴	سال میں	سال سے
۸۰	۴	ہوا کے	ہُوا کہ
۹۳	۱۱	بولوی	مولوی صاحب
۹۵	[illegible]	کے صدر	کی صدارت
,,	۲۳	اپنی دونوں	انہی دنوں
۹۶	۱۴	گیا بعض	گیا، جو بعض
۹۸	۱۹	گرے جوالٹوں	گرے جُوایٹوں
۱۰۰	آخر	انجمن کی	انجمن سے
۱۰۷	۲۶	وے زھے	ہوتے رہے
۱۰۸	۲۵	اساوں	اُستادوں
۱۱۲	۱۵	ان	اس
۱۱۸	۲	وحوانوں	نوجوانوں
,,	۱۷	بھجے	بھیجے
۱۲۱	۱۲	کمٹی	کمیٹی
۱۲۲	۱	انہوں	انہوں نے
,,	۷	اسم (دوجگہ)	رسم
,,	۲۱	جزم	جُرم
,,	۲۴	جھانپا	چھاپنا
۱۲۵	۳	جای ہے	جاتی تھی
,,	۲۱	بھرے پڑے	بھرے پُرے
۱۲۷	۴	بجے	بچے
,,	۱۲	ہوگئیں تھی	ہوگئی تھیں
۱۲۸	۷	تل	قتل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
,,	۲۵	دو را	دوسرا
۱۳۲	۲۰	بہوپال	بھوپال
۱۴۳	۲	وغیر	وغیرہ
,,	۱۳	اے	جاے
۱۵۱	۵	دال	داخل
,,	۲۴	ایسے	ایسی
۱۶۱	۶	تگ ورو	تگ و دو
۲۰۲	۱۴	اشر	اشرف

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۱	۶	مون	کاموں
۱۹۶	۱۲	صدری	صدی
۱۹۷	۱۱	ہیں کی	ہیں جن کی
۱۹۸	۵	کا ماہر	کے ماہر
,,	۱۰	اندرہ	زندہ
,,	۲۰	اٹھیں	آٹھویں

——:o:——

انجمن پریس ، لارنس روڈ ، کراچی ۳

تاریخ انجمن ترقی اُردو

سنہ ۱۹۰۳، تا سنہ ۱۹۵۳ع

مطابق سنہ ۱۳۲۱ تا ۱۳۷۲ھ

تمہید

انجمن ترقی اردو کی جوبلی سندھ کے جنوب مغربی گوشے میں منای جارھی ھے۔ بعض اھل فکر بناے پاکستان کو ھندستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سر آغاز خیال کرتے ھیں۔ کیا عجب کہ یہ جلسہ جوبلی بھی زبان اردو کی تاریخ میں اس کے جدید و پر عظمت دور کا عنوان ثابت ھو؟ کیونکہ اردو فی الواقع ملت اسلامیہ ھند کی زبان ھے۔ بر عظیم کے اس خطے میں جو اب پاکستان موسوم ھوا، مسلم قوم کے آباد ھونے کے ساتھ وجود میں آتی ھے۔ اسی قوم کے پھیلنے کے ساتھ دو آب میں، مالوہ، گجرات دکن اور بنگال میں پھیلتی ھے اور بالآخر جملہ ممالک ھند کی زبان (''ھندستانی'') کہلاتی ھے۔ برطانی اقتدار کے زمانے میں اردو، علم و ادب کی مسند پر فارسی کی جانشین ھوجاتی ھے۔ جس وقت انگریزوں کی سرپرستی ایک غیر مسلم قومیت تیار کرتی ھے اس وقت مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب و قومیت کی ایک ممتاز نشانی یہی زبان قرار پاتی ھے۔

دو سال ھوے اردو کانفرنس، کراچی کے جلسوں میں صوبہ سرحد اور بلوچستان کے بعض معزز عمائد نے فرمایا کہ اردو اسی پاکستان میں پیدا ھوی تھی، ایک عرصہ تک ھندستان کے ملکوں میں گشت لگایا، جوانی کی قوت اور علم و بصیرت حاصل کرکے دوبارہ اپنے مولد میں آئی ھے۔ یہ قول خالی شاعرانہ خیال آرائی نہیں

بلکہ ایک حقیقت کی یاد دلاتا ہے اور ہماری ملی مصالح اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اہل پاکستان اسے اچھی طرح سمجھیں اور خاطر نشیں فرمائیں :— گزشتہ صدی میں عام طور سے کہا اور لکھا جاتا رہا کہ آردو کی پیدائش اور پرورش دہلی (''شاہ جہانی لشکر'') میں ہوی اور اس کی دوسری تربیت گاہ لکھنو تھا - لیکن قرن حاضر میں دکنی ادبیات غفلت کے اندھیرے سے تحقیق کی روشنی میں آئیں - معلوم ہوا کہ مغلوں کی بادشاھی بھی ہندستان میں قائم نہیں ہوی تھی جب کہ یہی زبان قدیم لباس میں بولی بلکہ لکھی جارہی تھی - اسی پر اہل دکن کو دعویٰ ہوا کہ یہ پود ہماری لگای ہوی ہے - سنہ ۱۹۲۸ء میں پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کی ''پنجاب میں آردو'' نمودار ہوئی جس میں لسانیاتی اور تاریخی دلائل سے اس زبان کا آغاز ملک پنجاب میں دکھایا گیا ہے - آردو کے دور جدید کا پہلا شاعر ولی گجراتی مسلم ہے - سراج الدین علی خان آرزو سب سے فصیح بولی کا گھر گوالیر بتاتے ہیں - اس طرح گجرات اور مالوے کو اپنی فوقیت جتانے کی گنجائش مل جاتی ہے - نویں صدی ہجری (پندرھویں عیسوی) کے شرف نامے اور بنگالے کے قدیم ہندی گیتوں کو ٹھوک بجا کے دیکھا جاے تو وہاں ہماری زبان کے ابتدائی نقوش آبھر سکتے ہیں - وادئی سندھ کے حق قدامت کا ، حال میں اہل قلم نے اشارہ کیا ہے - (۱)

یہ دعاوی بظاہر متضاد نظر آتے ہیں - لیکن سطحی خیالات اور ضعیف روایات کی تہیں کھرچ دی جائیں ، تو سادہ حقیقت چمکنے لگتی ہے - وہ یہ کہ جب مسلمان باہر سے آکر ، ممالک ہند میں رس بس گئے اور یہاں کی بولی بولنے لگے ، اسی زمانے سے ایک نئی مخلوط زبان کا آغاز ہوا - اسے وہ ''ہندی'' یا ''ہندوی'' کہتے تھے ، اور جب عربی رسم الخط (نسخ) یا فارسی نستعلیق میں لکھی جانے لگی تو لازماً وہ ہندستان کے مسلمانوں کی اپنی زبان بن گئی - تاریخ میں پہلا مسلمان شاعر جس نے ''ہندوی'' میں دیوان تصنیف کیا مسعود سعد سلمان لاھوری تھا - وہ پانچویں صدی ہجری یعنی (گیارھویں عیسوی) میں گزرا ہے اسی صدی کے ثلث اوّل میں سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کا الحاق کیا اور اس میں جا بجا مسلمانوں کی باقاعدہ نو آبادیاں بسیں ، لاھور ایک بڑا دارالملک اور تہذیب کا مرکز بن گیا ، سلمان کا ہندی

(۱) خصوصاً ملاحظہ ہو خطبہ سید حسام الدین صاحب راشدی ، رسالہ آردو ، اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء

دیوان سلامت نہیں رہا ، صرف تذکرہ باقی ہے لیکن شیخ فریدالدین گنج شکر رح کے ایک صدی بعد ملتان میں رشد و ہدایت فرماتے ہیں ، اُن کا مجمل مکالمہ اور چند شعر اسی مخلوط ,, ہندی ،، میں محفوظ ہیں ۔ آیندہ دو صدی کی تاریخوں میں اُچھ اور ٹھٹھہ میں اسی بولی کا رواج ہونے اور یہیں سے گجرات جانے کا سراغ ملتا ہے (۱) یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمان تمام شمالی ہندوستان کے علاقے فتح کرلیتے ہیں اور دھلی اُن کا دارالسلطنت بن جاتی ہے ۔ اگلی صدی کے اواخر میں اقلیم شعر و موسیقی کی بادشاہی امیر خسرو رح کے حصے میں آتی ہے ۔ وہ ہندی ماں کے بیٹے ، اور ہندی زبان پر فارسی قلم لگانے کی بے مثل قابلیت رکھتے تھے ۔ اسی مخلوط بولی میں اُن کی بعض پہیلیاں ، دو سخنے اور کم سے کم ایک غزل مدت سے مشہور ہے : ز حال مسکین مکن تغافل ـــــ الخ ۔ اُن کی تصانیف میں دو اصطلاحیں یاد رکھنے کے قابل ہیں : ۱- زبان دھلوی - ۲- ریختہ - پہلی کا نمونہ اسی نام کی صراحت کے ساتھ سب سے پہلے شیخ بہاؤالدین باجن تحریر کر گئے ہیں ۔ حال آنکہ خود وہ برھان پور کے رہنے والے تھے ۔ ایک عرصے تک گجرات میں رہے سنہ ۹۱۲ھ میں وفات پائی ۔ اُن کے ,, بزبان دھلوی گفتہ ،، اشعار میں مغربی دو آب کی بولی کا اثر نمایاں ہے ۔ لیکن بہرحال یہ دھلی خالص مسلمانوں کی دھلی اور یہ ہندی زبان انہی کی مشترکہ بول چال کی زبان تھی جو آٹھویں اور نویں صدی میں سندھ و گجرات سے بنگال تک اور جنوب میں گلبرگہ اور بیدر تک بولی جاتی تھی ۔ دکن میں آج تک اُردو کا قدیم نام ,, مسلمانی بولی ،، سننے میں آتا ہے ۔ رہا ریختہ ، یہ شروع میں ہندی فارسی کے مشترک راگ کے لیے امیر خسرو رح نے ایجاد کیا ۔ پھر ان زبانوں کے مرکب اشعار پر بولا گیا اور آخر میں اسی مخلوط زبان کی نظم و نثر دونوں پر چسپاں ہوگیا جسے اب اُردو کہا جاتا ہے ۔

دکن میں ادبی صورت اختیار کرنے کے باوجود ، شمالی ہند میں یہ مسلمانوں کی ,, ہندی ،، بول چال کی زبان رہی ۔ علمی اور تحریری کام فارسی سے لیا جاتا تھا ۔ سلاطین تیموری کے عہد اقبال میں فارسی ادب کو ہندستان میں بہت فروغ ہوا ، تاہم

(۱) ,, تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ،، جلد دوم ، باب چہارم میں ہم نے کسی قدر تفصیل سے یہ بحث کی ہے ۔ نیز ملاحظہ ہو ,, پنجاب میں اُردو ،، مقدمہ ۔

دربار شاہی اور حلقۂ علما کے باہر وہی مخلوط ہندی یا قدیم آردو بولی جاتی تھی۔ دکن کے ملا وجہی کے بقول (گیارھویں صدی ہجری میں) اسے ''زبان ہندستان'' کہنے لگے تھے۔ یورپ کے سیاح و سوداگر بھی اسی زمانے سے اسے ''ہندستانی'' موسوم کرتے ہیں۔ خالق باری، صمد باری وغیرہ درسی کتابوں کی تصنیف کا بھی زمانہ ہے جو شمالی ہند کے مسلمان بچوں کو فارسی سکھانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان شہادتوں کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید آردو کے سب سے پہلے شاعر ولی گجراتی اور سراج دکنی تھے، اسی دور میں سندھ، سرحد، بنگال، مدراس، میسور میں ریختہ کے گیت گائے جاتے تھے۔ آردو کے پہلے سے موجود اور مقبول عام ہونے کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا کہ جب انگریزوں نے فارسی چھڑوای تو صرف چالیس پچاس برس کے اندر (جدید) آردو نئے ادب اور علوم کی زبان بن گئی۔ فورٹ ولیم کلکتہ میں معیاری نثر کی کتابیں لکھوائی گئیں، انگریز عمال کو آردو پڑھانے کا نصاب تیار ہوا۔ پادریوں نے اور پھر عام اہل شوق نے آردو اخبار و مطابع جاری کیے دھلی کالج میں وہ اعلیٰ مغربی علوم کا ذریعۂ تعلیم بنی۔ بمبئی کے آردو ناٹک، مدراس میں جمعے کے خطبے، محرم کی مجلسیں اس میں تحریر ہوئیں۔ شاہ ولی اللہ رح کے بعد ان کی اصلاحی تحریک و تبلیغ کی زبان آردو ہو گئی۔ قرآن مجید اور بہت سی حدیث و فقہ، نیز تاریخ اور تصوف کی عربی فارسی کتابوں کے ترجمے چھپے اور ہندستان کے ہر حصے میں پھیل گئے۔

علی گڑھ تحریک

سنہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور انگریزوں کے تیشۂ انتقام نے ہندستان کے مسلمانوں کو بری طرح مجروح کیا۔ فقط سیاسی اقتدار ہاتھ سے نہیں گیا بلکہ قومی غرور کی گردن ٹوٹ گئی۔ فرنگیوں کا جنھیں کافر و ناپاک جانتے تھے، محکوم ہونا پڑا۔ شاید مدت دراز کے بعد آن پر منکشف ہوا کہ انسان کی اصلی فضیلت اور طاقت کا راز وہی علم اشیا ہے جس نے آسے پاک فرشتوں کا مسجود بنایا تھا ـــ تحریک علی گڑھ، معاشی اسباب سے بارور ہوئی لیکن اسی نے نئے علوم و فنون کا راستہ دکھایا۔ دوسری خصوصیت یہ کہ گو سرسید انگریزوں سے تعاون و موالات کے داعی تھے مگر اپنی اسلامی قومیت، کو نہیں بھولے تھے۔ اس قومیت کی زبان ''آردو'' تھی اور جب تعلیم یافتہ ہنود نے اپنی نئی قومیت کی تشکیل

میں، اردو چھوڑ کر جدید ''ھندی'' اختیار کی تو سید صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اب ہندو، مسلمان الگ الگ (دو قومیں) ہوجائیں گے۔

سید صاحب نے اردو کو علمی اور نئے دور کی زبان بنانے میں خود جو کام کیا، وہ ان کی کثیر تصانیف، بے شمار مضامین و مقالات سے عیاں ہوتا ہے۔ مزید برآں انگریزی سے تراجم کے لیے ایک بڑا ادارہ، (۱) کالج بنانے سے پہلے، علی گڑھ میں قایم کیا، اور انہی ایام (۱۸۶۷ء) میں اپنی سیاسی انجمن (برٹش انڈین ایسوسی ایشن) کی طرف سے درخواست کی کہ کلکتہ یونی ورسٹی کی ہم رتبہ ایک جامعہ بنای جائے جس میں جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم اردو کے ذریعے ہو اور اس کے سند یافتہ وہی حقوق و منزلت رکھتے ہوں جو انگریزی یونی ورسٹی کے طیلسانیوں کو حاصل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت وقت بھی اس تجویز پر ہمدردانہ غور کرنا چاہتی تھی مگر من جملہ دوسری مشکلات کے ہندی والوں کی مخالفت نے اسے باز رکھا۔ یعنی ایک با اثر جماعت نے مطالبہ کیا کہ اگر ایسی کوئی ''ورنیکلر یونی ورسٹی'' قایم کی جائے تو ''ہندوؤں کے لیے 'ہندی' میں تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے'' گارسن دتاسی لکھتا ہے کہ ''ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایسی بات کی مخالفت کرتے ہیں جو انہیں مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے'' ادھر سر سید کو (بقول مولانا حالی) وہم ہوا کہ انگریز مغربی علوم کے راستے بند کرنے کی فکر میں ہیں۔ تراجم کتب کی مشکلات بتا کر بعض انگریزوں نے الگ تودد میں ڈالا۔ غرض وہ تجویز رہ گئی۔ علی گڑھ کالج کے الحاق اور امداد کی بھی حکومت نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ سرکاری یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم کا پابند رہے گا۔ سید صاحب اس ماتحتی سے نہایت ناخوش تھے مگر آزاد یونی ورسٹی بنانے کا ارمان ان کی زندگی میں پورا نہیں ہوا۔

---

(۱) ہمارا مطلب ''سائنٹی فک سوسائٹی'' سے ہے۔ آغاز ۱۸۶۴ء میں بہ مقام غازی پور اس کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ وزیر ہند (ڈیوک اوف ارگائل) نے انجمن کی سرپرستی قبول کی اور بھی کئی انگریز حکام شریک اور معاون تھے۔ اسی ۶۴ء میں اسے علی گڑھ منتقل کیا گیا اور وہاں اس کی مستقل عمارت تعمیر ہوی۔ (۶۶ء)

باب اول: تاسیس انجمن (۱)

انگریزوں نے غدر ۵۷ سے پہلے بنگالے میں فارسی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان بنا لیا، بہت سے بنگالیوں کو اپنے کام کے لیے سدھا لیا تھا۔ یہ سب ہندو تھے۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمت، بلکہ عزت و خوش حالی کے اکثر وسائل سے ایسا محروم کیا کہ ہمارے زمانے تک ''بنگالی'' کے معنی ہی ہندو بنگالی سمجھے جاتے تھے۔ صوبے کی دیسی زبان بنگلا قرار دی گئی، مگر اس میں سے آردو فارسی الفاظ خاص اہتمام سے خارج کیے اور اس کا رسم الخط فقط سنسکرتی کردیا۔ سنسکرت کے الفاظ کثرت سے بھرے گئے کہ مسلمانوں کی نظر میں وہ بالکل ہندوانی زبان، اور اس میں تعلیم دشوار ہوگئی۔ بہار کا صوبہ اس تجدید، بلکہ تفریق فرنگ سے بچا رہا تھا۔ یہ کار خیر جورج کیمبل نام گورنر بنگال نے انجام دیا۔ ۱۸۷۱ع میں اس کی مظفرپور والی تقریر برطانی جہل و تعصب کا شاہ کار مانی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بہار میں کیتھی حروف اور ''ہندی'' بولی جبراً رائج کی گئی۔ انگریز کا فقرہ چل گیا۔ ہندو مسلمان میں تفرقے کا بیج پڑ گیا۔ یہی تحریک صوبہ متحدہ میں شروع ہوی مگر یہاں کے تعلیم یافتہ ہنود آسانی سے سازش کا شکار نہیں ہوئے۔ سر سید نے ۱۸۷۳ع میں ایک بڑا جلسہ خاص الہ باد میں منعقد کرایا اور زبان آردو کی حفاظت اور ناگری کی خواہی نخواہی ترویج روکنے کی غرض سے ایک مرکزی مجلس بنائی جس کی تقریباً ہر ضلعے میں شاخیں قایم کی گئیں۔ بہت سے معزز ہنود شریک انجمن تھے۔ سید صاحب کی مدلّل تحریروں اور گشتی مراسلوں نے انگریز حکام کو بھی اپنے ارادے سے باز رکھا۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چوری سے کام کر رہے تھے، اور چور کا دل ہی کتنا؟ غرض صوبہ میں ناگری چلانے کی تجویز اس وقت، بلکہ سر سید کی زندگی تک، منظور نہ ہوسکی۔ البتہ حامیان ہندی کی ایک جماعت ضرور تیار ہوگئی اور اس نے ۱۸۷۸ع میں خاص سید صاحب کی راج دھانی، یعنی علی گڑھ میں ''بھاشا سمروھنی سبھا'' جمای۔ ہندی کی حمایت کے جوش میں نہ صرف آردو بلکہ مسلمانوں

---

(۱) پہلے اور دوسرے باب کے لکھنے میں ہم نے غلام ربّانی صاحب کی کتاب ''انجمن ترقی آردو کی کہانی'' سے بہت مدد لی ہے۔

سے فرقہ واری مخالفت ہونے لگی ۔ یہ لوگ سنہ ۸۲ء میں ہنٹر کمیشن کے روبرو بھی فریاد لے گئے تھے مگر سید صاحب نے یہ کہہ کر کہ یہ کوئی تعلیمی مسئلہ نہیں، منہ بند کرادیا ۔ سید صاحب کی دشمنی سے مگر ان ھی کی نقل میں ایک اور انجمن علی گڑھ میں ''بھارت ورشیا نیشنل ایسوسی ایشن،، کے نام سے بنی تھی ۔ اس کا نام بھی اب کسی کو یاد نہیں لیکن اس کا ایک مقصد ھندی زبان کو تالیف و تراجم کے ذریعہ ترقی دینا تھا اور اسی کی شاخ ''ناگری پرچارنی سبھا،، بتای جاتی ہے جو آگے چل کر علی گڑھ میں نہ چل سکی، کاشی جی بنارس میں جم گئی ۔ سبھا کی کامیابی کا سہرا میک ڈونل صاحب کے سر بندھنا لکھا تھا ۔ یہ شخص بھی اپنے اسکاچ بھای کیمبل کی طرح اردو کا سرگرم دشمن تھا ۔ صوبہ متحدہ میں حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا گیا تو کہا جاتا ہے کہ فرقہ پرست ھندو بہت خوش ہوے بلکہ غالباً اسی کے اشارے سے ایک لمبی چوڑی عرضداشت لکھی اور کئی ہزار دستخطوں سے نئے لاٹھ صاحب کی خدمت میں پیش کی ۔ یہ اوائل سنہ ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے جب کہ سر سید نہایت بیمار بلکہ مرض الموت میں مبتلا تھے ۔ اس حال میں بھی اس مرد بزرگ نے ایک پر اثر مضمون لکھا جو ۱۹ مارچ کو ان کی وفات سے آٹھ نو دن پہلے شایع ہوا۔ الہ آباد کی انجمن کو بھی خط لکھ کر تاکید کی کہ نئے حملے کا جم کر مقابلہ کیا جائے ۔ غرض سر سید کی زندگی میں تو میک ڈونل کی ھمت نہ پڑی البتہ ان کے انتقال کے کوی دو برس بعد اس نے عدالتوں میں ناگری رسم الخط اردو کے ساتھ لازمی کر دیا ۔ شروع میں زبان ایک ھی رھی لیکن وہ خوب جانتا ہوگا کہ تفرقے کی یہ خلیج آیندہ زیادہ چوڑی ہوتی چلی جائے گی ۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، ھندی بولی یا بولیوں کو مسلمانوں نے رسم الخط ھی کے وسیلے سے اپنایا تھا، انہیں ھندی سے بدکانے کی شاید اس سے زیادہ کارگر تدبیر دوسری نہ ہوسکتی تھی کہ خوش نما اور مختصر نستعلیق کی بجاے ناگری کے لمبے اور پیچ دار حروف لکھنے پڑھنے پڑیں جن میں خ، ز، غ، ف، ق تک مفرد اصوات موجود نہیں عربی حروف کا تو ذکر ھی کیا ۔ حالانکہ صدہا اصطلاحی الفاظ کے علاوہ جو روزمرہ میں داخل ہیں، لاکھوں اسلامی نام ھی احمد، محمد، حسن، علی، سے مرکب ہیں جنہیں عربی حروف کے بغیر صحیح نہیں لکھ سکتے ۔

سید صاحب کے جانشین محسن الملک نے زبان سے اور مولوی بشیر الدین مدیر

البشیر نے قلم سے میک ڈونل کا مقابلہ شروع کیا تھا ۔ لکھنؤ میں ایک مجلسِ تحفظ اردو قائم ہوئی ۔ ۸ اگست ۱۹۰۰ء کو اس کا جلسہ بہت شان‌دار ہوا ۔ دُور دور سے چیدہ افراد شرکت کے لیے آئے ۔ تعلیم یافتہ ہنود اور بعض عیسائیوں نے اردو کی حمایت میں تقریریں کیں ۔ خود محسن الملک اعلیٰ درجے کے مقرر تھے ۔ جلسهٔ لکھنؤ کی تقریر نے حاضرین کو مسحور کرلیا اور اس کا جوش پورے صوبے میں پھیل گیا ۔ مگر ساری جادو نوائیوں میں خوشامد کا سُر ملتا تھا ۔ تجاویز ، عاجزانہ معروضات کا پیرایہ رکھتی تھیں ۔ ایسے کم زور حریف کو دبانے میں انگریزوں کی بہادری مشہور ہے ۔ میک ڈونل خود علی گڑھ گیا اور کالج کے امینوں کو دھمکی دی کہ اگر ان کا سکریٹری ''سیاسی شورش'' میں حصہ لے گا تو کالج کو سرکاری امداد نہیں ملے گی ۔ محسن الملک مجلس تحفظ کے صدر منتخب ہوئے تھے اور تذکرۂ محسن کا بیان ہے کہ سکریٹری کالج کا عہدہ چھوڑنے پر تیار تھے مگر کارپردازان کالج کے کہنے سننے سے یہ عہدہ ترک نہیں کیا ، تحفظ اردو کے کام سے دست کش ہوگئے(۱) ہم اس واقعے سے مسلمانوں کے ضعف اور بےچارگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیاسی اقتدار ضائع ہونے کے بعد اب اُن کے برائے نام تہذیبی امتیازات کو مٹایا جارہا تھا اور وہ اس تخریبی عمل کو روکنا ایک طرف ، اتنی قوت بھی نہ رکھتے تھے کہ اسے نامنصفانہ اور بےجا تعصب قرار دیں ۔ لکھنؤ کی مجلس تو صدر کے رخصت ہونے کے ساتھ برخواست ہوگئی البتہ علی‌گڑھ والوں نے دو ڈھائی سال بعد اپنی تعلیمی کانفرنس میں ایک

---

(۱) ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہ نے بعض تحریروں میں اس واقعے کو محسن الملک مرحوم کی بزدلی پر محمول کیا ۔ حال میں شیخ محمد اکرم صاحب نے اپنی کتاب موج کوثر میں مرحوم کی طول طویل وکالت کی ہے کہ وہ سکریٹری کا عہدہ چھوڑنے کے لیے تیار تھے ، اُمنائے کالج نے انہیں علاحدہ نہ ہونے دیا . . . جناب شیخ صاحب نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ علی گڑھ کالج کے سکریٹری اور سر سید کی جانشینی کا منصب ہندستان میں خاص وقعت کا حامل تھا اگر محسن الملک اسے چھوڑ کر مجلس تحفظ اردو کی صدارت کرتے بھی تو اس میں کیا قوت رہ جاتی ؟ کالج کے امنا کو بزدلی میں حصہ دار قرار دے سکتے ہیں لیکن اصل الزام یہ ہے کہ محسن الملک زبان کے معاملے میں اس فرنگی کی بھبکی سے ڈر گئے ۔

تعہد علمیہ قائم کیا اور مقصد کی صراحت کے لیے انجمن ترقی اردو نام رکھا - وہ دہلی کے اجلاس (جنوری ۱۹۰۳ء) میں بنائی گئی، پہلے صدر پروفیسر ٹامس آرنلڈ، اور سکریٹری مولانا شبلی نعمانی مرحوم منتخب ہوے۔

علی گڑھ کا دور : سنہ ۳ تا ۱۲ء

میک ڈونل کے جبر و قہر کا یہ انتہائی جواب تھا جو مسلمانوں کے سب سے ممتاز ادارے کی طرف سے دیا گیا - مطلب یہ کہ ہم علانیہ احتجاج و مزاحمت نہیں کرسکتے مگر دل سے زبان اردو کے حامی اور اس کی ترقی کے خواہاں ضرور ہیں ! ممکن ہے انگریز کے خوف ہی سے آرنلڈ صاحب کی صدارت کو سپر بنایا ہو - بہر حال ماننا چاہیے کہ ایسی کم زور و خوف زدہ تحریک بھی خوابیدہ احساس کو جگانے کا کام دیتی اور مسلمانوں کو قومی مقاصد کی طرف توجہ دلاتی تھی - اول اول ترقی اردو کی تحریک سے لوگوں میں خاصا جوش پیدا ہوگیا تھا - مولانا شبلی کی کوشش سے بہت سے اہل قلم انجمن کے رکن اور مدد پر آمادہ ہوگئے - یہ زیادہ‌تر مسلمان تھے - اسی پر لکھنؤ کے اخبار ہندستانی میں شکایت چھپی کہ انجمن ترقی اردو، ہندوؤں کو شریک نہیں کرتی - مولانا شبلی نے جواب میں لکھا کہ اعتراض خلاف واقعہ ہے - ”انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا - اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد ورما) کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی - یعنی کتاب ”پیغمبران ہند“ جس میں سری کرشن جی اور گوتم بودھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد ہیں“(۱)

علمی مقصد کے اعتبار سے نئی انجمن کو سر سید کی ”سائنٹفک سوسائٹی“ کی صدائے باز گشت سمجھ سکتے ہیں - مغربی سائنس اور فلسفے کے تراجم پر بار بار زور دیا جاتا تھا - زمانے کی نئی ضرورتیں اب کسی صاحب عقل سے چھپی ہوئی نہ رہی تھیں - مگر اس بارے میں بظاہر کوئی تفصیلی منصوبہ مرتب کرنے کی نوبت نہیں آئی - سائینس کی چند ابتدائی کتابیں ترجمہ کرنی تجویز ہوئی تھیں، ان کے جو نمونے وصول ہوے وہ قابل قبول نہ ٹھہرے - مولانا شبلی کی ڈھائی تین سال کی ادارت میں صرف

(۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۳ء - کتاب مذکور بعد میں انجمن ترقی اردو نے ”رہ نمایان ہند“ کے نام سے (نشان سلسلہ نمبر ۴) شائع کی -

دو ترجمے شایع کئے گئے: (۱) فلسفۂ تعلیم ، اور (۲) رہ نمایان ہند - انگریزی اور عربی فارسی سے ترجمہ کرنے کے لیے آٹھ دس کتابیں اور انتخاب کی تھیں ، ان میں سے ایک (تاریخ تمدن از بکل) چند سال بعد چھپی - اسی طرح علم ہیات میں رسالہ القمر کی تالیف کا ذکر شبلی مرحوم کی تجاویز میں آتا ہے مگر اشاعت اُس وقت ہوئی جب کہ وہ انجمن کو چھوڑ چکے تھے - اُن کے استعفے کا اعلان اور اُن کی جگہ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی (رئیس حبیب گنج) کا انتخاب دسمبر سنہ ۰۵ء میں ہوا - شروانی صاحب جنہیں کچھ مدت بعد ریاست حیدر آباد سے نواب صدر یار جنگ کا خطاب ملا ، نہایت خوش مذاق ، علم دوست ، صاحب قلم رئیس تھے - مگر عملی محنت و مستعدی کی اُن سے زیادہ توقع نہ ہوسکتی تھی - انجمن ترقی اُردو کی کوئی مستقل آمدنی اور تنخواہ‌دار عملہ نہ تھا ، لہذا سابقہ اراکین اور ہمدردوں سے مراسلت کا سلسلہ بھی جاری نہیں رہا - دو سال بعد آپ نے کانفرنس کے اجلاس کراچی (دسمبر ۱۹۰۷ء) میں اپنے شعبے کی پہلی ''کیفیت،، پڑھ کر سنائی تھی - یہی اُن کے ، بلکہ علی گڑھ کے دور انجمن کی آخری کیفیت سمجھی جا سکتی ہے ، کیوں کہ آیندہ سنہ ۱۲ء تک اس شعبۂ کانفرنس کا ذکر بہت کم اور ضمناً چند سطروں میں نظر آتا ہے - پیش کردہ کیفیت بجائے خود ، انجمن کے دور اول کا دلچسپ نقشہ دکھاتی ہے - ہم اس کا یہ اقتباس '' انجمن کی کہانی ،، (صفحہ ۱۰) سے نقل کرتے ہیں -

(شروانی صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ) '' میں نے بہ تعمیل ارشاد اس بوجھ کو اپنے سر لیا اور لطیفہ غیبی کا منتظر رہا - یعنی اس انتظار میں رہا کہ دیکھیے کیا سرمایہ اس کام کو چلانے کے واسطے میرے سپرد ہوگا - آٹھ مہینے کی کوشش کے بعد جو راس المال ملا ، وہ کاغذات کا ایک پلندہ تھا ! صاحبو ، اس میں کاغذ ایک بھی نہ تھا : رجسٹر تھے ، خط و کتابت کے فائل تھے ، کچھ رسالے تھے - یہ رجسٹر وغیرہ بوجہ ایک سال کی بےکاری کے تقویم پارینہ کے مصداق بن چکے تھے - اس کے کچھ عرصے بعد وہ سرمایہ میرے پاس پہنچا جو انجمن کی کل کائنات تھا - کاش میں اس تعداد کو ظاہر نہ کرتا ، تا کہ شایقین اعتراض کو مایوسی ہوتی - اس راس المال کی تعداد (ایک سو آنتالیس روپیہ دس آنہ چھ پائی) تھی . . . .

سال ڈیڑھ سال کے سکوت کے باعث (جو میرے معزز پیش رو کی بزدلی اور برداشتہ خاطری کے سبب رہا) انجمن کا تمام نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ صدر انجمن ہندستان چھوڑ کر انگلستان چلے گئے تھے۔ ارکان انتظامی قریباً کل حیدرآباد میں تھے۔ حمایت اردو کا جوش جو اردو ناگری کے قصے سے پیدا ہوا، سرد ہو چکا تھا۔۔۔۔۔"۔

مولانا شبلی انجمن کے سکریٹری بنائے جانے کے وقت علی گڑھ کالج سے جا چکے تھے۔ پہلے حیدر آباد رہے پھر ندوۃ العلما کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ شروانی صاحب کے منقولہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کی انتظامی مجلس کے اکثر ارکان حیدر آباد میں تھے۔ اور اس کا پہلا مستقر عملاً حیدر آباد دکن ہوگیا تھا لیکن کانفرنس کا شعبہ ہونے کے باعث انجمن کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت علی گڑھ سے ہی ہوتی تھی۔ پچھلی رودادوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے وقت، انجمن کے علمی کاموں کے واسطے دو ایک بار چندہ بھی کیا گیا مگر اس کی مقدار تھوڑی تھی۔ علی ھذا کانفرنس نے پانچ سو روپیہ سالانہ امداد کے طور پر دینا منظور کیا تھا، یہ رقم باقاعدگی سے ادا نہیں ہوتی تھی۔ مدد کا ایک ذریعہ ایسے ارکان تھے جو پہلے سے اپنے نام مطبوعات انجمن کے خریداروں میں درج کرادیتے تھے۔ یہ بہت اچھا کاروباری اصول تھا اور اگر ابتدا میں جن کتابوں کا اشتہار دیا گیا وہ حسب دل خواہ مرتب ہوکر چھپ جاتیں اور کافی تعداد میں فروخت ہونے لگتیں تو ایک طرف زبان کی ترقی کا علمی مقصد انجام پاتا دوسری طرف اس کے اخراجات کی ایک سبیل نکل آتی۔ ظاہر ہے کہ کسی بڑے پیمانے پر علمی اور اشاعتی کام، خالص تجارتی اصول سے چلائے جائیں تو بھی معقول سرمائے کے بغیر اور ہی کون سی تجارت چلتی ہے جو یہ چلے گی۔ تاہم یہ آزمودہ بات ہے کہ کتابوں کی تجارت میں خسارہ نہیں ہوتا۔ بہر حال خریدار ارکان کا سلسلہ بھی جیسا کہ شروانی صاحب کی کیفیت سے پتہ چلتا ہے مولانا شبلی ہی کے زمانے سے درہم برہم ہوگیا تھا۔ مشیر یا انتظامی مجلس کے پہلے صدر آرنلڈ صاحب اور نائب صدر، مولانا حالی، شمس العلما نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ جیسے نامی اہل قلم

منتخب کیے گئے تھے اسی طرح ارکان میں اس زمانے کے کئی ممتاز مصنف، ارباب صحافت وغیرہ حضرات شامل ہوئے لیکن ان کے جلسے یا اجتماع آسانی سے ممکن نہ تھے، صرف خط و کتابت سے مشورہ لے لیا جاتا تھا۔ البتہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اس شعبے کا ایک جلسہ ضرور ہوتا اور اس میں سالانہ کیفیت سنانا سکریٹری کے فرائض میں داخل تھا۔ دس برس کی مدت میں یہ فرض بھی تین چار مرتبہ سے زیادہ ادا نہیں ہوا۔

اواخر سنہ ۵ع سے سنہ ۱۰ء تک شروانی صاحب انجمن کے سکریٹری رہے۔ انہیں بڑی مدد میر ولائت حسین مرحوم سے ملی جو علی گڑھ میں مدرسی سے بڑھ کر اقامت خانوں کی منتظمی کے باعث مشہور تھے۔ انہوں نے انجمن الفرض کی طرف سے کتابوں کی دکان کھلوائی تھی۔ درسی کتب اور کاغذ، کاپیاں قلم دوات، غرض طالب علموں کی تعلیمی ضرورتوں کا سامان بکتا تھا اور انجمن الفرض کو خوب نفع ملتا تھا۔ شروع میں اسی دکان سے کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کی مطبوعات فروخت ہوتی تھیں۔ میر صاحب نے شروانی صاحب کی پریشانی اور انجمن کی تہی دستی سن کر، کتابیں چھپوانے کا بھی ذمہ لے لیا اور سکریٹری موصوف معترف ہیں کہ میر صاحب کی دست گیری سے نئی کتابیں تالیف و ترجمہ کرانے کا کام پھر چل نکلا۔ چنانچہ ان پانچ سال میں انجمن کی پانچ کتابیں اسی معاونت کی بدولت چھپ کر شایع ہوئیں جن میں ایک، نپولین کی سوانح پانچ جلدوں میں چھاپی گئی۔

علمی کام شروانی صاحب مرحوم کے مذاق کے مطابق تھا مگر درد سر سے خالی نہ تھا۔ ہاتھ میں سرمایہ اور مستقل آمدنی کی سبیل نہ ہونے سے دو ایک اچھی تجویزیں پڑی رہ گئیں۔ سرمایہ جمع کرنا جس قسم کی سعی و تدبیر چاہتا ہے وہ رئیس حبیب گنج سے نہ ہوسکتی تھی، آخر سنہ ۹ء میں وہ سکرٹری کے عہدے سے دست بردار ہوگئے اور ان کی بجائے مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اردو کے بہت اچھے ادیب تھے۔ ریاست حیدرآباد میں بڑی بڑی سرکاری خدمات انجام دیں اور اسی سال (سنہ ۹) وہاں سے پنشن دے کے رخصت کیے گئے تھے۔ کالی داس کے ناٹک وکرم اروسی کا اردو ترجمہ ان کی ادبی یادگار ہے۔ انہوں نے اصطلاحات علمیہ کے بنیادی کام پر خاص توجہ کی۔ تعلیمی کانفرنس کا یہ اجلاس جس میں وہ شعبۂ ترقی اردو کے سکرٹری منتخب ہوئے، رنگون

میں ہوا تھا - وہاں کے ایک تاجر حاجی احمد ملا داؤد صاحب نے وعدہ کیا کہ اصطلاحات کے ترجمے کے لیے تین ہزار روپیہ دیں گے- اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی عزیز مرزا مرحوم یہ کام بڑے پیمانے پر انجام دینا چاہتے تھے - ان کی ذاتی قابلیت اور وجاہت سے توقع تھی کہ اسے بخوبی اتمام کو پہنچائیں گے ، لیکن انہی اوصاف کی بدولت مسلم اہل‌الرائے نے انہیں سیاسیات کے میدان میں آنے کی ترغیب دی - صوبے کی حکومت ، نوزائیدہ "مسلم لیگ" کو علی گڑھ کی سیادت سے نکالنے کے درپے تھی - لیگ کا صدر دفتر لکھنؤ میں قائم کیا گیا - مولوی عزیز مرزا کو اس کی تنظیم جدید کے لیے چُنا گیا ۔مگر اگلے ہی سال ان کا انتقال ہوگیا اور ساری توقعات جو ان مرحوم سے وابستہ کی گئی تھیں ختم ہوگئیں -

سنہ ۱۹۱۲ء میں برطانوی عہد کا دوسرا (اور آخری) دربار دھلی منعقد ہوا جس میں پہلی مرتبہ ایک فرنگی بادشاہ ھندستان آیا اور شاہ جہاں کے دارالسلطنت میں اس کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی - اس موقع پر علی گڑھ کی تعلیمی کان‌فرنس کا سالانہ اجلاس بھی دھلی میں کیا گیا تھا - کان‌فرنس کے سربراہ صاحب‌زادہ آفتاب احمد خاں تھے - **ترقی اُردو** کا شعبہ عزیز مرزا مرحوم کے بعد لاوارث رہ گیا تھا - اس کا سکرٹری ، صاحب‌زادہ مرحوم نے جناب مولوی عبدالحق صاحب کو نامزد کیا - حاضرین جلسہ نے بالاتفاق منظوری دی - مولوی صاحب موصوف انہی دنوں اورنگ‌آباد دکن میں صدر مہتمم تعلیمات (= انسپکٹر اوف اسکولز) مقرر ہوئے تھے ، علی گڑھ کالج کے ممتاز پرانے طالب علم اور ادبی حلقوں میں پہلے سے روشناس تھے - مگر صاحب‌زادہ مرحوم کے حسن انتخاب کی تحسین کرتے وقت اس بات کو بھولنا نہ چاہئے کہ ان دنوں کان‌فرنس کا یہ شعبہ بالکل نیم جان اور غیراھم رہ گیا تھا - جیسا کہ غلام ربانی صاحب نے انجمن کی کہانی میں جتایا ہے ، اس کے مقاصد بہت بلند رکھے گئے تھے مگر ان تک پہنچنے کے ذرائع مفقود و مسدود تھے - یہ واقعہ اب ہماری ادبی تاریخ کا مشہور لطیفہ بن گیا ہے کہ جب شعبہ ترقی اردو کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ‌آباد منتقل ہوا تو نئے سکرٹری کو :

"ایک پرانا صندوق ملا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا - اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے اور غیر مرتب مسودات ، ایک قلم دوات اور باقی—— اللہ کا نام ! یہ تھی کل کائنات انجمن ترقی اردو کی جو اس نے اپنے معتمد چہارم کے حوالے کی - ایک رجسٹر اور

ایک قلم دوات کو ہاتھ میں لے کر ہندستان جیسے ملک میں کسی علمی کام کے لئے کھڑا ہونا مولوی عبدالحق صاحب ہی کا کام تھا ۔ آپ کے اس وقت کے خیالات کا اندازہ کچھ آپ ہی کے الفاظ میں بھلا معلوم ہوگا :-

،، میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بارگران کو اپنے ذمے لیا کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے ۔ اردو زبان میں علوم و فنون لانے کے لیے ایسے اصحاب کی ضرورت ہے جو علوم مشرقی و مغربی دونوں میں ماہر ہوں اور ایسے لوگ ہماری قوم میں شاذ و نادر ہیں ۔ دوسری مشکل اس کام میں کافی سرمایہ بہم پہنچانے کی ہے ۔ یہ کام اس قدر بڑا ، اس قدر وسیع اور ایسا اہم ہے کہ جب تک ہزاروں نہیں لاکھوں کا سرمایہ نہ ہو اس کا خاطر خواہ چلانا ممکن نہیں ۔ تاہم چند مہینوں میں اپنی بساط کے موافق جو کوشش اس بارےمیں میں نے کی ہے ، اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس شعبے کا کام استقلال اور ہمدردی سے چلایا جائے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ چند سال کے بعد کانفرنس کا یہ شعبہ سب سے زیادہ مفید اور کامیاب ثابت ہو '' ۔

(کیفیت انجمن ترقی آردو بابت سنہ ۱۹۱۳ء)

دور علی گڑھ کا علمی کام

انجمن ترقی آردو کا یہ ابتدای دور تقریباً دس برس رہا ۔ اس مدت میں تین مدیر یا سکرٹری مقرر ہوے مگر پہلے سکرٹری (مولانا شبلی) کا قیام اس وقت علی گڑھ میں نہ تھا اور تیسرے سکرٹری (مولوی عزیز مرزا) بھی لکھنؤ رہنے لگے تھے ۔ شعبے کی جداگانہ انتظامی مجلس بنائی گئی تھی مگر اس کے باقاعدہ اجلاس ہوے ہوں تو بھی ان کی روداد محفوظ نہیں رہی ۔ بہت سے اہل علم و قلم '' ارکان شوریٰ '' میں درج کیے گئے تھے مگر ان سے انتخاب کتب ، تالیف و تراجم کے بارے میں صرف تحریری مشورہ لے لیا جاتا تھا ۔ انجمن کا سب انتظامی کام سکرٹری کے ہاتھ میں تھا ۔ البتہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اسے اپنے شعبے کی کیفیت پیش کرنی ہوتی تھی ۔ کانفرنس کی طرف سے شعبے کو ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی رقمی امداد منظور کی گئی تھی ، وہ بھی معلوم ہوتا ہے پابندی سے ادا نہیں کی جاتی تھی ۔ اسی طرح اہل استطاعت سے مدد لینے کی کوی خاص کوشش نہیں کی گئی نہ کوی قابل ذکر رقم وصول ہوی ۔ اورنگ آباد منتقلی کے وقت دفتر انجمن کا اثاثہ وہی ٹوٹا ہوا صندوق تھا جس کا اوپر مذکور ہوا ۔ مطبوعات انجمن الفرض والوں کے پاس تھیں ۔ کتابوں کی فروخت سے جو نفع ہوتا تھا، اس میں انجمن حصہ دار تھی مگر یہ قدر قلیل سرمایہ بھی الفرض کے بہی کھاتے میں درج ہوگا ، انجمن کے نئے سکرٹری کو نقد کچھ نہیں ملا ۔

مگر انجمن کی انتظامی اور مالی حالت سے زیادہ لائق لحاظ اس کا علمی کام ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس دہ سالہ مدت میں جس مقصد کے لیے وہ قایم ہوی تھی ، اسے کہاں تک انجام دیا ؟ دوسرے مولوی عبدالحق صاحب کا سکرٹری منتخب، اور دفتر کا اورنگ آباد منتقل ہونا انجمن کی تاریخ میں نہایت اہم اور نئے دور کی ابتدا ثابت ہوا ، اسے شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اب تک جو کچھ انجمن نے کیا تھا ، اس پر یکجای تبصرہ کرلیا جائے :-

انجمن ترقی اردو نے سنہ ۳ سے سنہ ۱۲ کے اخیر تک سات نئی کتابیں بہ ترتیب ذیل شائع کیں :-

(۱) فلسفۂ تعلیم

(۲) القمر

(۳) القول الاظہر

(۴) رہ نمایان ہند

(۵) نپولین اعظم

(۶) امرائے ہنود

(۷) تاریخ تمدن (جلد اول)

ان میں سے پہلی ہربرٹ اس پین سر کی کتاب '' ایجوکیشن '' کا ترجمہ ہے۔ انیسویں صدی میں جدید سائنس کی ترقی نے یورپ کو علوم تجربی کا بےحد گرویدہ و معتقد بنادیا تھا ۔ اس پین سر اسی عہد کا انگریز فلسفی گزرا ہے کہ اخلاقیات و تمدن کی اقلیم میں بھی سائنس کا حکم چلانا چاہتا تھا ۔ پچاس ساٹھ برس قبل اس کی تصانیف ہندستان کے انگریزی خوانوں میں کافی مقبول تھیں ۔ بنائے انجمن کے بعد چند انگریزی کتابیں ترجمے کے لیے منتخب اور مشتہر کی گئیں ، ان میں ایک اس کا یہ رسالہ '' ایجوکیشن'' بھی تھا ۔ خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی ان دنوں ریاست حیدرآباد کے محکمہ تعلیم سے منسلک تھے ان کا ترجمہ '' فلسفۂ تعلیم '' کے نام سے بہت پسند اور انجمن کی طرف سے شائع کیا گیا ۔ رائے دینے والوں میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام بھی تحریر ہے جنھوں نے مترجم کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ ترجمے میں خود اسپین سر کی اصل تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔ کتاب کے مطالب کا خلاصہ

اور مصنف کے حالات بطور دیباچہ فاضل مترجم نے اضافہ کیے اور کہیں کہیں ذیلی حاشیے لکھ دیے ہیں ۔ یہ کتاب تیسری بار ٹائپ میں بہ مقام اورنگ آباد سنہ ۱۹۳۲ء میں طبع ہوی تھی اور ہنوز قابل مطالعہ ہے۔

۲ - القمر — تالیف مولوی راحت حسین صاحب بی اے بھاگل پوری ۔ جس میں جدید علم ہیات کے ضروری مبادی پر بھی بحث کی گئی ہے پھر نظام شمسی اور چاند کے متعلق ہرشل ، ایڈم وغیرہ کی تحقیقات صاف و شستہ آردو میں فراہم کردی ہیں ۔ لائق مولف نے بعض نئی مصطلحات کا خود ہی ایسا اچھا ترجمہ کرلیا ہے کہ بالکل اجنبی نہیں معلوم ہوتا ۔ رسالے کی معلومات کسی قدر پرانی ہوگئی ہیں ، ان میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہوگی مگر بجاے خود یہ رسالہ جدید سائنس کو آردو میں منتقل کرنے کا ایک نمونہ پیش کرسکتا ہے ۔ دوسری دفعہ سنہ ۱۹۱۷ء میں ۶۸ صفحات پر چھاپا گیا تھا ۔

۳ - ایسا ہی مختصر مگر اعلیٰ درجے کا فلسفیانہ رسالہ القول الاظہر امام ابن مِسْکَوَیْہ کے ”فوز الاصغر“ کا آردو ترجمہ ہے ۔ اس میں وجود باری تعالیٰ ، نفس انسانی کے خصائص اور نبوت پر حکیمانہ دلائل دی گئی ہیں ۔ آخری بحث میں ارتقا پر اسی قسم کے نظریات پیش کیے گئے ہیں جو آج کل جدید علماے مغرب خصوصاً ڈارون سے منسوب کیے جاتے ہیں ۔

۴ - رہ نمایان ہند - ن م دت کی انگریزی ”پرافٹس اوف انڈیا“ کا آردو ترجمہ ، جس میں سری کرشن اور مہاتما بدھ کی تعلیم کو تفصیل سے اور شنکر اچارج وغیرہ بعد کے مصلحین کا حال اجمالاً تحریر کیا ہے ۔ یہ ترجمہ بابو نرائن پرشاد ورما نے جو آردو کے اچھے شعرا میں شمار ہوتے ہیں فصیح و بلیغ زبان میں کیا اور خوب مقبول ہوا ۔ سنہ ۱۹۳۲ء تک انجمن اس کو چار دفعہ طبع کراچکی تھی ۔

۵ - نپولیئن اعظم — یہ فرانسیسی سپہ سالار گذشتہ صدی کے آخر تک اہل یورپ میں بڑا سورما سمجھا جاتا تھا ۔ حقیقت میں غیر معمولی عزم و جرات کا سپاہی گزرا ہے ۔ انگریزی میں ایبٹ نے معتقدانہ سوانح عمری لکھی ہے ۔ انجمن ترقی آردو نے پانچ ضخیم جلدوں میں ترجمہ شائع کیا ، جو انجمن کے پہلے دور کی سب سے بڑی کتاب تھی ۔

۶ - امراے ہنود — یہ کتاب سعید احمد صاحب مارہروی نے انجمن کے لیے تالیف کی ۔ شروع میں مسلمان سلاطین ہند کی ہندو رعایا سے رواداری کا حال تاریخی شواہد سے مدلّل کیا ہے پھر عہد مغلیہ کے ہندو امرا اور منصب داروں کا بہ ترتیب

حروف تہجی تذکرہ لکھا ہے۔ مفصل اور (ضمیمہ میں) مجمل تراجم کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے جنھیں ہم عصر فارسی تاریخوں اور بعد کی اُردو ، انگریزی کتابوں سے جمع کیا گیا ہے۔ ان (اکتالیس) ماخذ کی فہرست شامل کتاب کردی ہے۔ مولف کی محنت قابل داد اور اہل اُردو پر ان کا احسان ہے کہ ایسی دل‌چسپ تاریخی معلومات فراہم کیں۔ تعجب ہے یہ صرف دو بار طبع ہوی اور جس قدر چاہیے اتنی شہرت نہ حاصل کرسکی۔

۷ ۔ **تاریخ تمدن** ۔ ٹامس بکل کی کتاب ’’ ہسٹری اوف سوی لزیشن ‘‘ کا اُردو ترجمہ ، منشی احمد علی صاحب بی اے ایل ایل بی نے بڑی شوق و قابلیت سے کیا تھا مگر تھوڑا سا حصہ باقی تھا کہ انتقال کر گئے ۔ علی گڑھ کے دور میں ترجمہ کا صرف پہلا حصہ چھاپا گیا ۔ دوسرے حصے کی تکمیل مولوی عبدالحق صاحب نے مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی سے کرای اور کچھ مدت بعد اورنگ آباد سے شائع کیا ۔ اُس زمانے میں اصل انگریزی کتاب کا بہت شہرہ تھا ۔ مصنف نے یورپی اقوام خصوصاً اہل برطانیہ (اور ان کے نئے تمدن) کی فضیلت علمی دلائل سے ثابت کی تھی کہ اکثر جدید تحقیقات سے غلط نکلیں ۔ بہر حال ، اُردو ترجمہ بجائے خود اہل علم نے پسند کیا اور اس اعتبار سے بھی لائق افادہ ہے کہ تاریخ نویسی کے جدید اصول اور بلند معیار پیش کرتا ہے ۔

کم و بیش دس برس کی مدت میں صرف سات کتابوں کا شائع کیا جانا انجمن ترقی اُردو کا کچھ قابل تعریف کارنامہ نہیں معلوم ہوتا ۔ اس سے زیادہ اور جدید علوم طبیعی کے اونچے درجے کی کتابیں اُردو کالج دہلی ، پھر سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ نے ترجمہ کرادی تھیں ۔ البتہ زبان کے اعتبار سے یہ نئی کتابیں بہت بہتر اور منجھی ہوی اُردو کا نمونہ کہی جاسکتی ہیں اور اُن سے خود زبان کی تیز ترقی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان سات میں مغربی سائنس کی صرف ایک کتاب اور وہ بھی مختصر رسالہ القمر مذکور ہے ۔ اس عام کوتاہی کا بڑا سبب یہ تھا اور ابھی تک عارض ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی زبان انگریزی ہوگئی تھی ۔ ہمارے معمولی تعلیم‌یافتہ جدیدسائنس کے مسائل سے ناواقف ہیں ۔ اُردو خواں طبقہ کیمیا اور طبیعیات کی مشکل کتابیں پڑھ نہیں سکتا تو لکھے کون ؟ یہ مضامین ہماری جامعات میں بزبان انگریزی پڑھائے جاتے ہیں ۔ پڑھائے کیا جاتے ہیں رٹا دیے جاتے ہیں ۔ اسی لیے سائنس کی کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں ۔ سائنس کی تعلیم عام ہونے نہیں پاتی ۔ ساری قوم پس‌ماندہ اور یورپ کی دست نگر پڑی ہوی ہے ۔

باب دوم: استقلال

انجمن ترقی اردو کا مولوی عبدالحق صاحب بالقابہم کے تفویض کیا جانا، نہ صرف انجمن بلکہ زبان اردو کی تاریخ کا نہایت نتیجہ خیز اور معرکہ الآرا واقعہ ہے۔ اس نے ہماری ادبیات کی رفتار پر جو اثر ڈالا، وہ کسی صاحب خبر سے مخفی نہ ہوگا لیکن جدید نظام تعلیم اور ملی سیاسیات میں اس کا دخل اگرچہ ایسا براہ راست اور صریحی نہ ہو، حقیقت میں کافی قوی اور تہ تک اتر گیا تھا۔ آیندہ اوراق میں کتاب کی محدود گنجائش کے مطابق ہم ان پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے۔ یہاں اجمالاً یہ بتانا خلاف محل نہ ہوگا کہ اس کام کی تفویض اور ذمہ داری نے خود نئے سکریٹری کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ ۱۸۹۴ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے بی اے کی تکمیل کے بعد مولوی صاحب موصوف چند سال مدرسہ آصفیہ حیدرآباد کے صدر مدرس رہے۔ ریاست کی معتمدی امور عامہ میں مدتوں مترجم کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۱۱ء میں ناظم (ڈائرکٹر) تعلیم کے مددگار، اور چند ماہ کے بعد صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر کیے گئے تھے۔ تعلیمی تجربے سے بڑھ کر، نئے تعلیم یافتہ طبقے میں موصوف کی علمی وسعت نظر اور پاکیزہ طرز نگارش متعارف تھی۔ یقین تھا کہ اردو ادب کی خدمت کریں گے، اچھی اچھی کتابیں مقالے اور مضامین لکھیں گے۔ سرکاری ملازمت میں بھی اونچے عہدوں تک ترقی کرنے کی امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں اجلاس کانفرنس کے انتخاب نے ان کی جولانیٔ طبع کے لیے بالکل نیا اور وسیع میدان کھول دیا اور وہ ایسے تازہ شوق اور ولولے کے ساتھ اس اقلیم جدید میں داخل ہوئے جو سرکاری عہدہ داری یا تصنیف و تالیف کے عام مشغلوں میں پیدا نہ ہوسکتے تھے۔ انجمن، زندگی کی نئی دھن اور سب سے بڑا مقصد حیات بن گئی۔

فطری محنت اور مستعدی میں اورنگ آباد کی نفیس آب و ہوا اور پرسکون فضا نے ایک حد تک مساعدت کی۔ بستی سے دور، مقبرہ رابعہ دورانی کے عقب میں قیام تھا جس کے آس پاس کوئی آبادی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے کوئی سڑک نہ تھی۔ مقبرے کے وسیع باغ اور ایک عقبی کھڑکی سے گزر کر مولوی صاحب کے بنگلے تک آنا ہوتا تھا۔ پیچھے دور تک کھیت، پس منظر میں کوہ شیشادری کی پہاڑیاں بل کھاتی ہوئی خلدآباد، اور آگے اجنتا تک چلی جاتی تھیں۔ اسی بنگلہ میں جو اصل میں صرف ایک لمبے کمرے اور شمال و جنوب کی طرف دو برآمدوں پر مشتمل تھا، انجمن ترقی کا ''دفتر'' قایم اور دور نو کا آغاز ہوا۔

زیر نظر زمانے میں انگریزی تعلیم ممالک ہند پر بخوبی چھا گئی تھی۔ علی گڑھ تحریک اور کشاکش روزگار نے مسلمانوں کو اسی ڈھرے پر ڈال دیا تھا۔ پچاس برس پہلے سر سید کو معدودے چند افراد ملے جو مغربی علوم سے واقف اور اپنی زبان میں ان کی ترجمانی کرسکتے تھے لیکن اس قلیل مدت میں ایک طرف تو اردو نے حیرت انگیز وسعت و قوت حاصل کی۔ داغ، حالی، امیر، اکبر، اسماعیل، جیسے سخن طرازوں نے اسے خراد پر چڑھایا، اطراف ہند میں ٹکسالی اردو کا سکہ چلایا۔ حالی، آزاد، نذیر احمد، سرشار، شبلی، شرر وغیرہ بہت سے اہل قلم نے نثر کے نئے نئے قالب تیار کردیے۔ دوسرے، اعلیٰ درجے کے انگریزی داں انشا پردازوں کی ایک نئی جماعت تالیف و تراجم کے میدان میں آنے لگی تھی۔ ایسے متعدّد حضرات نے قلمی تعاون سے جناب مولوی صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ ان سابقین اولین میں مولوی معشوق حسین خان (معشوق یار جنگ)، انہیں کے بھائی ڈاکٹر لطافت حسین خان مرحوم، مرزا محمد مہدی کوکب، مولانا عبدالماجد دریابادی اور محمد الیاس برنی صاحب کے نام لائق ذکر ہیں۔ اورنگ آبادی دور کے ابتدائی پانچ سات سال میں ان صاحبوں کی مغربی علوم پر کئی معیاری کتابیں انجمن ترقی اردو نے شایع کیں۔ مطبوعات انجمن کے یکجائی تبصرے میں ہم پھر ان کی کیفیت سنیں گے۔ لیکی کی ''تاریخ اخلاق یورپ'' پلوتارک کی کتاب ''مشاہیر یونان و روما'' اور عربی سے البیرونی کی ''کتاب الهند'' کے اہم تراجم شروع کرادئے گئے۔ زبان کے تحقیقی مطالعے کے سلسلے میں پہلے ''دریاے لطافت'' کو تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ چھپوایا گیا۔ آگے چل کر کئی قدیم تذکرے اور دکنی (منظوم) کتابیں بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں

اور یہ سلسلہ انجمن کی علمی خدمات کا نمایاں عنوان بن گیا۔

کتابیں لکھوانے اور چھپوانے کے لیے لامحالہ روپے کی ضرورت تھی۔ کانفرنس کی قلیل امداد پہلے ہی بے قاعدہ ملتی تھی، آیندہ بالکل بند ہوگئی۔ ۱۹۱۵ء کی سالانہ کیفیت میں مولوی صاحب نے اجلاس کانفرنس کو یہ لطیفہ سنایا کہ ''کانفرنس نے اپنی مقررہ رقم دو سال سے ادا نہیں کی۔۔۔۔ خیر اس کا بھی چنداں مضائقہ نہ تھا مگر یہ ستم ظریفی قابل ذکر ہے کہ اس سال کے بجٹ میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ گذشتہ سال انجمن ترقی اردو کو رقم ادا نہیں کی گئی اور اگر اس سال گنجائش ہوی تو ادا کی جائے گی! غالباً یہ کانفرنس ہی کا بجٹ ہے جس میں اس قسم کی تحریروں کی گنجائش ہوسکتی ہے''۔ (مطبوعہ رپوٹ ۱۹۱۵ء صفحہ ۱۹)

مطبوعات انجمن کی فروخت سے الفرض کا مکتبہ کبھی کبھی نفع کا کچھ حصہ دیا کرتا تھا۔ اس کی سالانہ مقدار غالباً دو سو بھی نہیں ہوئی اور چونکہ یہ کتابیں الفرض نے چھاپیں لہذا اسی کی مملوکہ تھیں۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو نے اپنا دارالاشاعت لکھنو، پھر اورنگ آباد میں کھولا تو اس کی اپنی مطبوعات قیمتاً علی گڑھ سے منگائی جاتی تھیں۔ غرض آمدنی کی یہ مد بھی خارج از حساب ہی سمجھنی چاہئے نئی کتابوں کی اشاعت کا سارا خرچ مولوی صاحب کو چندے سے خود فراہم کرنا پڑا۔ کئی سال معتدبہ رقم اپنی جیب سے ادا فرماتے رہے۔ چندہ لینے کے بارے میں ان کا ایک دل چسپ بیان ۱۹۱۳ء کی سالانہ کیفیت سے نقل کرنے کے لائق ہے:-

''اگرچہ میں اس عزت کے قابل نہیں، لیکن حسن اتفاق سے سمجھئے یا سوء اتفاق، مجھے علی گڑھ کا طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مگر میں کالج میں ایک منتہا طالب علم تھا۔ میں نہ کبھی کھیلوں میں شریک ہوا نہ یونین کلب میں حصہ لیا اور نہ انتخاب پریذیڈنٹ و سکریٹری کے ہنگامے میں شامل ہوا۔ غرض جو خوبیاں ایک علی گڑھ کالج کے طالب علم کے لیے تمغائے شرافت ہیں ان میں سے مجھ میں ایک بھی نہ تھی۔ لیکن نہ معلوم کیونکر، کبھی کبھی چندہ کرنے کی عزت مجھے حاصل ہوئی۔ یہ سُنّت سرسید تھی۔ مگر وہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ طالب علم بڑا آزاد ہوتا ہے اور آج کل تو اس کی آزادی اور بے مہاری کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ وہ جس سے چاہتا مل سکتا، اور جہاں چاہتا گھس جاتا ہے۔ نہ اسے کسی کے چین بہ جبیں ہونے کا ڈر، نہ

کسی کے انکار سے شرم ، نہ کسی کے برا بھلا کہنے کا خوف اور نہ اپنی کہنے میں باک ۔ لیکن اتنی مدت کے بعد جب انجمن کا بوجھ سر پر آپڑا اور اس کی خاطر چار و ناچار چندے کے لیے ھاتھ پھیلانا پڑا تو معلوم ھوا کہ یہ کیسی کڑی منزل ھے ۔ اگر جناب صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں ؟ یہ ھے بڑی بد اخلاق کا کام ۔ معلوم ھوا کہ چندہ دینا آسان ھے ، چندہ لینا بہت مشکل ھے ۔ چندہ لینے والا آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ھے اور لوگ اس کی صورت سے بیزار ھو جاتے ھیں ۔ برخلاف اس کے چندہ دینے والے کی ھر جگہ عزت و توقیر ھوتی ھے ۔ اس لیے جو حضرات ملک و قوم کے لیے چندہ دیتے ھیں انہیں اس یہودی کی طرح خدا کا شکر کرنا چاھئے جو اپنے معبد میں جاکر کہتا تھا کہ خدایا تیرا شکر ھے تو نے مجھے محصول لینے والا نہیں بنایا ! ......"

جناب مولوی صاحب کی سعی و محنت کا اسی سے اندازہ ھوسکتا ھے کہ کوئی دو سال کی تگ و دو میں انہوں نے تقریباً آٹھ ھزار روپیہ انجمن کے لیے جمع کرلیا ۔ چندے زیادہ تر اورنگ آباد اور اسی کے اضلاع سے وصول ھوئے ۔ کچھ حیدرآباد اور بیرونی احباب سے مل گئے ۔

انجمن کی نئی تنظیم

کانفرنس کی مرکزی عاملہ شعبوں کے معاملات میں عموماً مداخلت نہیں کرتی تھی ۔ انجمن ترقی اردو بھی ابتدا سے خاصی طرح آزاد رھی اور جب کانفرنس کی طرف سے امداد موقوف ھوگئی تو رسمی دخل گویا ختم ھوگیا ۔ تاھم گیارہ بارہ برس تک کانفرنس کے اجلاسوں میں انجمن کے سکرٹری سالانہ کیفیت سنایا کرتے تھے اور اس اجتماع سے اپنے مقاصد و مسائل کے متعلق تبادلہ خیالات کا فائدہ اٹھاتے تھے یہاں تک کہ خود کانفرنس کے اجلاس بے قاعدہ اور بے رونق ھوگئے اور دوسری طرف انجمن ترقی اردو ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے ملک میں نمایاں ھوتی چلی اور مختلف مقامات میں خود اس کے بڑے بڑے جلسے منعقد ھونے لگے ۔ مگر انجمن کے جلسوں کی "کل ھند" نوعیت اورنگ آباد سے منتقل ھونے کے بعد مسلّم ھوئی ۔ اورنگ آباد، بہر حال ایک ریاست کا چھوٹا سا شہر تھا ۔ تاریخ میں محمد تغلق اور عالم گیر جیسے صاحب جبروت بادشاہ اس مقام کو ھندوستان کا صدر مقام نہیں بنا سکے ، تو محکومی کے زمانے

میں جناب مولوی صاحب کی یہ آرزو کہاں سے پوری ہو جاتی ؟ بایں ہمہ ترقی اردو کی نشو و نما میں اورنگ آباد نے جو حصہ لیا وہ ہماری ادبی تاریخ سے کبھی محو نہ ہوگا ۔ علی گڑھ سے منتقلی کے وقت انجمن کی کوئی انتظامی مجلس نہ تھی ۔ ارکان کی تین قسمیں قرار دی گئی تھیں :

۱ ۔ '' سرپرست '' ۔ وہ حضرات جو انجمن کو یکمشت ہزار روپیہ عطا فرمائیں ۔

۲ ۔ '' ارکان دوامی '' ۔ جو پان سو روپیہ یک مشت عنایت کریں ۔

۳ ۔ '' ارکان شوریٰ '' جن سے علمی مسائل میں مشورہ لیا جائے

علی گڑھ کے سارے دور میں اوپر کی دونوں مدیں خالی رہیں ، تیسری مد میں بہت سے نام تھے مگر اب ان سے مشورے کا اعزازی کام بھی نہیں لیا جاتا تھا ۔ مولوی عبدالحق صاحب نے نئے سرے سے فہرست مرتب کی ۔ اور ایسے چودہ ارکان کی خاص مجلس شوریٰ بنائی جو انجمن کے مالی یا علمی کاموں میں واقعی مدد دیتے تھے ۔ پھر '' ارکان اعانت '' یا خریدار ارکان کی ایک نئی مد نکالی کہ ۱۲ (پھر صرف چھ) روپے سال چندہ دیتے تھے اور انجمن کی مطبوعات انہیں نصف قیمت پر دی جاتی تھیں ایسے ارکان کی تعداد بہت جلد سو سے زیادہ ہوگئی ۔ دفتر رسالہ الناظر لکھنؤ میں دارالاشاعت اور مختلف مقامات پر کتابوں کی ایجنسیاں کھولی گئیں ۔ ان تدبیروں سے مالی فائدہ کچھ زیادہ نہیں ہوا لیکن انجمن کی نئی اور علمی مطبوعات کی اشاعت کے راستے نکل آئے ۔ انہی کتابوں کے پھیلنے سے لوگوں کے تعلیمی خیالات پر (خصوصاً حیدرآباد میں) یہ مفید اثر پڑنے لگا کہ وہ جدید علوم کو اپنی زبان میں پڑھنے پڑھانے پر مائل ہوئے ۔ مگر اس باب میں ہم کتاب کے آخری حصے میں ذرا زیادہ صراحت سے اظہار خیال کریں گے ۔ یہاں انجمن کی نئی تنظیم کے سلسلے میں یہ واقعہ لکھنا ہے کہ اس کے صدر نواب عمادالملک (سید حسین) بلگرامی منتخب کئے گئے ۔ ان محترم بزرگ نے محض مولوی عبدالحق صاحب کی قدر شناسی اور زبان اردو کی سرپرستی کے لئے یہ عہدہ قبول کیا ۔ وہ بطور خود انجمن کو بیش قرار عطئے دیتے رہے ۔ انہی کی تحریک سے اعلیٰ حضرت نظام نے انجمن کی سرپرستی اور بارہ سو روپے سالانہ کی امداد منظور فرمائی ۔ دو سال بعد یہ رقم پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی (۱۹۱۶) جس نے انجمن کے پائے استقلال کو مضبوط کردیا ۔ علیاحضرت

نواب سلطان جہاں بیگم والئی بھوپال نے چھ سو روپے سال کی امداد منظور کی اور اس وقت جتنی کتابیں انجمن لکھوا رہی تھی، ان سب کی فہرست اور تخمینہ مصارف طلب کیا - پانچ ہزار روپے خرچ کا تخمینہ پیش ہوا - سرکار عالیہ نے حکم دیا کہ جس وقت دو ہزار روپیہ دوسرے ذرائع سے جمع ہو جائے تو باقی تین ہزار سرکار بھوپال سے ادا کر دیا جائے - اسی کے مطابق عمل ہوا اور علیا حضرت نے موعودہ عطئے سے بھی بڑھ کر اپنی تحسین سے انجمن اور زبان اردو کی خدمت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی یعنی رقم کی منظوری کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ میں اس کام کو اتنا ضروری اور اعلیٰ درجے کا کام سمجھتی ہوں کہ اگر مجھ کو فرصت ہوتی اور زیادہ انگریزی جانتی ہوتی تو انجمن ترقی اردو کے لئے خود کسی کتاب کا ترجمہ کرتی،، (۱۹۱۶ء)

ابتدای ترقی

سرمایے کی فراھمی کے ساتھ، تقریر و تحریر سے لوگوں کو مقاصد انجمن کی طرف متوجہ کرنے کا کام جاری تھا - اخبار و رسائل میں اس کی رودادیں اور اطلاعات چھپوانے کے علاوہ، جناب مولوی صاحب اردو کو علمی اور تعلیمی زبان بنانے کی برابر وکالت کرتے رہتے تھے - ان کی تحریک سے اکثر ارباب صحافت انجمن کی حمائت میں مضامین لکھتے اور ترقی اردو کا ہر طرف چرچا ہوتا رہتا تھا - سنہ ۱۹۱۴ء سے مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہونے لگی تھیں - سب سے پہلی شاخ صوبۂ اورنگ آباد کے ضلع پربھنی میں بنی - پھر جالنہ، بھوپال، کان پور، لکھنو میں شاخیں قائم ہوئیں - سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد چالیس کے قریب تھی - کراچی کی شاخ کے الحاق اور یہاں سندھ اردو کانفرنس کے " دھوم دھام سے" منعقد ہونے کا سنہ ۱۹۱۸ء کی سالانہ رپورٹ میں ذکر آیا ہے - مزید برآں اردو کتب خانے دوسری انجمنوں یا مدرسوں میں قائم کرائے جاتے تھے جنھیں انجمن ارکان اعانت بنا کر اپنی مطبوعات مفت فراھم کرتی تھی - رضاکار کارکنوں اور ہم دردوں کے ماسوا ایک تنخواہ دار سفیر مقرر کیا گیا تھا کہ ایسے علاقوں میں جہاں اردو کا رواج کم ہے، دورے کرے - سنہ ۱۵، ۱۹۱۶ء میں جنگ یورپ کے باعث سیاسی سرگرمیوں کو انگریزی حکومت جبراً مسدود کر رہی تھی لیکن انجمن کا خاص جلسہ لکھنو میں منعقد ہوا جس کے صدر نواب نصیر حسین خاں خیال تھے -

نئی کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا کام آہستہ آہستہ مگر استقلال کے ساتھ چل رہا تھا۔ تاریخ، سوانح، تذکرہ، فلسفہ — وغیرہ موضوعات پر چند ترجمے اور تصنیفات چھاپی گئیں۔ ان میں حفظان صحت اور نباتات پر عام فہم رسالے اور میر تقی کا قدیم تذکرہ "نکات الشعرا" لائق ذکر ہیں۔ کتابوں کا ظاہری یا معنوی معیار یورپ کی اعلیٰ مطبوعات کی سطح تک نہیں آیا مگر قدم ضرور بڑھ رہے تھے اردو کو ایک جدید علمی زبان بنانے کی آرزو قوی تر ہوتی جاتی تھی۔ مغربی علوم کے ترجموں میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کی اصطلاحات ہوتی ہیں جن کے مرادف مشرقی زبانوں میں نہیں ملتے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اصطلاحات علمیہ کی لغت مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انجمن کی طرف سے مولوی عزیز مرزا مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ اب ریاست حیدرآباد میں ان کے جانشین مسٹر حیدری نے اس مقصد کے لیے تین ہزار روپیہ سالانہ کی امداد انجمن کو اور دلوای (سنہ ۱۷ء)۔ حیدری صاحب جو آگے چل کر نواب حیدر نواز جنگ سر اکبر حیدری کے لقب سے ریاست حیدرآباد کے نہایت مشہور وزیر خزانہ اور صدر اعظم ہوئے بمبئی کے تاجر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدر آباد میں چند سال صدر محاسب، سکریٹری فنانس رہے پھر امور عامہ تعلیمات وغیرہ کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف انجمن ترقی اردو کی دل کھول کر امداد فرمائی بلکہ کمال حوصلہ‌مندی اور دور بینی سے ایک نئی یونی ورسٹی کی تجویز مرتب کرای جس کی تعلیمی زبان اردو ہو۔ اس "جامعہ عثمانیہ" کی تاسیس اور عظیم فوائد پر ہم کتاب کے آخر میں پھر نظر ڈالیں گے۔ یہاں حیدری صاحب کی بیش بہا اعانت کا احسان اور یہ حقیقت یاد دلانی مقصود ہے کہ کس طرح مولوی عبدالحق صاحب مدظلہم کی تبلیغ و سعئی پیہم دور دور اثر ڈال رہی تھی اور کس طرح زمانے کا تقاضا دور دور کے مسلمانوں کو زبان اردو کی تعلیمی اور ملّی اہمیت کا احساس دلانے لگا تھا۔ ۱۹۱۸ع کے آخر میں علی گڑھ کانفرنس کا سالانہ اجلاس سورت میں ہوا۔ شعبۂ علمیہ، یعنی انجمن ترقی اردو کے ذیلی اجلاس کی صدارت مولوی وحیدالدین صاحب سلیم نے کی اور ایک پرمغز و جوش‌انگیز خطبہ دیا۔ مطبوعہ روداد سے چند اقتباس ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

"اس شعبے یا اس انجمن کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو

زبان کو ترقی دے۔ اس میں دنیا کے بہترین افکار اور بلند ترین معلومات کا سرمایہ مہیا کرے۔ اس کی حفاظت و اشاعت میں سرگرمی اور جوش سے کام لے۔ آپ کی یہ انجمن ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ بہاروخزاں کے پندرہ موسم اس پر گزرچکے ہیں۔ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی، مرحوم مولانا حبیب الرحمن صاحب شروانی اور عزیز مرزا مرحوم اس کے معتمد رہ چکے ہیں اور اب مولوی عبدالحق بی اے کے ہاتھ میں اس کی عنان ادارت ہے۔ اوائل ایام میں اس کی ترقی کی رفتار دھیمی رہی مگر اب وہ سرعت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ . . . . . . پہلے انجمن کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا اب کسی قدر سرمایہ بھی مہیا ہوگیا ہے۔ انجمن نے اپنی مستقل حیثیت بھی قائم کرلی ہے۔ متعدد کتابیں بھی انجمن کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔ ملک میں اس کے مقاصد کی اشاعت کا کام بھی انجام پارہا ہے۔ مگر ابھی ہم منزل مقصود سے ہزاروں کوس کے فاصلے پر ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم میں زندہ قوم کے آثار نہیں پائے جاتے۔

حضرات! انجمن ترقی اردو کی ضرورت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے مگر اب زمانے کے حوادث پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ غفلت کا زمانہ ہوچکا اگر اب بھی بیدار نہ ہوگے تو مشکلات و شدائد کے پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اپنی زبان کی حفاظت کرنا، اس کو زندہ رکھنا، ترقی دینا، اس میں بلند پایہ معلومات و خیالات کا سرمایہ جمع کرنا ہر اس قوم کا فرض ہے جو اس دنیا میں زندہ رہنا چاہتی ہے۔ جو چاہتی ہے کہ حوادث کی کشمکش سے اس کی ہستی ملیا میٹ نہ ہوجائے۔ زبان کیا ہے؟ تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہے اتحاد و اتفاق کا وسیلہ ہے، جہالت کے مرض کا مؤثر علاج ہے، تعلیم و تربیت کا رہ نما ہے۔ اس کی حفاظت و حمایت کرنا اور اس کی توسیع و اشاعت میں کوشش کرنا تمام افراد ملت کو لازم ہے۔

یورپ کا ایک ادیب لکھتا ہے کہ زبان ایک طلائی زنجیر ہے جو قوم کے افراد کو باہم ملاتی ہے جو بکھرے ہوئے دلوں کو ایک نقطے پر جمع کرتی ہے۔ جو منتشر خیالات و افکار کو ایک مرکز پر لاتی ہے۔ جو ٹوٹے

ہوے ارادوں اور حوصلوں کو جوڑکر ان میں زندگی اور تازگی کی روح پھونکتی ہے۔ ایک زبان بولنے ، لکھنے اور پڑھنے والی قومیں ایک ہی دماغ سے سوچتی ، ایک ہی دل سے ارادہ کرتی ایک ہی ہاتھ سے کام کرتی اور ایک ہی پاؤں سے ترقی کے میدان میں جست لگاتی ہیں''۔

'' حضرات تو کیا اب آپ پر لازم نہیں ہے کہ اپنی زبان سے محبت کریں ۔ اس کو اپنی تعلیم و تہذیب اور اتحاد خیالات کا ذریعہ جان کر اس کے ساتھ پوری قدرشناسی کا برتاؤ کریں ؟ مگر وہ زبان کونسی ہے؟ کیا وہ گجراتی ہے جو علاقہ بمبئی سے باہر ہندستان میں کسی جگہ بولی اور سمجھی نہیں جاتی ؟ کیا وہ بنگالی یا پنجابی یا اور کوئی ایسی ہی زبان ہے جو ایک صوبے یا علاقے سے باہر کام نہیں دیتی ؟ حاشا و کلا وہ زبان جس سے آپ باہم کام لے سکتے ہیں صرف اردو ہے۔ بس یہی ایک زبان ہے جو تمام ہندستان کے مسلمانوں بلکہ تمام ہندستانیوں کی مشترک زبان ہے۔ یہ اسی زبان کو شرف حاصل ہے کہ ہندستان کے جس صوبے میں آپ کوئی ملکی یا قومی کانفرنس منعقد کریں اور اس کو تبادلۂ خیالات کا ذریعہ گردانیں تو تمام ارکان جو ہندستان کے دور دراز گوشوں سے ایک جگہ آکر جمع ہوے ہیں ، نہایت آسانی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے خیالات ایک دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں ۔ یہ زبان ہمارے لیے خدا کی ایک نعمت ہے . . . . . . ۔ مسلمانوں کو مکاتب و مدارس بہ کثرت جاری کرنے چاہئیں ممکن ہے ان میں مضامین تعلیم حسب ضرورت مختلف ہوں مگر ان میں اردو زبان کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے ۔ ہماری قوم کا ہر بچہ خواہ وہ ملک کے کسی گوشے میں پیدا ہوا ہو ، اپنی قومی زبان سے محروم نہ رہے ۔ اگر وہ اردو زبان بولتا ، سمجھتا ، لکھتا اور پڑھتا ہے تو ہر وقت یہ بات اس کے ذہن میں مرکوز رہے گی کہ میں کوئی تنہا ہستی نہیں ہوں میں کسی چھوٹی سی جماعت کا ممبر نہیں ہوں ۔ میرے خیالات صرف ذاتی خیالات ہی نہیں ہیں بلکہ پوری قوم کے دل سے اٹھے ہیں اور ان کی ایک لہر میرے دل میں بھی ہے ۔ میں اس زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس نے ہندستان کے کروروں دلوں کو باہم ملا رکھا ہے ! . . . . . . ''۔

بنیادی، تحقیقاتی کام

۱۹۲۰ء سے ہمیں انجمن کے حوصلوں میں بلندی اور علمی منصوبوں میں نمایاں وسعت نظر آتی ہے۔ وہ دوسرے مفید تراجم و تصانیف کے علاوہ، زبان کے ایسے بنیادی کاموں کو اٹھاتی ہے جیسے اصطلاحاتِ علومِ جدیدہ۔ اصطلاحاتِ پیشہوراں۔ انگریزی سے اردو کی، اور خود اردو کی بڑی لغت، کہ آخرالذکر کی تکمیل تو ابھی تک نہ ہوسکی۔ مگر دوسری آٹھ جلدوں میں اور انگریزی اردو لغت بڑی تقطیع کے کوئی ڈیڑھ ہزار صفحات پر کئی سال کی محنت اور صرف کثیر سے طبع کرادی گئیں۔ ۱۹۲۰ ہی میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا درخشاں مقالہ "محاسن کلام غالب" اور مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم کی لسانی تحقیقات کی یادگار "اصول وضع اصطلاحات علمیہ" ادبیات کے افق پر طلوع ہوئیں اور ابھی تک اہل نظر کی بصیرت‌فزائی کا سامان ہیں۔ علم معیشت، انتخاب کلام میر اور فلسفۂ جذبات جو چند ہی سال پہلے چھپی تھیں، دوسری دفعہ طبع کرائی گئیں۔ جیسا کہ "انجمن کی کہانی" کے مصنف لکھتے ہیں :—

> "اب تک ملک میں قصے کہانیوں کی کتابیں زیادہ پڑھی جاتی تھیں۔ فلسفے یا معاشیات جیسے خشک مضامین کی کتابوں کا اول تو ہماری زبان میں وجود ہی کب تھا جو پڑھی جاتیں۔ اور اگر ہوتیں بھی تو شاید داستانوں اور ناولوں کے آگے ان کی پوچھ بھی نہ ہوتی۔ انجمن کی کتابیں اس وقت تک (یعنی تحریر کتاب ۳۷ء تک) دو بار، اور اکثر کتابیں تین تین، چار چار مرتبہ چھپ چکی ہیں۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں اچھی ہوں تو وہ اپنے پڑھنے والے بھی پیدا کر ہی لیتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ اس نے ملک میں علمی کتب کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا اور اہل ملک کے ذوق کو سنوارا"۔

ادبی ذوق کو سنوارنے میں جناب مولوی عبدالحق صاحب کا ایک اور طاقت ور ذریعہ سہ ماہی رسالہ اردو ہوا۔ انجمن کے مقاصد میں شروع سے تحریر تھا کہ اگر کافی سرمایہ ہو جائے تو وہ اپنا ایک رسالہ جاری کرے گی۔ غلام ربانی صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۹۲۱ء انجمن کے لیے بہت ہی مبارک سال تھا کہ جنوری کے

پہلے ہفتے میں اس کی یہ تمنا بھی پوری ہوگئی اور خود جناب مولوی صاحب کی ادارت میں رسالہ ''اردو'' بڑی آن بان کے ساتھ جاری ہوا ... '' جو حضرات اردو کا مطالعہ فرماتے ہیں ان کو خوب معلوم ہے کہ یہ کس پائے کا رسالہ ہے اور اس کے مضامین کس قدر تحقیق اور کاوش سے لکھے جاتے ہیں۔ منشی پریم چند آن جہانی نے خوب کہا تھا کہ یہ اردو رسائل کا قافلہ سالار ہے۔ ہندوستان کا تو کیا ذکر ہے یورپ اور امریکہ میں بھی کم رسالے ہیں، جن کا معیار اتنا بلند اور مذاق اتنا پاکیزہ ہو جتنا اردو کا ہے۔ تاریخ زبان و ادب پر سب سے پہلے اس رسالے میں مستند اور وقیع مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ بڑی خصوصیت اس رسالے کی یہ ہے کہ اس کے سامنے ایک متعین راہ عمل ہے اور وہ کبھی اس سے قدم نہیں ہٹاتا۔ ابھی یہ رسالہ جاری نہیں ہوا تھا کہ ایک روز ملک کے نامور ادیب اور عالم مولوی وحیدالدین صاحب سلیم اور جناب مولوی صاحب رسالے کے موضوع پر گفتگو فرما رہے تھے راقم الحروف اس وقت موجود تھا مولانا سلیم صاحب نے فرمایا کہ صاحب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ اس کے موضوع کو اس قدر محدود اور تنگ کیوں کئے دیتے ہیں۔ زبان اور ادب پر مضمون ہی کتنے لکھے جاسکتے ہیں؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ چند نمبروں کے بعد یہ موضوع ختم ہو جائے گا۔ مولوی صاحب نے فرمایا، نہیں صاحب، یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ کبھی ختم نہ ہوگا اور ہم اس رسالے کے ذریعہ نئے نئے مضمون سجھائیں گے'' مرحوم (مولانا سلیم) کے تبحّر و ادبی کمال میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے اور پھر زبان اردو تو آپ کا اوڑھنا بچھونا تھی، مگر ہم کو خوب یاد ہے کہ اس وقت انہوں نے اس امر کو تسلیم نہیں کیا۔ اب رسالہ اردو (سنہ ۳۸ میں) ۱۹ سال کا ہوچکا ہے اور اس وقت تک اس کے ۷۲ نمبر شائع ہوچکے ہیں جو ۷۲ مستقل کتابیں ہیں۔ اس میں آئے دن نئے نئے اور اچھوتے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اور یہ فخر بھی اسی رسالے کو حاصل ہے کہ اس کے بہت سے محققانہ مضامین کو علاحدہ رسالے کی صورت میں چھاپنے کی ضرورت پڑی۔ رسالہ' اردو کے اجرا سے پہلے ہماری زبان میں تنقید کا عنصر اس قدر کم تھا کہ وہ کسی شمار کے لائق نہیں۔ اردو نے اس خصوص میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہے اور اس میدان میں آئندہ جو ترقیاں ہوں گی وہ اس رسالے کی ممنون رہیں گی '' (... کہانی - صفحہ ۳۰)

مجلس نظما

ترقی اردو کی ملک میں عام تبلیغ کو خارجی اسباب سے مدد ملتی تھی اگرچہ ان میں بھی سب سے قوی محرک جناب مولوی عبدالحق صاحب کی سعیٔ بلیغ کو شمار کرنا پڑے گا۔ لیکن دس گیارہ سال میں انجمن کی جو داخلی قلب ماہیت ہوئی، ظاہر ہے کہ تمام تر موصوف کی لگا تار کوشش کا ثمرہ تھا۔ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء کی مطبوعہ روداد سے ثابت ہوتا ہے کہ اب انجمن کی آمدنی تقریباً بیس ہزار روپیہ سالانہ ہو گئی تھی۔ حیدرآباد و بھوپال کی امداد کے علاوہ، ارکان دوامی کی تعداد اسّی تھی مگر اس کی رکنیت کا یک مشت چندہ تین سو پھر ڈھائی سو کر دیا تھا۔ خریدار ارکان تین سو کے قریب تھے۔ متفرق عطیات الگ وصول ہو جاتے تھے۔ فروخت کتب میں ایک مد نصاب کی بعض کتابوں سے بنی جن کی تیاری اور طباعت محکمہ تعلیم حیدرآباد نے انجمن کے سپرد کر دی تھی، آمد و خرچ اور طباعت و فروخت کتب کے لیے لامحالہ اورنگ آباد میں انجمن کا علاحدہ دفتر بن گیا تھا۔ خود مولوی صاحب اس کے کاغذات حسابات وغیرہ کی پابندی سے نگرانی کرتے تھے مگر انہی سنین میں سرکاری عہدہ داروں سے دفتر کی تنقیح شروع کرای اور اسی زمانے سے باقاعدہ سالانہ تنقیح کا سلسلہ قائم رہا۔ غلام ربّانی صاحب لکھتے ہیں کہ ملک میں بہت سے قومی ادارے اور انجمنیں قائم ہوئیں اور اب بھی ہیں لیکن بعض اوقات ہم نے ان کی بدنظمیوں کے بارے میں کیا کچھ نہیں سنا؟ اور یہاں یہ حالت ہے کہ جب کبھی انجمن کو ہزار دو ہزار یا اس سے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو مولوی صاحب اپنی سب ضرورتیں روک کر، اپنے پاس سے روپیہ ادا کر دیتے ہیں، چنانچہ انجمن کے گوشوارہ جمع و خرچ میں قرض اور ادائے قرض کی ایک مستقل مدّ بنی ہوئی ہے،،

زیر نظر سنین میں ترکی خلافت وغیرہ کئی قومی چندوں کے بے حساب اسراف کی نسبت لوگوں کو بڑی شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ مولوی صاحب کی یہ احتیاط نہایت ضروری اور برمحل تھی مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ اقدام تھا کہ سنہ ۱۹۲۸ء میں انجمن کے آئین کی تجدید اور باضابطہ ,, مجلس نظما ،، قائم کی گئی جو اس کے مداخل و مخارج پر نگرانی رکھے اور اس کے مقاصد کی عملی تدابیر میں معتمد (= سکرٹری) کو مشورہ دے۔ مجلس میں حتی الامکان ہندوستان کے مختلف صوبوں کے نمائندہ، زبان

کے سامی یا اہل قلم حضرات شریک کئے گئے تھے اگرچہ اکثریت انہی کی تھی جو آن دنوں ریاست حیدرآباد میں مقیم تھے - سب سے پہلے نظما یہ تھے :

۱ - نواب عمادالملک بلگرامی (صدر)
۲ - (سر) سید راس مسعود
۳ - نواب صدر یارجنگ شروانی
۴ - نواب فخر یار جنگ
۵ - مولوی، غلام یزدانی صاحب
۶ - سید ہاشمی فریدآبادی
۷ - مسیح الملک حکیم اجمل خان
۸ - ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاہور)
۹ - مولانا عبدالحلیم شرر (لکھنؤ)
۱۰ - مولانا ابوالکلام آزاد (کلکتہ)
۱۱ - ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (ڈھاکہ)
۱۲ - مولوی عبدالحق صاحب (معتمد)

انجمن کا مطبع

اسی سال سنہ ۱۹۲۴ع میں جناب مولوی صاحب کی اقامت گاہ سے قریب انجمن کے دفتر ، عملہ اور مطبع کے واسطے ایک علاحدہ مکان لیا گیا - یہ مدت سے شکستہ بے کار پڑا تھا ، اس کی درستی کرائی گئی '' آردو باغ '' کے نام سے افتتاح کی رسم حیدری صاحب نے ادا کی - یہاں انجمن کا ٹائپ کا چھاپہ خانہ لگایا گیا - اب تک اس کی مطبوعات مختلف مطابع میں پتھر پر چھپتی تھیں ، ان میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس کی مطبوعہ کتابیں اور سب سے بڑھ کر رسالہ آردو عمدہ کاغذ پر بہت نفیس چھاپے جارہے تھے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ ہاتھ سے کتابت کرانا بجائے خود دور حاضر کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا - پھر یکساں ، عمدہ خط میں ، صاف و صحیح طباعت ، پتھر پر الشاذ کا لمعدوم کا مرتبہ رکھتی ہے - سرسید مرحوم نے اپنی سوسائٹی اور گزٹ کے لیے آہنی حروف اختیار کئے اگرچہ ان کا خط اچھا نہ تھا - سنہ ۱۱ میں مولانا محمد علی مرحوم نے خاص اہتمام اور خرچ سے بیروت کا نسخ ٹائپ آردو تحریر کے لیے بنوا کر منگایا اور اپنا اخبار ہمدرد اسی خط میں جاری کیا - اس روزنامے کی اشاعت مختلف اسباب سے

کم ہونے لگی تو آخری مدیر (حضرت جالب دھلوی) نے اس کا الزام ٹائپ کے سر تھوپا اور اخبار کو پتھر پر چھپوانے لگے ۔ ہم درد غریب تو چند روز ھاتھ پاؤں پٹک کر سرد ھو گیا لیکن اس حادثے کی بدولت ایسی مفید روایت جو محمد علی مرحوم نے قائم کی تھی ، نسیاً منسیا ھوگئی کہ پھر آج تک ھمارے اخباروں کو ٹائپ اختیار کرنے کی ھمت نہیں ھوئی ۔ حالآنکہ دوسرے اسلامی ملکوں میں ھر جگہ نسخ ٹائپ میں بہتر سے بہتر اخبار چھاپے جا رہے ھیں ۔ خود ملک ایران جو خط نستعلیق کا مولد و منشا ھے ، ٹائپ کے فوائد اور ناگزیر ضرورت کی بنا پر اسے قبول کرچکا ھے فقط ھندستان کے قدامت پرست حضرات اسی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ھیں ۔ اگر عام طور سے آھنی حروف کا رواج ھو جاتا تو اب تک ممکن تھا اس میں بہت کچھ اصلاح اور اپنے حسب مذاق بنانے کی کوشش کرتے مگر حیرت کی بات ھے کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات جو لباس و طعام تک کے معاملے میں انگریزوں کی تقلید پسند کرتے ھیں ، ٹائپ کے بارے میں تقلیداً ھی ، انہوں نے ایسے ذوق شوق کا ثبوت نہیں دیا ۔ انجمن ترقی اردو کا یہ ٹائپ (الہ آباد ٹائپ) کچھ خوش نما نہ تھا ۔ بعض معزز احباب نے اس تبدیلی پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا لیکن جناب مولوی صاحب نے ظاھری حسن پر ایک اھم اصولی ضرورت کو ترجیح دی اور جس دن سے انجمن کا مطبع قائم ھوا ، اورنگ آباد کے دور میں اس کی سب کتابیں ، رسالے ، رودادیں اور ھر قسم کی تحریریں ٹائپ میں چھاپی جاتی رھیں ۔

(سر) سید راس مسعود کی صدارت

۱۹۲۶ع میں انجمن کے صدر نواب عماد الملک (سید حسین) بلگرامی کا انتقال ھوا ۔ مرحوم ھندستان کی اسلامی تہذیب و شرافت کا ایک نمونہ ، اور اس کے حفظ و بقا میں آخر تک ساعی رہے ۔ ان ھی مساعی کا ایک عنوان انجمن ترقی اردو کی سرپرستی تھی ۔ وہ خود اردو (نیز انگریزی) کے انشا پرداز ادیب تھے ان کے پرمغز مقالات کا مجموعہ ، اسلامیات اور زبان اردو سے دلی محبت کا گواہ ھے ۔ ریاست حیدر آباد میں مرحوم کے اعزاز و اثر سے انجمن بہت مستفید ھوی جس کا اوپر ذکر آچکا ھے ۔ مجلس نظما نے مرحوم کی بجائے سید راس مسعود صاحب کو صدر انجمن منتخب کیا جو ان دنوں حیدرآباد

میں ناظم تعلیم تھے ۔ ریاست کی طرف سے ''نوابی'' اور بعد میں برطانی حکومت کی طرف سے سر کے خطاب سے مخاطب ہوئے ۔ ابتدا سے مغربی تعلیم و تربیت کے باوجود اپنی قومی زبان اور مشرقیت کے دل دادہ تھے ۔ حیدر آباد آنے کے وقت انجمن ترقی اردو کی برابر مدد فرماتے رہے ۔ مدارس کے لیے رسالہ اردو اور دوسری مطبوعات کی خریداری کے علاوہ اپنے کثیر احباب کو اس کی اعانت پر آمادہ کرتے تھے ۔ حتی کہ انگریز دوستوں اور سیاحت جاپان کے زمانے میں وہاں کے ملاقاتیوں سے بھی انجمن کے واسطے چندہ وصول کیا ۔ ان ہی کی تحریک سے انجمن کے ''سرمایہ مد محفوظ'' کی بنا پڑی جس کے لیے تیس ہزار روپے سے زیادہ رقم خود آن مرحوم نے جمع کرای ۔ خود بھی دیوان غالب اور '' انتخاب زرین ،، خوش نمای کے اہتمام سے چھپوایا ۔ اور وعدہ کیا تھا کہ فرانسیسی زبان سے جس میں مہارت رکھتے تھے ، منتخب کتابیں انجمن کے لیے ترجمہ کرتے رہیں گے۔ آن کی ناوقت موت(۱۹۳۷ء)نے یہ اور بہت سی توقعات خاک میں ملادیں ۔ تاہم اورنگ آباد کے آخری دس برس اور موصوف کے دور صدارت میں انجمن کی رفتار ترقی جاری رہی ۔ آمدنی بڑھتے بڑھتے پچاس ہزار روپیہ سالانہ سے بڑھ گئی ۔ ''سرپرست'' اور '' معاونین ،، کی نئی مد نکالی گئی کہ جو حضرات ایک ہزار یا زیادہ عطیہ دیں وہ '' معاون ،، اور پانچ ہزار یا زائد روپیہ عطا کرنے والے ، انجمن کے سرپرست موسوم ہوں ۔ سالانہ آمدنی میں بڑا اضافہ روزافزوں مطبوعات کی فروخت سے ہوا ۔ ان میں مالی فائدے کے اعتبار سے '' درسیات عثمانیہ،، سب سے زیادہ کام یاب رہیں کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں ۔ آردو کی جدید درسی کتابیں لکھوانے کا مدت سے خیال تھا ۔ پنجاب ، صوبہ متحدہ اور دھلی میں کئی نئے سلسلہ' کتب بچوں کے لیے چھپے اور مدارس میں داخل نصاب کیے گئے ۔ لیکن جناب مولوی صاحب ان ابتدای کتابوں کی زبان و بیان ، تحریر و طباعت میں جیسی اصلاح چاہتے تھے ، وہ بات نہ آی ۔ رسم الخط اور قاعدۂ اردو کو نئے طرز پر لکھوانے میں انجمن ۱۹۱۳ سے کوشاں تھی ۔ زیر نظر زمانے میں ریاست حیدر آباد سے اردو کی نئی درسیہ کتابیں لکھوانے کا کام اس کے سپرد ہوا ۔ ابتدای قاعدے سے میٹرک تک نو کتابیں ''درسیہ عثمانیہ،، کے نام سے ، خوش خط ،

باتصویر چھاپی گئیں اور نہ صرف حیدر آباد بلکہ بھوپال ، بمبئی ، سی پی ، کے اردو مدارس میں بھی داخل نصاب ہوئیں ۔ اس قبولیت سے انجمن کو مالی نفع سے زیادہ یہ فائدہ ہوا کہ تحریر میں بعض اصطلاحات اور یکساں معیاری زبان نے ان ممالک میں رواج پایا ۔

دکنیات

مطبوعات انجمن پر تفصیلی تبصرہ آخر کتاب میں یک‌جا پیش کیا جائے گا لیکن ترقی اردو کے مقاصد میں ایک یہ مقصد تجویز ہوا تھا کہ قدیم اردو نظم و نثر کو ضایع ہونے سے بچایا جائے ۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب نے اس کام کو جیسی محنت و شوق سے انجام دیا ، وہ ان ہی کا حصہ تھا اور حق یہ ہے کہ ان کی جستجو ، نتائج کے اعتبار سے زبان کی تاریخ پر ایسا احسان ہے جسے اہل اردو کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔ متعدد قدیم تذکرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے اور چھپوانے کے علاوہ انہوں نے دکنی زبان کی بیسیوں پرانی کتابیں گمنامی کی قبروں سے کھود کر برآمد کیں ۔ ایسے ایسے قدیم شعرا اور نثر نگاروں کی تحریریں منکشف کیں جن کے نام تک سے اہل علم ناواقف تھے ۔ قدیم اردو کے یہ گنج گراں مایہ دور دست مقامات ، خصوصاً بعض غیر معروف خانقاہوں کے بوسیدہ بستوں میں بندھے ہوئے پڑے تھے ۔ جو کیڑوں اور صدیوں کی گرد کے کھالینے سے بچ گئے ، انہیں بھی مدت سے کسی نے کھول کر نہ دیکھا تھا ۔ ایسے نادرات کا ایک خزانہ جناب مولوی صاحب کی تلاش صادق سے جمع ہوگیا ان ہی میں نویں صدی ھجری کے ثلث اول کا ایک مخطوطہ ، اردو زبان کا سب سے قدیم واحد نسخہ سمجھا گیا ہے ۔ ان کہن سال کرم خوردہ کتابوں کی بہم رسانی سے بھی زیادہ سخت مرحلہ ان کی عبارتیں پڑھنا تھا ۔ اکثر خط نسخ میں لکھی گئی تھیں مگر ھندی اصوات ، حروف و اعراب مختلف تھے صدھا لفظ اب متروک ہو چکے ہیں ان کو صحیح پڑھنا اور معنی نکالنا ، شاید ھیرو غلیفی کتبات کے پڑھنے سے کم دشوار نہ تھا ۔ جناب مولوی صاحب نے یہ علمی ھفت خواں طے کیں ۔ قدیم دکنی کی کئی اعلیٰ درجے کی منظوم کتابیں تصحیح ، تحشیہ ، فرھنگ الفاظ کے ساتھ چھپوائیں ۔ رسالہ اردو (بابت ۲۲ ، ۲۷ و ۲۸ وغیرہ) میں ایسی کئی تصانیف اور مصنفین پر تحقیقی مقالات لکھ کر شایع کیے ۔ اس وقت تک عام نظریہ یہ تھا کہ اردو ، لشکری زبان ہے جو مغل بادشاہوں (خصوصاً شاہ جہاں)

کے عہد میں بنی ہے ۔ مولوی عبد الحق صاحب نے بابر کی آمد سے بھی سو برس زیادہ پیشتر کی کتابیں کھود نکالیں ۔ سلطان قلی قطب شاہ کے دیوان پر ان کا تبصرہ پڑھکر اہل اردو دنگ رہ گئے کہ یہ اکبر و جہانگیر کا ہم عصر تقریباً پچاس ہزار شعر اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے ۔ اس کی زبان بے شبہ پرانی اور اب عسیر الفہم ہوگئی ہے لیکن مطلق شبہ نہیں کہ اسی اردو کی قدیم صورت ہے جسے ہم اور آپ آج بول رہے ہیں ۔ سنہ ۱۹۲۷ء اور سنہ ۱۹۲۸ء کے اردو میں پے درپے کئی مضمون دکنیات پر مولوی صاحب نے لکھے ۔ ثابت ہوا کہ وہ مخلوط زبان جسے مسلمانوں نے ہندستان میں آکر تیار و اختیار کیا اور ہندی ، ہندوی ، دہلوی ، ریختہ ، گجری ، دکنی کے مختلف ناموں سے پکارا ، اصلاً اسی اردو کی ابتدائی شکلیں تھیں ۔ دکن میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی ۔ مواصلات کی مشکلات کے باعث فارسی اثرات کم تر سرائت کرتے تھے ۔ بزرگان صوفیہ نے مسلمان عوام کو دینی تعلیم اور اسلامی اخلاق سکھانے کے لیے بظاہر اسی زبان میں جسے وہ بولتے تھے ، کتابیں لکھنا زیادہ مناسب سمجھا ۔ بہرحال ، انہی دکنی تحریروں کی لڑ اوپر ملتی چلی جاتی ہے اور مسعود سعد سلمان تک نہیں ، تو شیخ فریدالدین گنج شکر تک ضرور پہنچ جاتی ہے جنہوں نے تقریباً سو سال کی عمر پائی ، سنہ ۶۶۴ میں ملتان کے قریب انتقال کیا ۔ غرض یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ زیادہ تر جناب مولوی صاحب کی سعی و تلاش نے اردو کی تاریخ میں کئی صدی کا اضافہ کردیا اور گیارھویں کی بجائے ساتویں صدی ہجری (= تیرھویں عیسوی) میں آسے بولتے ہوئے سنادیا ۔ اس باب میں ان کے مختلف مضامین اور مقالہ "اردو کی نشو و نما میں صوفیہ کرام کا حصہ" جو علاحدہ رسالے کی صورت میں چھپ گیا ہے ، مطالعہ کرنے کے قابل ہیں ۔

قدیم اردو اور شعرا کے پرانے تذکروں کو تحقیق و طباعت کی روشنی دکھانے کی ذیل میں متقدم اساتذہ کے دواوین کی اشاعت کا کام آتا ہے ، جو دور اورنگ آباد کے آخری سنین میں تازہ اہتمام سے شروع ہوا ۔ اور ولی ، اثر ، تاباں ، یقین وغیرہ شعرا کے متعدد دیوان ازسرنو چھاپے گئے ۔ ان کا الگ الگ مختصر حال ہم آیندہ اوراق میں پھر سنائیں گے ۔ زیر نظر ایام کا ایک اور کارنامہ رسالہ "سائنس" کی اجرای تھی کہ جس طرح سہ ماہی اردو سے پہلے کوئی خاص لسانی اور ادبی رسالہ ملک

بھر میں نہ تھا ، اسی طرح اردو یا اور کسی دیسی زبان میں خالص مغربی علوم پر کوئی ماہانہ یا سہ‌ماہی رسالہ شائع نہ ہوتا تھا - ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اردو نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا اور شرط یہ رکھی کہ مضامین حتی‌الامکان عام فہم زبان میں لکھے جائیں ، یورپ کے علمی انکشافات اور فنی اختراعات کو صحت کی احتیاط کے ساتھ اردو خواں اشخاص میں متعارف کیا جائے - اس رسالے کی اشاعت میں جامعہ عثمانیہ کے فاضل اساتذہ سے بڑی مدد ملی جو اب سائنس کی اعلیٰ تعلیم زبان اردو کے ذریعے دینے میں ماہر ہوگئے تھے - شروع میں علم کیمیا کے استاد ڈاکٹر مظفرالدین قریشی مرحوم ادارت کا فرض انجام دیتے رہے پھر محمود احمد خان اور نصیر احمد صاحب استاد طبیعات جامعہ عثمانیہ شریک غالب ہوگئے - ان صاحبوں کی محنت و سلیقہ مندی میں کلام نہیں لیکن سائنس کے علمی مسائل سے عام اردو خوانوں کا مذاق آشنی نہ رکھتا تھا - رسالہ برابر خسارے سے چلتا رہا - یہ بار ایک بڑے مقصد کی خاطر جناب مولوی صاحب نے بہ طیب‌خاطر گوارا کیا اور مضامین ، یا تصاویر و طباعت کا معیار پست نہ ہونے دیا - چناں‌چہ تقسیم ہند کے گذشتہ فسادات میں کچھ مدت بند رہنے کے بعد دوبارہ کراچی سے یہ رسالہ پہلے سے زیادہ شان و خوبی کے ساتھ جاری کردیا ہے -

اُردو لغت

سنہ ۱۹۳۰ء میں جناب مولوی صاحب اورنگ‌آباد کالج کی صدارت سے سبک‌دوش ہوئے تو حکومت حیدرآباد نے بہ اصرار انھیں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ' اردو کا صدر مقرر کیا اور دس برس کے لیے بارہ ہزار روپیہ (سکہ عثمانیہ) سالانہ کی ایک خاص امداد بھی منظور فرمای کہ وہ اردو زبان کی جدید ، کلاں تر لغت تالیف کریں جس کی ایک مدت سے خواہش تھی - فیلن اور پلٹ کی ہندستانی سے انگریزی لغات کے علاوہ اس وقت اردو میں " فرہنگ آصفیہ ،، اور " نوراللغات ،، متداول تھیں - مفتی امیر احمد صاحب امیر مینای نے وسیع تر پیمانے پر " امیر اللغات ،، لکھنی شروع کی تھی مگر اس کی صرف ایک جلد (حرف الف) چھپی - مفتی صاحب کے انتقال کے بعد کام ناتمام رہ گیا - جناب مولوی صاحب کا منصوبہ یہ تھا کہ الفاظ کی اصل اور گذشتہ تاریخ کو تفصیل و تحقیق سے لکھا جائے جس پر سابق لغت نویسوں نے کوئی خاص اعتنا نہ کی تھی - بہت سے الفاظ سہواً یا شاید متروک سمجھ کر چھوڑ دیے گئے تھے -

مرکب افعال سے اردو میں نئے نئے معنی پیدا ہوجاتے ہیں ۔ مروجہ لغات میں یہ پہلو بھی خاصا تشنہ رہ گیا تھا ۔ دوسرے، قدیم و جدید مصطلحات علم و فن شامل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا ۔ مولوی صاحب اپنی جامع لغت میں ان سب کو حتی الامکان فراہم کرنا چاہتے تھے ۔ الفاظ و محاورات کی اسناد تلاش کرنے میں مصنفین نظم و نثر کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع کردیا تھا ۔ ایک تجویز یہ تھی کہ دکنی لغات جو اب متروک ہیں ، دو تین جلدوں میں مرتب کر کے کتاب کا ضمیمہ بنادیے جائیں ۔ غرض بڑے منصوبوں کے ساتھ پوری مستعدی سے کام کا آغاز ہوا ۔ مولوی صاحب کے جامعہ عثمانیہ میں حیدرآباد آ جانے کے باوجود انجمن کا دفتر و مطبع اورنگ آباد ہی میں رہا لیکن لغت کا دفتر حیدرآباد میں کھولا گیا ۔ مولوی احتشام الدین صاحب حقی دہلوی مددگار مقرر ہوئے ۔ مرحوم ، اردو زبان کے ادیب ابن ادیب تھے اور ان سے بہتر اس کام میں مددگار ملنا مشکل تھا ۔ مگر ایک عرصے بعد انجمن کے بعض مخالفوں نے تالیف کتاب کی ساری کارگزاری جو ان مرحوم سے منسوب کی ، یہ محض مبالغہ اور فتنہ طرازی کی بات تھی ۔ ان کا کام صرف مطبوعہ اور دوسروں کے تلاش کردہ الفاظ کو ترتیب سے جمانا ، ان کی شرح اور معنی کو ضرورت ہو تو صاف و سلیس لکھنا تھا ۔ محاورات اور مرکبات جو ان کے خیال میں چھوٹ گئے تھے، وہ اضافہ کردیتے تھے اور ان کے محل استعمال کی مثالیں تحریر کرتے تھے مگر یہ اکثر غیر ضروری ثابت ہوئیں اور دو دو تین تین دفعہ کی نظرثانی میں حذف کردی گئیں نظرثانی خود مولوی صاحب اور ایک کمیٹی کرتی رہتی تھی جس میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ، جناب پنڈت کیفی ، اور راقم الحروف شریک تھے۔ الفاظ کی اصل اور سرگزشت کا پتہ چلانے کے لیے سنسکرت اور ہندی زبانوں کے بعض ماہر (پنڈت ونشی دھر وغیرہ) مامور تھے ۔ عربی الاصل الفاظ کے مادے عربی داں حضرات (ڈاکٹر صدیقی صاحب کی نگرانی میں) لکھ کر بھیجتے تھے ۔ نظم و نثر کی مستند کتابوں سے الفاظ و اسناد ڈھونڈنے میں کئی کئی صاحب مصروف رہے ۔ مگر ان سب کاموں کو خود مولوی صاحب بار بار دیکھتے اور جزی تلاش و تحقیق تک میں شریک ہوتے تھے ۔ طرفہ تر یہ کہ جس قدر کام زیادہ ہوا ، مولوی صاحب کے منصوبے بڑھتے رہے ۔ چناں چہ گو دس بارہ برس میں لغت کا اتنا کچھ سرمایہ فراہم ہوگیا کہ پہلے کسی کے خیال میں بھی نہ آسکتا تھا ، کتاب تکمیل کو نہ پہنچی ۔ چند اجزا حیدرآباد کے سرکاری مطبع

میں چھپے تھے کہ ”آزادیٔ ہند،، کی آندھیوں میں وہ دفتر ھی پراگندہ ھو گیا۔

دور اورنگ آباد کا اختتام

برّعظیم کا سیاسی تلاطم پہلی جنگ عظیم کے زمانے سے شروع ھوا۔ تحریک خلافت، ترک موالات وغیرہ کے طوفانوں سے بڑھتا ھی چلا گیا۔ آگے چل کر جب انہی طغیانیوں نے ھندو مسلم اختلاف کی صورت اختیار کی تو زبان کا مسئلہ بھی نہایت نا گوار مناقشہ بن گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب کو اردو کی محبت اور مدافعت میں مہاتما گاندھی اور سبھی کانگرس والوں سے لڑائی کرنی پڑی۔ تفصیل اگلے باب میں آتی ھے مگر ان معرکہ آرائیوں نے انہیں خدمت علم و ادب کے خلوت کدے سے باھر کھینچ لیا۔ علی گڑھ کی مجلس مشاورۃ (اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے فیصلے کے مطابق انجمن ترقی اردو کا مرکز دھلی قرار دی گئی۔ جناب مولوی صاحب نے حیدرآباد کی ملازمت کو اردو کی خدمت پر قربان کیا۔ اورنگ آباد کی سکونت ترک کردی۔ بیش قرار مشاھرے سے زیادہ یہ ھجرت اُن پر شاق تھی۔ بیس پچیس برس کے قیام نے دکن کے اس قدیم دارالحکومت اور خوش منظر مقام کو وطن کی طرح عزیز بنا دیا تھا۔ یہاں کے لوگوں میں مولوی صاحب نہایت محبوب و محترم ھو گئے تھے اور خود اُن سے دلی محبت کرنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنے معزز ھم عصروں کے جو لاجواب مرقّع قلم سے تیار کیے ھیں (= ”چند ھم عصر،،) اُن میں دو اورنگ آباد کے جمعدار نور خاں اور نام دیو مالی کی یادگار ھیں!

دھلی کو انجمن کی منتقلی سنہ ۱۹۳۸ء میں ھوئی۔ اس سے ایک سال پہلے سر سید راس مسعود جو اورنگ آبادی دور میں سنہ ۲۶ سے صدر انجمن تھے، دنیا سے اُٹھ گئے۔ اس اعتبار سے بھی دھلی میں منتقلی سے (زیر صدارت سر تیج بہادر سپرو) اُس کے ایک نئے دور کی ابتدا ھوئی۔ اجمالی طور پر نظر ڈالئے تو انجمن ترقی اردو صحیح معنی میں اورنگ آباد آکر ھی علی گڑھ کانفرنس کی ماتحتی سے آزاد ھوئی، مستقل ادارہ بنی اور ترقی اردو کے مقاصد استقلال و تسلسل کے ساتھ انجام دئے۔ پچیس برس کی سعی و محنت سے سو کے قریب نئی کتابیں اردو میں شائع کیں۔ دو اعلیٰ درجے کے سہ ماھی رسالے اردو اور سائنس جاری کئے۔ ان مطبوعات کی تالیف ترجمہ اور طباعت میں مجموعی طور پر کئی لاکھ روپیہ صرف کرنے کے قابل ھوئی۔ اردو (انگریزی) ٹائپ کا مطبع قائم کیا۔ جا بہ جا شاخیں، اردو کتب خانے اور مکتب کھولے۔ سنہ ۳۷ میں ان کی تعداد سو سے متجاوز ھو گئی تھی۔ عام ارکان

تین سو سے زیادہ اور معاونین و سر پرست نوے کے قریب تھے جن سے معقول عطیات وصول ہوئے ۔ جس وقت علی گڑھ سے اورنگ آباد آئی تو کل کائنات ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا اور جب یہاں سے دہلی چلی تو مطبوعات کے ذخائر مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لادے گئے چھاپے خانے کا کثیر بھاری سامان اور کاؤں کو حمل و نقل کی دشواری کی وجہ سے اورنگ آباد ہی میں فروخت کردینا پڑا ۔ جناب مولوی صاحب کا بیش بہا ذاتی کتب خانہ اور لغت اردو کا دفتر جو حیدرآباد سے براہ راست دہلی گیا ، بجائے خود ایک اثالا الگ تھا ۔ یہ تمام ذخائر اور یہ ساری حیرت انگیز ترقی بے شبہ شخص واحد کے اخلاص و ایثار ، لگاتار محنت و قابلیت کا ثمرہ تھی ۔ غلام ربّانی صاحب نے اپنی مختصر کتاب ''انجمن ترقی اردو کی کہانی'' کو سنہ ۱۹۳۷ء میں سچّی تحسین کے جن کلمات پر ختم کیا تھا ، وہ دہرانے کے قابل ہیں :-

''انجمن ترقی اردو کی کہانی عزم و استقلال ، محنت و ہمدردی اور خلوص و ایثار کی کہانی ہے اس کے ہیرو کی پاک اور بلند مرتبہ سیرت ملک کے لئے ایک سبق ہے ۔ اس کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا ہے اس کی سرگرمیوں اور مستعدیوں کو دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے ۔ اس کی زندگی کا ہر لحظہ اردو کی ترقی کے خیال میں گزرتا ہے اور یہی وہ اسباب ہیں کہ انجمن کے باغ کی خزاں سدا بہار سے بدل گئی اور اب اس کی قلمیں ملک کے کونے کونے میں لگائی جارہی ہیں ۔ قوم کو اب یہ شکایت نہیں ہوسکتی کہ اس میں ہمدردی اور خلوص سے کام کرنے والے موجود نہیں ، بلکہ قوم سے یہ شکوہ ہوسکتا ہے کہ آٹھ کرور میں سے آج تک آٹھ لاکھ نہیں ، آٹھ ہزار بھی حضرات ایسے نہ ملے جو زیادہ نہیں سو سو روپیہ ہی انجمن ترقی اردو کے واسطے فراہم کردیں ۔ زبان آردو کی ترقی ملک کی علمی اور ذہنی ترقی ہے اور انجمن کا آخری مقصد ملک میں ایک عام اتحاد اور عالم گیر محبت پیدا کرنا ہے ۔ بہت مبارک ہیں وہ حضرات جو انجمن کی مدد کرتے اور اس کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں ۔ ہم نے اس تحریر میں جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ مدظلہٗ کی گذشتہ پچیس سال کی عرق ریزیوں اور جاں فشانیوں کا ایک سرسری سا خاکہ پیش کیا ہے اور گویا یہ آپ کی معتمدی کی ''سلور جوبلی'' ہے ۔ خدا وہ دن لائے کہ ملک آپ کی ''گولڈن جوبلی'' اور ''ڈائمنڈ جوبلی'' منائے !''

باب سوم

انجمن کی معرکہ آرائیاں

انجمن ترقی اردو شروع سے علمی ادارہ تھی ۔ مذہبی اور سیاسی مسائل سے اسے تعلق نہ تھا ۔ مولوی عبدالحق صاحب طبعاً اور اصولاً ان حدود سے تجاوز نہ کرتے تھے ۔ صرف زبان کا سرمایہ بڑھانے اور اسے جدید علمی اور تعلیمی زبان بنانے کی سعی میں منہمک تھے ۔ آن کی بلند خیالی اور نئے زمانے کے تقاضے سے یہ منصوبہ اتنا عظیم و وسیع تھا ، کہ دوسرے ملکی یا ملّی مسائل میں حصہ لینے کی فرصت ہی نہ مل سکتی تھی(۱) ۔ پھر ایک دیسی ریاست کے ملازم اور چھوٹے سے شہر میں قیام ہونے کے باعث ، وہ ھندستان کی عام سیاسیات سے الگ تھلگ رہے ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ملک میں تحریک خلافت ، ترک موالات وغیرہ کے بڑے بڑے زلزلے آئے ۔ علی گڑھ پر علی برادران اور آن کے طاقت ور حلیفوں نے ایسی یورش کی کہ اس کی بنیادیں ھلنے لگیں ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب بھی بعض جلسوں میں شریک ہوئے لیکن ظاہر ہے کہ یہ شرکت خالص ذاتی اور تعلیمی نوعیت کی تھی ، انجمن ترقی آردو سے اس کا کچھ واسطہ نہ تھا ۔ علی گڑھ ، یا کسی دھلی ، لاھور وغیرہ کے بھونچال کی کوی دھمک اورنگ آباد کے مقبرہ رابعہ دورانی تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر وہ جو کہا گیا ہے کہ :

---

(۱) ۔ ۱۹۳۵ء میں جناب مولوی صاحب نے '' جائزہ زبان آردو ،، کی ایک تجویز مرتّب کی اور اپنے نظما نیز ایجوکیشن کانفرنس کی پسندیدگی حاصل کر کے مختلف علاقوں میں زبان آردو کے متعلق گذشتہ اور حالیہ معلومات فراہم کرنے کا انتظام کیا اس مفید تجویز کا حال ہم آیندہ انجمن کی مطبوعہ کتاب ,, جایزہ زبان آردو ،، کے تبصرے میں پڑھیں گے ۔ لیکن یہ کوشش محض معلوماتی قسم کی تھی ، سیاسیات سے براہ راست اس کا کچھ تعلق نہ تھا ۔

گر نہ ستانی بہ ستم می رسد

ان ہی دنوں قومی زبان کا مسئلہ کانگریسی سیاسیات کی لپیٹ میں آگیا ۔ اسی پیرائے میں ، آردو کو ممالک ہند سے نکال دینے کی خواہش جو پہلے متعصب فرقہ پرستوں تک محدود تھی ، ایک عام اور خطرناک سیاسی تحریک بن گئی ۔ جناب مولوی صاحب کو آردو کی حفظ و بقا کی خاطر مقابلے میں نکلنا پڑا ، اور زبان کے لیے طویل و شدید معرکہ آرای انجمن کی سرگزشت اور خود ممدوح کی زندگی کا ایک مستقل عنوان ہوگئی ۔ اول اول مولوی صاحب کے احتجاج پر گاندھی جی نے یہ خیال ظاہر کیا اور بعد میں کانگریسی مسلمان یہی رٹ لگاتے رہے (۱) کہ مولوی عبدالحق صاحب کو اتنا سخت مواخذہ اور مناقشہ نہ کرنا چاہیے تھا مگر " آزادی ہند " کے نتایج نے ثابت کر دیا کہ آن کی ناراضی محض بدگمانی اور بدمزاجی پر مبنی نہ تھی ۔ بھارت کی حکومت میں اب آردو کو علاقای زبان تک نہیں مانا گیا اگرچہ وہاں کے وزیر اعظم اسے خاص اپنے وطن (دو آب) کی زبان بتاتے رہتے ہیں ۔

یہ معرکہ آرای نہ صرف انجمن بلکہ آردو زبان اور خود ہندی مسلمانوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ ہم اس کے حالات بیش‌تر جناب مولوی صاحب کے مستند مطبوعہ بیانات سے اخذ کریں گے ۔ ہمارا قیاس ہے کہ جدید ہندی کے حامیوں اور کانگریسی سیاست‌دانوں میں اپنی الگ زبان چلانے کی جو قوی تحریک پیدا ہوی ، عام سیاسی اسباب کے علاوہ ، اس کا ایک سبب آردو کی تیز ترقی اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی بےنظیر کام‌یابیاں تھیں ۔ صدی کے دوسرے تیسرے دہے میں بےشمار آردو کتابیں ، رسالے ، اخبار ہر حصہ ملک میں شایع اور نہایت مقبول ہوے ۔ برعظیم کی کوی دوسری زبان تعداد و منزلت میں آردو مطبوعات کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی ۔ بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا کی سرگرمیاں ٹھنڈی نظر آنے لگی تھیں ۔ ادھر مختلف

---

(۱) ۔ سب سے پہلے ڈاکٹر اشرف صاحب نے کانگریس کے شعبہ اطلاعات کی طرف سے ایک رسالہ چھاپا تھا جس میں کمال دلیری سے گاندھی جی کی ہندی سمیلن کی کارروای کو آردو کے حق میں مفید بتایا گیا ہے !
(دیکھو رسالہ آردو ۱۹۳۷ع ص ۴۳۲)

صوبای زبانیں ، خصوصاً گجراتی اور سرہٹی ، جدید ہندی سے بڑھی جاتی تھیں - نظر برایں کانگریس کے ,, ہند گیر ،، اکابر کا سہارا لینا ضروری ہوا - کہتے ہیں کھدر پرچار اور اچھوت سدھار کے کاموں سے مہاتما جی کا جی بھر گیا تھا ، نئے ''تجربے،، کی فکر میں تھے - شاید ہندی کے حامیوں نے سن لیا کہ - ,,سرفتنہ دارد دگر روزگار،،

ادب ہندی کی انجمن ('' ہندی ساہتیہ سمیلن ،،) کے اجلاس کا صدر گاندھی جی کو منتخب کیا (۱۹۳۵) - دوسری ادبی انجمنوں کو ہندی کی بغل میں داب لینے کی یہ تجویز بھیلای کہ اگلے سال پورے بھارت کی زبانوں کا ادبی اجتماع ناگ‌پور میں بلایا - آردو کے چند نوجوان ادیب مدعو کیے گئے تھے - انجمن ترقی آردو کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی عبدالحق صاحب نے شرکت کی - ۲۴ اپریل ۳۶ء کے پہلے اجلاس ھی میں یہ قرارداد پیش ہوی کہ :-

> '' اس پرشد کا آدیشن ہوگا : (۱) ہندستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساتھ ساھتیوں اور ساھت کاروں میں آپس میں میل جول کرنا .... (ب) اس سبھا کا کام '' ہندی ہندستانی ،، میں ہوگا ....،،

مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ '' یہ (ہندی ہندستانی) کا لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا - غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا ،، - جب آن سے کہا گیا کہ نیشنل کانگریس کی قرارداد میں صرف '' ہندستانی ،، کو ملک کی زبان تجویز کیا گیا ہے جو ناگری یا فارسی کسی خط میں بھی تحریر کی جاے - کہنے لگے وہ ریزولیشن میں نے ھی بنایا تھا ! ،، اور جب کہا گیا کہ اس وقت '' ہندستانی ،، کے معنی کسی نے یہ نہیں سمجھے تھے - جواب دیا کہ اب میں نے بتادئے - اب سمجھ لیجے !

مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ دوسرے (سہ پہر کے) جلسے میں پھر یہی بحث چھڑی - اس وقت پنڈت جواھر لال نہرو بھی موجود تھے اور خیال تھا کہ وہ بہ حیثیت صدر کانگریس ضرور میری (یعنی کانگریسی قرار داد کی) تائید کریں گے لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوی کہ آنھوں نے ایک لفظ بھی

نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے ۔ اور ایک نہیں وہاں آٹھ تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا . . . . ،،

پھر مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ,, اب اس کارروای پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں ۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنی ہندستانی بنانے میں ، پھر ,, ہندی ہندستانی ،، کے جدید لفظ کی اختراع میں اور آخر میں ,, ہندی اتھوا ہندستانی ،، کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں ۔ پہلے آردو کا لفظ ترک کر کے ہندستانی اختیار کیا گیا تھا ۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اھل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کردیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اب آردو کی بجائے ہندستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا ۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا ۔ اب ہندستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہوگیا اور صرف ہندی رہ گیا . . . . .

,, اسی بحث کے سلسلے میں گاندھی جی نے کہا کہ ,, آردو زبان مسلمانوں کی مذھبی زبان ہے ۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاھوں نے اسے بنایا اور پھیلایا ، مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں . . . . . . میں ہر چند یہ توجیہ کر کے اپنی تسلّی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا ،، آخر میں مولوی صاحب لکھتے ہیں :

,, ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندستانی یعنی آردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آ گیا ہے کہ آردو تو آردو وہ تنہا ہندستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے ۔ آنہوں نے اپنی گفتگو میں جو برسر اجلاس تھی ، ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر رزولیشن میں تنہا ہندستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب آردو سمجھا جائے گا ۔ لیکن ان کو نیشنل کانگریس کے رزولیشن میں تنہا ہندستانی کا لفظ رکھتے ہوں یہ خیال نہ آیا ۔

آخر اس قلب ماھیت کی کیا وجہ ہے ؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ھیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوں ؟ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس

تمام تغیّر و تبدّل ، توڑ جوڑ اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے بد نصیب ملک کا پالی‌ٹکس ہے - جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتہ ہوجائے گا اس وقت تک وہ ہندستانی ہندستانی ، پکارتے رہے جو تھپک کر سلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی لیکن جب انہیں اس کی توقع نہیں رہی یا انہوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہیں سمجھی تو ریا کی چادر اتارکر پھینک دی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے - وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں - وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے - ان کو اگر اپنے وسیع ذرایع اور وسایل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں ...... ،،
(رسالہ اردو - اپریل ۱۹۳۶ء)

جب مولوی صاحب کا یہ مضمون شایع ہوا تو ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں خاصا ہنگامہ بپا ہوگیا - کئی سال سے کانگریس کے ساتھ سیاسی اختلاف ترقی کررہا تھا - ناگ پور کے پرشد کی کارروائی کو اردو اخباروں نے کثرت سے چھاپا - گاندھی جی کے طرزِ عمل پر سخت نکتہ چینی کی - اختلافات کی فہرست میں زبان کا قضیہ جلی عنوان بن گیا - بہت سے مریدوں کے ایمان مہاتما کی پلٹیاں دیکھ کر پہلے ہی پلٹ چکے تھے اب جو انہیں نئی ہندی کے فرقہ‌پرست لشکروں کی سپہ سالاری کرتے دیکھا تو یہ لوگ بالکل منحرف ہو گئے - گاندھی جی نے اپنے اخبار ,, ہریجن ،، میں دو تین مضمون تشریح و توجیہ میں لکھے اور آخر میں یہاں تک لکھ دیا کہ ہندی ، ہندستانی ، اردو تینوں ہم معنی ہیں تینوں سے ایک ہی زبان مراد ہے - ناموں کے اختلاف میں کیا دھرا ہے جو اس پر لڑائی جھگڑا کیا جائے ؟ بالفاظ دیگر ثابت ہوا ع

که بورانی ~~ہست~~ نیست بادنجاں و بادنجان بورانی !

مگر ناگ پور کے جلسے میں خود ہی کہا تھا کہ ہندی سے ان کا مطلب وہ کتابی زبان ہے جو ابھی بول چال میں نہیں آئی اور ہندستانی ، آج کل کی مروجہ بولی کو کہتے ہیں ! مولوی صاحب نے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ اگر یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں تو پھر کانگریس کی سابقہ قرارداد کی ,, ہندستانی ،، میں ہندی کی شاخ لگانے کی کیا ضرورت تھی ؟ اس کا کوئی جواب نہ ملا -

علی گڑھ کی مجلس مشاورہ سنہ ۳۶

جناب مولوی صاحب نے کئی سال بعد کی ایک تقریر میں ناگ‌پور کو ,,جاگ‌پور،، کا نام دیا ہے ۔ فرماتے تھے کہ پرشد کے جلسے میں اکابر کانگریس کو قریب سے دیکھا تو میری آنکھیں کھل گئیں ۔ وہ خطرہ جو دور سے وہم کا غبار معلوم ہوتا تھا ، تعصب و عناد کا دل بادل بن کے سر پر نظر آیا ۔ برطانی عہد میں جب فارسی ، سرکاری دربار سے خارج ہوی تو مسلم ایرانی تہذیب کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں ۔ اب انگریزوں کے پرداختہ ہندو آردو کے مٹانے کی فکر میں تھے کہ مسلمانوں کا قریبی ماضی آن سے بعید ہوجاے اور ہندستان میں ان کی ساری قومی تاریخ ایسی مُڑ تڑ کے رہ جاے جیسی دیوناگری یا انگریزی تحریر کے پیچیدہ حروف اسے دکھا سکتے ہیں ! مسلمان رجال سیاسی کو ان مسایل سے عموماً گہری واقفیت یا دل‌چسپی نہ تھی ۔ خدا نے بے زبان آردو کی حمایت کے لیے مولوی عبدالحق صاحب کو تیار کیا ۔ آنہوں نے لوگوں کو خطرے سے آگہ کرنے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ۔ پرشد کے جلسوں میں بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ لڑای پوری کانگریس کے لشکروں سے لڑنی پڑے گی ۔ لہذا مولوی صاحب نے بھی ضروری سمجھا کہ آردو کے حامیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مجتمع کرنے کی کوشش کی جاے ۔ آن کی تحریر میں اخلاص کا جادو بھرا تھا ۔ رسالہ آردو کا مضمون جس میں پرشد کی کیفیت چھپی تھی جگہ جگہ نقل ہوا اور ہندستان بھر میں مشکل سے مسلمانوں کا کوی اخبار یا رسالہ ایسا ہوگا جس نے اس مسلے پر جوش‌انگیز اداریات نہ چھاپے ہوں ۔ سلسلہ تحریر کے ساتھ مولوی صاحب نے اسی زمانے میں بعض ادبی اجتماعات مین تقریریں کیں ۔ پنجاب و کشمیر کا دورہ کیا ۔ لاہور میں انجمن کی صوبای شاخ قایم ہوی ۔ پنجاب میں عام طور پر آردو کی حمایت کا جوش پھیل گیا ۔ اب جناب مولوی صاحب نے ممالک ہند کے چیدہ اہل الراے کو (۲۴ ، ۲۵) اکتوبر کی تاریخوں میں علی گڑھ آنے کی دعوت دی ۔ دعوت نامہ کئی اعتبار سے نقل کرنے کے لایق ہے :-

جناب والا ۔

جس تجویز کا میں نے اپنے مضمون ,,بھارتیہ ساھتیہ پرشد کی اصل حقیقت،، میں وعدہ کیا تھا ، وہ میں جناب کی خدمت میں بھیجتا ہوں ۔ مجھے آپ جیسے باخبر اور صاحب بصیرت شخص کی خدمت میں اس امر کے جتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری زبان کے لیے یہ وقت بہت نازک ہے اور اگر اس وقت ہم نے اس کے تحفظ اور ترق کے لیے کچھ نہ کیا تو ہم اپنے ملک اور قوم کے حق میں بڑا ظلم کریں

گے۔ وقت کی نزاکت اور ملک کے حالات کو دیکھ کر بہت غور و فکر کے بعد یہ تجویز مرتب کی گئی ہے اور مصمم ارادہ کر لیا گیا ہے کہ خواہ ہمارے راستے میں کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں ہم اس پر عمل کر کے رہیں گے۔ اس غرض سے منتخب اصحاب کی ایک کانفرنس کا انعقاد علی گڑھ یونیورسٹی میں اکتوبر کی ۲۴ اور ۲۵ کو کیا جائے گا۔ اس کانفرنس میں جس میں ہر صوبے کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا ہے یہ تجویز غور و بحث کے لیے پیش کی جائے گی۔ لہذا مودبانہ التماس ہے کہ جناب اس کانفرنس میں شریک ہوکر اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں۔ یہ کانفرنس کوی عام مجمع نہ ہوگا بلکہ صرف ایسے منتخب اصحاب کو زحمت دی گئی ہے جو زبان کے معاملے میں خاص بصیرت اور تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے اپنے صوبے کے نمایندہ ہو سکتے ہیں تاکہ اس تجویز کے ہر پہلو پر اطمینان کے ساتھ غور اور بحث ہوسکے کانفرنس کی منظوری کے بعد عام طور پر اس کا اعلان کیا جائے گا اور جو امور کانفرنس میں طے ہوں گے، ان پر جہاں تک جلد ممکن ہوگا، عمل درآمد شروع کردیا جائے گا۔

چوں کہ یہ نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے اور اس کا قطعی فیصلہ کرنا منظور ہے اس لیے آپ کی شرکت کی خاص طور پر استدعا کی جاتی ہے۔ ایسے اجتماع بار بار نہیں ہو سکتے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر جہاں تک ہمارے امکان میں ہے اسے کام یاب بنانے کی کوشش کرنی چاہیے،،۔

منسلکہ تجویز میں انجمن ترقی اردو کے علمی اور اشاعت زبان کے مقاصد کو زیادہ وسیع پیمانے پر انجام دینے کی مناسب تدابیر تحریر تھیں اور اسے کل ہند تنظیم بنانے کی غرض سے ہر صوبے میں مستقل شاخ قایم کرنے پر زور دیا گیا تھا اور اسی بنا پر ایک تجویز یہ تھی کہ صدر انجمن کا مستقر کسی مرکزی مقام پر لایا جائے جہاں اس کے دفتر، کتب خانے اور دارالاشاعت وغیرہ کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں،،۔

جس بلند ارادے اور گہرے جذبے سے دعوت دی گئی تھی، اُسی شوق سے مدعو حضرات نے اسے لبیک کہا۔ بنگال، اڑیسہ، مدراس، بمبئی، حیدر آباد، سی پی، راج پوتانہ، پنجاب، دوآب، سب ہی صوبوں سے اہل علم و قلم علی گڑھ تشریف لائے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب وائس چانسلر اور رشید احمد صاحب صدیقی، استاد

شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی نے بہ حیثیت صدر و سکریٹری مجلس استقبالیہ مہمانوں کے قیام اور جلسوں کا نہایت خوبی سے انصرام کیا ۔ پہلے اجلاس کی صدارت راجہ امیر احمد خاں صاحب رئیس محمودآباد نے کی دوسرے دن کے اجلاس کے صدر نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیم ریاست حیدر آباد تھے ۔ تقریباً اسی معزز شرکائے مجلس میں جو علی گڑھ کے باہر سے آئے ، چار غیر مسلم اردو شناس بھی تھے ۔ یعنی جناب پنڈت امر ناتھ ساحر ، علامہ کیفی ، مولوی فاضل مہیش پرشاد ، رائے بہادر رام بابو سکسینہ ۔ جیسا کہ مطبوعہ روداد اور مقامی اخبار میں چھپا تھا ,, کانفرنس کے انعقاد کی تاریخیں ۲۴ اور ۲۵ اکتوبر قرار دی گئی تھیں ۔ بعض اصحاب ایک روز پہلے ہی تشریف لے آئے تھے لیکن اکثر مہمان ۲۴ کو آئے اور ۴ بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔ یہ سب جانتے ہیں کہ جہاں مذہب یا سیاسیات کا معاملہ ہوتا ہے تو لوگ ہنگامہ آرای اور دلچسپی کی خاطر یا جوش عقیدت یا جوش انقلاب و آزادی کی خاطر جوق جوق جمع ہوجاتے ہیں لیکن ایک ادبی مجلس کے لیے — اور وہ بھی ایسی خشک کہ جس میں نہ پرزور تقریریں تھیں نہ پرجوش لکچر ، نہ جھنڈے نہ جھنڈیاں ، نہ جے جے کار اور اللہ اکبر کے نعرے — دور دور سے لوگوں کا آنا کس قدر قابل حیرت تھا ! ،،

کانفرنس کے جلسوں میں تقریریں معدودے چند ہوئیں مگر مفید و سنجیدہ تھیں ۔ سکریٹری کی پیش کردہ تجاویز کو اہل الرائے نے پسند کیا جن کا اصل منشا یہ تھا کہ انجمن ترقی اردو فی الواقع پورے ہندستان کا نمائندہ ادبی ادارہ بن جائے ، علمی مطبوعات کے ذریعے وسیع تر پیمانے پر زبان کی خدمت انجام دے اور زیادہ قوت کے ساتھ اس کے حقوق کی حفاظت کا کام کرے ۔ غور و بحث کے بعد اس کا صدر مقام دھلی تجویز کیا گیا کہ پہلے اردو زبان کا مولد و منشا مانا جاتا تھا اور اب سارے برعظیم کا دارالسلطنت تھا ۔ انجمن کے علمی کاموں میں مشورہ دینے کی غرض سے ایک ادبی کمیٹی مرتب کی گئی جس میں تمام ہندستان کے پچیس ممتاز افراد کے نام تھے :—

(۱) ڈاکٹر سر محمد اقبال(۱)

---

(۱) حضرت اقبال مرحوم علالت کے باعث کانفرنس میں نہیں آ سکے مگر اپنے خط میں جو جناب مولوی صاحب کو لکھا اور جلسے میں پڑھ کر سنایا گیا ، انہوں نے یہ یادگار کلمات تحریر فرمائے تھے کہ ,, آپ کی تحریک سے ہندستان کے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ھے ۔ اھمیت کے اعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سر سید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی ! ،،

(۲) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

(۳) مولانا ظفر علی خاں

(۴) پنڈت کیفی

(۵) سر تیج بہادر سپرو

(۶) نواب صدر یار جنگ شروانی

(۷) مولانا سید سلیمان ندوی

(۸) حافظ محمود شیرانی

(۹) پنڈت کشن پرشاد کول

(۱۰) مولانا حسرت موہانی

(۱۱) افضل العلما مولوی عبدالحق (مدراس)

(۱۲) خان بہادر رضا علی وحشت (کلکتہ)

(۱۳) قاضی عبد الودود (بہار)

(۱۴) مولانا عبدالماجد دریابادی

(۱۵) ڈاکٹر تارا چند ـ وغیرہ وغیرہ

آخری اجلاس کے صدر نواب مہدی یار جنگ نے اپنی اختتامی تقریر میں کانفرنس کی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کیا اور ان امور کو مکرر واضح کیا کہ انجمن محض علمی کام کرنے والی جماعت ہے ـ اسے کسی دوسری زبان سے رقابت نہیں ہے وہ اردو کی ترقی کے لئے کوشش کرتی ہے جس کو ۱۴ کروڑ انسان بولتے اور سمجھتے ہیں ـ وہ ہندستان کے باہر بھی بولی جاتی ہے اور یہ بات کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ـ تحریر کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی چاہتا ہے کہ جلد لکھا جائے اور تھوڑی جگہ گھیرے تو وہ فارسی میں لکھے اور اگر کوئی چاہتا ہے کہ زیادہ جگہ گھیرے اور جیسی آواز ہو ، ویسا ہی لکھا جائے ، تو وہ ناگری لکھے ـ اردو کی حیرت انگیز صلاحیت کی نسبت آپ نے تصدیق کی کہ ,, حیدر آباد میں ریاضی اور کیمیا کی کتابیں نہ صرف اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں بلکہ پڑھایا بھی اردو میں جاتا ہے ـ اردو میں اس قدر وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ کوئی خیال خواہ وہ کیسا ہی مشکل ہو بے تکلف ادا ہو سکتا ہے ـ یورپ والوں کو اب تک یہ خیال تھا کہ کوئی ہندستانی زبان ایسی نہیں جس میں (مغربی) علوم کی تعلیم دی جاسکتی

ہو لیکن جامعہ عثمانیہ نے اس کو غلط ثابت کر دیا ۔ اس کا تعلیمی معیار ہندستان کی دوسری جامعات سے بلندتر ہے اور اس کے تعلیم یافتہ یورپ میں اعزاز و امتیاز کے ساتھ کامیابیاں پارہے ہیں . . . . ،، (ماخوذ از روداد مطبوعہ ، ص ۵۲)

دھلی آنے کی تیاریاں

علی گڑھ کانفرنس اور اس کی روئداد شائع ہونے سے حامیان آردو میں نئی روح بھر گئی اور خود انجمن ترقی آردو کے حوصلے بڑھ گئے ۔ علمی کام کے سلسلے میں جناب مولوی صاحب نے ارادہ کرلیا کہ آئندہ ہر سال انجمن بیس نئی کتابیں تیار کیا کرے گی۔ رسالہ آردو میں ادبی معلومات اور افکار و واقعات کے مستقل عنوان بڑھائے جن سے اس کی ضخامت دوچند کے قریب ہوگئی۔ سائنس اسی آب و تاب سے جاری رہا۔ لیکن علمی شعبے سے بھی کہیں زیادہ تعلیمی اور تبلیغی کام ہوا کہ مراسلات اور جا بجا دورے کرکے انجمن کی دور دور شاخیں، کتب خانے اور مدراس ملیبار کے علاقوں میں آردو مکتب قائم کئے گئے ۔ یہ سب کافی خرچ طلب کام تھے، علمی مطبوعات کی حد تک انجمن ریاست حیدرآباد سے مزید اعانت کی طالب ہوئی اور ۳۸ء میں اس کی یہ درخواست جامعہ عثمانیہ کی سفارش پر منظور کرلی گئی کہ انجمن کو چھ سال کے لیے پینتالیس ہزار روپیہ (سکہ عثمانیہ) کی سالانہ امداد دی جائے تا کہ انجمن ہر سال کم سے کم بیس ایسی علمی کتابیں شائع کرے جن میں بعض اعلیٰ درجے کی ہوں گی اور بعض عام فہم ، تا کہ آردو ادب میں ہر قسم کا اضافہ ہو اور ہر طبقے کے لوگ اس سے مستفید ہوسکیں،، ۔

دوروں کے مصارف خود مولوی صاحب آٹھاتے تھے لیکن مالی بار سے بھی زیادہ آن کی محنت وسعی، مجاہدانہ شوق کی یاد دلاتی ہے۔ ۱۹۳۷ء کی روداد سے ہم ذیل میں چند دل چسپ، پر از معلومات اقتباس پیش کرتے ہیں:

،، میں نے تقریباً دو مہینے (مئی اور جون) جنوبی ہند کے دورے میں صرف کیے ، اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ معلوم کروں کہ اس علاقے میں آردو زبان کی کیا حالت ہے اور مزید اشاعت و ترویج کی کیا صورت ہوسکتی ہے ۔

زبان کے لحاظ سے مدراس تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: آندھرا، مالابار اور تامل ناڈ، آندھرا میں ہندو مسلمان سب اردو سمجھتے ہیں اور مسلمانوں میں عام طور پر اردو کا رواج ہے، مالابار میں کم ہے، وہاں ماپلوں کی بہت بڑی آبادی ہے، یہ تخمیناً بارہ تیرہ لاکھ ہیں، یہ اردو پڑھنے کے شائق پائے گئے۔ تامل ناڈ کے بعض حصوں میں اردو بخوبی رائج ہے اور مدراس کے بعض علاقوں میں اردو کا رواج کئی صدی سے پایا جاتا ہے اور وہاں اردو کے اچھے شاعر اور ادیب ہوئے ہیں۔ مسلمان ہر جگہ اردو کو اپنی قومی زبان خیال کرتے ہیں اور اردو پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، ریاست میسور اور خاص کر بنگلور میں اردو کا عام رواج ہے۔ بنگلور کالج کے طلبہ اور اساتذہ نے ایک جلسہ کیا تھا جس میں میں بھی مدعو تھا، اُن کی تقریریں اور مضامین سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، یہ معلوم ہوتا تھا گویا میں حیدرآباد اور علی گڑھ میں بیٹھا ہوں!،،

''(شہر) مدراس میں شاخ قائم کرنے کے بعد میں اوٹاکمنڈ چلا گیا۔ چند روز بعد اوٹی کے قرب و جوار کے قریات کا دوزہ کیا۔ وہاں کے بعض صاحبوں سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ اردو کی اشاعت کے لیے ہرطرح آمادہ ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدارس ان قصبات میں موجود ہیں جہاں مسلمان طلبہ اردو پڑھتے ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے لڑکے یا بڑی عمر کے آدمی بھی اردو پڑھنا چاہتے تھے جو دن کے وقت مدرسے میں حاضر نہیں ہوسکتے تھے۔ لہذا ایسے لوگوں کے لیے میں نے انجمن کی طرف سے شبینہ مدارس قائم کردئے اور مدرسین کے لیے کچھ مقرر کردیا اور کتابیں مفت انجمن کی طرف سے مہیا کردیں۔ ان مدرسوں کے ذریعے اس پانچ چھ ماہ کے عرصے میں کافی لوگ اردو پڑھنا لکھنا سیکھ گئے ہیں۔ جن مقامات پر مدرسے قائم ہوئے وہ یہ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ (۱)

---

(۱) آگے تیرہ مقامات کے، جن میں بعض چھوٹے گاؤں تھے، نام لکھے ہیں :—
۱- اوٹاکمنڈ ۲- کونور ۳- کوٹ گری ۴- میٹ پالیم ۵- سرم گای ۶- بکتور وغیرہ۔

" اکتوبر میں چند روز اضلاع آرکاٹ کے دورے میں صرف کئے تا کہ وہاں کے اسلامی مدارس وغیرہ کا معاینہ کرکے اس امر کا اندازہ کروں کہ وہاں آردو کی تعلیم نیز آردو زبان کی عام حالت کیسی ہے۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی کہ اس علاقے میں آردو کا عام‌چرچا ہے۔ مسلمان تو اکثر اسے قومی اور مادری زبان سمجھ‌کر پڑھتے اور بولتے ہیں لیکن ہندو بھی اسے سمجھتے اور اسلامی مدارس میں پڑھتے لکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مدارس کا میں نے معاینہ کیا ۔ آردو ان سب میں پڑھائی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم زیادہ تر آردو ہی ہے۔۔۔۔۔" (ذیل میں ۱۳ مدرسوں کے نام دئے گئے ہیں)۔

پھر پنجاب و بہار وغیرہ کی نئی نئی شاخوں کا ذکر کرنے کے بعد سالانہ کیفیت کے آخر میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ :

" انجمن کی کارگزاری میں اس سال سے ایک اور باب کا اضافہ ہوگیا ہے انجمن نے ان مقامات میں جہاں آردو رائج نہیں یا کم رائج ہے آردو مدارس قائم کر کے اشاعت کا انتظام کیا ہے۔ سب سے اول یہ کام صوبہ مدراس سے شروع کیا گیا ہے چنانچہ اس سال جن مدارس کے قائم کرنے میں مدد دی ، آن کا ذکر ہوچکا ہے۔ ایسے مدارس کے لیے برابر درخواستیں وصول ہورہی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ سب درخواستیں منظور کرلی جائیں لیکن جہاں جہاں زیادہ ضرورت معلوم ہوگی وہاں امداد دینی پڑے گی ، اور آئندہ سال اس تعداد میں کافی اضافہ ہوجائے گا۔ اس لئے ۱۹۳۸ع کے بجٹ میں ایک معتد بہ رقم اسی مد کے تحت میں رکھی گئی ہے۔ لیکن جب تک آردو کے بہی خواہ اور ہم درد اس طرف توجہ نہ فرمائیں گے اور ہماری مدد نہ کریں گے ہم زیادہ مدت‌تک یہ امداد جاری‌نہیں رکھ سکتے یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اصل کام کا وقت یہی ہے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ تین چار سال کا موقع حاصل ہے۔ اگر اس مدت میں ہم‌نے کچھ کر لیا تو فبہا ورنہ آئندہ ایسی دشواریاں پیش آنے والی ہیں کہ ہمارے بنائے کچھ نہ بن سکے گا ۔"

مقامی اعانت کرنے والوں میں مولوی صاحب نے سیٹھ جمال محمد صاحب تاجر مدراس کا بہت شکریہ ادا کیا ہے کہ ''انہوں نے صرف ہمارے کام کو دیکھ کر بغیر کسی درخواست کے از راہ قدردانی و ہمدردی پچھتر روپے ماہانہ ایکسال کے لیے منظور فرمائے اور ہر مہینے مقررہ وقت پر ان کا منیارڈر انجمن میں پہنچ جاتا ہے...''۔

''عبدالحق ، راجندر مفاہمت''

سنہ ۱۹۳۷ع وہ سال تھا جس میں سیاسی اصلاحات سنہ ۱۹۳۵ ع کا نفاذ ہوا۔ حق رائےدہی کی توسیع کے ساتھ صوبوں کو اپنی حکومتیں خود بنانے اور اکثر محکمے خود چلانے کا اختیار ہاتھ آیا ۔ چناں‌چہ چھ صوبوں میں اکثریت نے کانگریسی وزارتیں قائم کیں ۔ تعلیم اور عدالت کے محکمے صوبائی تھے ۔ زبان کے مسئلے کا زیادہ تر تعلق انہی محکموں سے ہے ۔ کانگریس والوں نے اس سلسلے میں نہ صرف نئی ہندی بلکہ قدیم ہندو تہذیب کی حمایت شروع کی ۔ گاندھی جی نے ''واردھا اسکیم'' کے نام سے ابتدای تعلیم کا ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ اسی کی بہن صوبہ' متوسط کی ''ودیا مندر اسکیم'' تھی ۔ ہم اگلی فصل میں ان منصوبوں پر سرسری نظر ڈالیں گے ۔ سردست ملک بہار میں ہندی ، ہندستانی مباحثے نے جو رنگ نکالے اور انجمن کی طرف سے مولوی عبدالحق صاحب نے اس میں جو حصہ لیا ، اس کا مختصر حال سنانا منظور ہے :-

صوبہ' بہار ہمارے زمانے (۱۹۱۲ ع) تک بنگالے میں شامل تھا ۔ انگریزوں نے بچاس ساٹھ برس کی کوشش میں بنگالے کے مسلمانوں کو جاہل و محتاج، کم زور و بے اثر بنایا ۔ اسی سلسلے میں فارسی کی بجائے وہاں انگریزی کو سرکاری زبان کی مسند پر متمکن کیا ۔ انہی کی سرپرستی میں ایک نئی بنگلا تیار ہوئی جو ہندوئیت کے قالب میں ڈھلی تھی ۔ عدالت اور مدرسوں میں اسی بنگلا کو رائج کیا گیا، لیکن بہار میں یہ زبان نہ چل سکتی تھی ۔ البتہ اردو یا ہندستانی کی مخالفت میں انگریز گورنر (کیمبل) تک علانیہ پیش پیش تھے ۔ اسے مٹانے اور ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی خاطر انہی نے اس کا رسم‌الخط ہندی کرادیا ۔ حقیقت میں اردو اور ہندی کے

اختلاف نے سب سے پہلے نزاع کی صورت بہار ھی میں اختیار کی۔ پھر یہ جھگڑا یہاں بڑھتا اور آگے دوآب میں قدم بڑھاتا رہا جیسا کہ کتاب کے پچھلے اوراق میں اجمالاً تحریر کردیا گیا ھے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں جب کہ دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کی ضرورت سب جگہ تسلیم کی جارھی تھی، پٹنہ یونیورسٹی کی سینٹ میں یہ تحریک منظور ھوئی کہ میٹرک تک ذریعہ تعلیم "ھندوستانی" کردی جائے۔ اھل آردو اسے اصولاً قبول کرلنے پر تیار تھے مگر چاھتے تھے کہ "ھندوستانی" کی تعریف اچھی طرح واضح کردی جائے۔ مقامی شاخ کی تحریک پر انجمن ترقی آردو نے ایک خاص جلسہ پٹنے میں منعقد کیا۔ علی گڑھ، دھلی، لکھنؤ کے چند اساتذہ، مصنفین و ناشرین شریک تھے۔ مولانا سید سلیمان صاحب نے صدارت کی (۲۸ اگست ۱۹۳۷ء) اھل جلسہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں "ھندستانی" کو ذریعہ تعلیم بنانے سے متفق تھے مگر جب تک اس زبان کی صحیح تعریف معین نہ ھوجائے، درسی کتابوں کا آردو اور ھندی میں الگ الگ لکھا جانا ضروری سمجھتے تھے۔ ایک قرارداد (۵) میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ "ھندستانی زبان کے قواعد، اصطلاحات لغات کے لیے (حکومت بہار کی طرف سے) ایک کمیٹی مقرر کی جائے جس میں انجمن ترقی آردو اور ھندی کی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں شریک ھوں۔ اس کمیٹی کی کوشش یہ ھونی چاھیے کہ جہاں تک ممکن ھو اتفاق سے کام لیا جائے، لیکن اختلاف کی صورت میں ...... آردو کتابوں کے متعلق انجمن ترقی آردو اور ھندستانی کی ھندی کتابوں کے متعلق ھندی انجمن کے قائم مقاموں کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے ....."

اسی دن سہ پہر کو بابو راجندر پرشاد اور صوبای کانگریس کے سکریٹری جلسے میں آئے اور متعلقہ مسائل پر دوستانہ بحث و اتفاق رائے کے بعد یہ طے ھوا کہ ایک متفقہ اعلان سکریٹری انجمن ترقی آردو (ھند) اور بابو راجندر پرشاد کی طرف سے شائع کیا جائے۔ چناںچہ دونوں صاحبوں کے دستخط سے حسب ذیل بیان مرتب اور شائع کیا گیا۔

"بہار کی آردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست ۳۷ء میں ہمیں ہندستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا ۔ ہمیں فکر تھی کہ "آردو ، ہندی ، ہندستانی،، کے مناقشے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں انہیں دور کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جن مباحث پر گفتگو ہوی تو معلوم ہوا کہ ان میں بڑی حد تک ہم متفق الرائے ہیں ۔ چناں چہ ہم کو اس پہ اتفاق ہے کہ ہندستان کی مشترکہ زبان ہندستانی ہونی چاہیے اور یہ آردو رسم الخط اور دیوناگری دونوں میں تحریر اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لئے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہئے ۔ ہندستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار بھی عام استعمال یا رواج ہونا چاہیے۔ مزید برآں ہماری رائے ہے کہ ہندی اور آردو دونوں کو بہ حیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دئے جانے چاہئیں ۔ ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ آردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے ، ایک مختصر نمائندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہئے جس میں آردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ضرورت مانتے ہیں اور ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے قابل ہیں تاکہ اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جائے ،،

شرح دستخط (مولوی) عبدالحق
(بابو) راجندر پرشاد

بابو صاحب کانگریس کے ممتاز اکابر میں تھے (آج کل بھارت کے رئیس جمہوریہ ہیں) اور خود گاندھی جی کے ایما سے گفتگو کرنے آئے تھے ۔ ان کا اہل آردو سے اس طرح مفاہمت کرنا ، فریقین میں صلح نامہ کی منزلت رکھتا تھا ۔ بہار کی کانگریسی وزارت میں تعلیم کا محکمہ ڈاکٹر سید محمود کے تفویض ہوا تھا انہوں نے ہندستانی

لغات نیز درسیات کی تیاری کے لئے بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی مقرر کردی ۔ اس کا جلسہ مارچ ۳۸ع میں ہوا ۔ ہندستانی لغت اور صرف و نحو کی تالیف کا کام مولوی عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر تارا چند کے سپرد کیا گیا ۔ سب سے اہم تصریحی قرارداد (۵) یہ منظور ہوی کہ :

,, مولوی عبدالحق صاحب مجاز کئے جاتے ہیں کہ ہندستانی زبان کا لغت تیار کریں جس میں وہ تمام عربی فارسی لفظ آجانے چاہئیں جو مستند ہندی مصنفوں نے استعمال کئے ہیں ، اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کئے جائیں جو مستند آردو مصنفوں کے کلام میں پاے جاتے ہیں ،،

زبان کا جھگڑا چکانے کے لئے یہ نہایت مفید آصول تھا اور اگر فریقین استقلال سے اسی پر عمل کرتے تو کم سے کم شمالی ہند میں لسانی تفرقے کی طغیانی کو روک لینا ممکن تھا لیکن ارباب سیاست میں شروع سے اخلاص کی کمی تھی اور جہاں اخلاص نہ ہو وہاں استقلال کہاں سے آ سکتا ہے ؟ مجوزہ لغت کے ابتدای انتظامات میں خاصی دیر لگی پھر بھی مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی میں آردو ہندی داں مددگاروں سے ہندستانی لغت مرتب کرادی جس کے مسودات کمٹی کے سکریٹری صندوقوں میں بھر کر اٹھے لے گئے تھے لیکن کتاب کی تکمیل و اشاعت کی نوبت کبھی نہیں آی اور جہاں تک معلوم ہے یہ آمید افزا منصوبہ مسودات کی منزل سے آگے نہیں بڑھا ۔

۱۹۳۷ع میں انجمن ترقی آردو کو اندرونی صدمہ یہ پہنچا کہ اس کے صدر عزیز القدر سید راس مسعود نے رحلت کی ۔ کئی مہینے کے غور و فکر کے بعد سر اکبر حیدری کی تحریک سے سر تیج بہادر سپرو صدر منتخب کئے گئے ۔ یہ انتخاب انجمن کی اسی کوشش و خواہش کا ایک ثبوت تھا کہ آردو ملک بھر کی مشترک زبان اور فرقہواری منازعات سے محفوظ رہے ۔ سر تیج بہادر کا کشمیری خاندان آخری مغل سلاطین کے دور میں دارالخلافت دہلی میں مقیم رہا اور ہنگامہ ۱۸۵۷ کے بعد الہ آباد چلا آیا تھا ۔ قانون دانی کی اعلیٰ قابلیت کی بہ دولت تیج بہادر وائس روے کی مجلس انتظامی کے رکن مقرر ہوے ۔ برطانیہ کی ,, پریوی کونسل ،، میں شامل کئے گئے ۔ ہندستان کے ممتاز ترین افراد میں شمار ہوتے تھے ۔ مگر مشرقی تہذیب

و شرافت کی دوسری خوبیوں سے بڑھ کر انہیں اپنی زبان و ادب سے دلی محبت تھی۔ شاعری پر اُن کے بعض مضامین سخن سنجی اور انشا پردازی کی نظیر میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اردو کے متعلق ان کا یہ قول ضرب المثل بن گیا ہے کہ وہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ، ناقابل تقسیم میراث ہے۔

ودیا مندر اسکیم

انگریزی حکومت کے محکمہ تعلیم نے ,, سارجنٹ اسکیم ،، کے نام سے ایک منصوبہ شائع کیا تھا کہ تمام اہل ہند کو خواندہ بنانے میں دو ارب روپیہ اور ساٹھ برس کی مدت درکار ہوگی۔ ممکن ہے کہ اس تجویز کے پیرائے میں ہندیوں کی عام شرمناک جہالت کو الم نشرح کرنا مقصود ہو۔ شاید اسی غصے میں مہاتما گاندھی نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا جو ,, واردھا اسکیم ،، کہلاتا تھا۔ مہاتما کا دعویٰ یا خیال یہ تھا کہ پڑھنے والوں سے کھیتی کیاری، دست کاری کرای جاے جس کی آمدنی سے تعلیم کا سارا خرچ نکل آے گا، حکومت پر کوی مالی بار نہیں پڑے گا، رعایا مفت میں خواندہ ہوجاے گی۔ اُن کی خوشنودی کے لئے فاضل عقیدت مندوں نے کاغذ پر تجویزیں تیار کردی تھیں۔ انہیں چھاپ کر ماہرین تعلیم کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ بلکہ بعض حضرات مہاتما کے انہی خیالی منصوبوں کی تحریری تفصیل و تجویز بنانے کی وجہ سے بڑے ماہر تعلیم تسلیم کئے جانے لگے تھے۔ بارے چند ماہ کے چرچے کے بعد یہ نادر منصوبہ بھی مہاتما جی کے گذشتہ و گذاشتہ تجربات کے دفتر میں داخل ہوا اور اُن کی اقامت کے صوبے سے کانگریس وزیروں نے تعلیم کے عام کرنے کی ایک اور تجویز ,, ودیا مندر اسکیم ،، کے نام سے مشتہر کی، جس کی اپنے نام ہی کی وجہ سے زیادہ تشہیر ہوی۔ مندر کا لفظ سن کر مسلمان عوام بہت بھڑکے اور ناگ پور کے ایک عام جلسے میں ان کا جوش و خروش دیکھ کر کانگریسی وزیر بھی گھبرا گئے۔ مگر نام سے قطع نظر یہ مفت اور جبری تعلیم کا منصوبہ کچھ اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ صوبے کے ,, ہندستانی ،، اضلاع سے عملاً اردو کی تعلیم غائب ہوجاے۔ اسی لئے مخالفت کی شورش میں انجمن ترقی اردو پیش پیش تھی۔ اس کے بعض کارکن گاندھی جی سے سیوگاوں جاکر ملے، ان سے وعدہ لیا کہ ,, مندر ،، کا لفظ بدل دیا جاے گا اور ہندستانی اضلاع میں دیوناگری کے ساتھ اردو رسم خط بھی سکھایا جاے گا۔ خود مولوی عبدالحق صاحب نے ناگ پور جاکر وزیر

تعلیم مسٹر شُکلا سے ملاقات کی۔ پھر اُن کے مراسلات کے جواب میں مفصل خط لکھ کر سمجھایا کہ ,,مندر،، کے نام سے مذھبی تعصب اور تفرقے پیدا ہوں گے، ایسی نامناسب جدت پر ضد کرنا اُصول و مصلحت کے خلاف ھے۔ ناگ پور کے معزز مسلمانوں کی طرف سے دوبارہ گاندھی جی سے گزارش کی گئی کہ صوبای حکومت کو کم سے کم آردو مدارس کے بند کرنے سے باز رکھا جاے اور ودیا مندر کے نام کا فیصلہ بہار کمیٹی ھی کے سپرد کر دیا جاے۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ھیں (رسالہ آردو۔ اپریل ۳۸ء) کہ ان میں سے اکثر تجاویز بہت معقول اور ضروری تھیں لیکن ان پر کوی توجہ نہیں کی گئی ,,نتیجہ یہ ھے کہ سی پی کی حکومت نے اس سال دو لاکھ روپیہ ودیا مندر اسکیم کے لئے منظور کیا ھے۔ آردو کی قسمت میں اس میں سے ایک حبّہ بھی نہیں۔ بیتول کے ضلع میں ھندی لازمی کی جارھی ھے۔ صرف ایک آردو اسکول تھا وہ بھی بند کر دیا گیا . . . . . ،، مولوی صاحب نے اپریل میں کلکتے جاکر مولانا ابوالکلام آزاد کو زبان کے مسئلے پر توجہ دلای اور خط پر خط لکھتے رھے مولانا صاحب آردو، وہ بھی الہلالی آردو، کے نامی انشا پرداز تھے بلکہ اسی زینے سے سیاسیات کے شہ نشین پر چڑھے تھے لیکن کانگریس کے صدر ھونے کے بعد آپ کا اسلامی جوش ھلکا ھو گیا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے کُوکنے سے کانگریس کی صوبای وزارتوں کو ایک گشتی مراسلہ تو بھیجا جس میں ھندی کی بجاے ,,ھندستانی،، کا لفظ استعمال کرنے کی ھدایت کی تھی مگر تحریر میں الہلال تو کیا پیسہ اخبار کا بھی زور نہ تھا۔ کانگریسی وزیروں نے مطلق اعتنا نہ کی۔ انجمن کے دو کارکن صحیح حالات معلوم کرنے کی غرض سے سی پی کے اضلاع میں بھیجے گئے۔ آنہوں نے تین مہینے تک دورہ کیا (اپریل تا جولای ۳۸) اور خبر دی کہ اب کئی ضلعوں میں جہاں پڑھنے والے کافی تعداد میں بستے ھیں، آردو کا کوی سرکاری مدرسہ یا آردو تعلیم کا انتظام نہیں۔ لوگوں میں پڑھنے کا بہت شوق پایا جاتا ھے اور آنہوں نے اپنے طور پر آردو مکتب جاری کئے ھیں جن میں ھندو بچے بھی پڑھنے آجاتے ھیں۔ سرکاری حکام کا رویہ آردو تعلیم کے خلاف ھے۔ ,,باندھرنا میں مسلمان بچے جو ھندی اسکول میں پڑھتے ھیں اور جن کی تعداد چالیس ھے، وہ سرسوتی دیوی کے سامنے کھڑے ھو کر پرارتھنا کرتے ھیں۔ جو مسلمان بچے ھندی اسکولوں میں پڑھتے ھیں، وہ عام طور پر بجاے سلام کے ,,نمستے،، اور ,,جے رام جی،، کی

کہتے ہیں - ہندی اسکولوں میں پڑھنے والے مسلمان بچوں کو رامائن ، مہا بھارت ، ساوتری ، اور سیواجی کی سوانح پڑھنی پڑتی ہے . . . . . . ودیا مندر کے خلاف صوبے بھر کے مسلمان ہم آواز ہیں اور ان کی مخالفت کا سلسلہ اب تک جاری ہے،،۔ (اردو جولائی ۳۸ء ص ۶۸۷)

مسلمانوں کی ناراضی بڑھتی رہی - ستمبر ۳۸ء میں کوئی بیس ہزار مسلمانوں نے مجلس قانون ساز (ناگ‌پور) کے سامنے مظاہرہ کیا۔ اکتوبر کی اردو کانفرنس میں قانون شکنی کرنے کی قرارداد بڑے جوش و خروش سے منظور ہوئی - بعض معزز مسلمانوں نے قومی زبان کی خاطر قید و بند میں جانا قبول کیا حتیٰ کہ سکریٹری مسلم لیگ نواب زادہ لیاقت علی خاں ناگ پور آئے اور مسلمانوں کو قانون شکنی روک دینے' کی ہدایت کی - مگر گاندھی جی یا صوبے کے وزیروں نے ان سے کبھی جو وعدے کئے انہیں پورا نہیں کیا(۱) ودیا مندر اسکیم پر اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ۳۹ء میں کانگریسی وزارتیں ہی نہ ٹوٹ گئیں - (۴۱ء میں ,, ودیا مندر ،، نام کے جو چند مدرسے تھے، بند کردیے گئے -)

,, ودیا مندر،، میں ہندو بچوں کو مرہٹی اور نئی ہندی ، جبریہ پڑھانے کی تجویز تھی - دیہی مدارس میں صرف ایک مدرس مقرر ہو سکتا تھا اور بالکل امید نہ تھی کہ وہ اردو بھی پڑھا سکے گا ۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان بچے لازماً اردو پڑھنے

---

(۱) جناب مولوی صاحب نے گاندھی جی کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی تھی جو انگریزی اور اردو میں الگ الگ چھاپی گئی (اگست ۳۸) اس میں گاندھی جی (نیز مسٹر بوس، صدر کانگریس سنہ۱۹۳۷) کے پختہ وعدے کہ ,, ودیا مندر،، کا نام بدل دیا جائے گا ، یاد دلائے تھے جن کی صریحی خلاف ورزی کی جارہی تھی - ایک لطیفہ یہ تھا کہ کانگریسی وزیر اور گاندھی جی کبھی کبھی اس منصوبے کو ,, واردھا اسکیم ،، کے مطابق یا تابع بتا دیتے تھے ۔ خدا جانے خود دھوکے میں تھے ، یا ایک دوسرے کو دھوکا دیتے تھے یا دنیا کو — اتنا ضرور ہے کہ ودیا مندر کی مجلس نصاب کے میر مجلس بھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بنائے گئے تھے جنہوں نے پہلے واردھا اسکیم کا خیالی قلعہ تعمیر کرنے میں یہی منصب معتقدانہ قبول کیا تھا ۔

سے محروم ہوجاتے ۔ گاندھی جی کے منصوبے ,, واردھا اسکیم ،، میں آردو پر اس طرح کُھلے بندوں حملہ نہیں کیا گیا تھا ۔ وہ منصوبہ اُس وقت بنا جب کہ کانگریس کا وزارتوں پر قبضہ نہیں جما تھا ۔ اب جو صوبای حکومت ملنے کے بعد گاندھی جی کے صوبے میں آن کے خاص چیلوں نے یہ نئی تجویز چلای تو مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ آردو کو ہٹانے اور ,, ہندی ،، کو بڑھانے میں ضرور مہاتما درپردہ شریک ہیں ۔ بمبئی (نیز مدراس) کے صوبے میں جس طرح یہ نئی ہندی چلانے کی سازش کی گئی ، وہ بدگمانی کو قوی کرتی تھی ۔ کانگریسی وزارت کے پہلے ہی بجٹ (فروری ۳۸ء) میں ,, ہندی ،، کی اشاعت و ترقی کے لیے معتدبہ رقم رکھی گئی تھی ۔ کانگریسی مسلمان بھی اس بدعت پر متردد ہوے ۔ مولوی عبدالحق صاحب مارچ میں خود بمبئی جاکر وزیراعظم کھیر سے ملے اور وہی اعتراض کیا کہ نیشنل کانگریس کی اصطلاح ,, ہندستانی ،، کی بجاے یہ نئی ہندی کی اشاعت کیا معنی رکھتی ہے ۔ کھیر صاحب نے اعتراف کیا کہ بےشک وزیر خزانہ سے غلطی ہوگئی اور ہمارا مطلب ہندستانی ہی تھا ۔ اس غلطی کی ضرور اصلاح کردی جاے گی ۔ لیکن اگلے ہی مہینے ایک عام جلسے میں تقریر کی کہ ,, سب نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ (سارے ہندستان کی) مشترک زبان ہندی ہونی چاہیے ! ،، مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ

,, ایک کانگرس حکومت کے وزیر اعظم کی زبان سے ایسے الفاظ کا نکلنا نہایت حیرت انگیز ہے ۔ یہ سراسر غلط ہے کہ سب نے تسلیم کرلیا ہے کہ ہندستان کی مشترک زبان ہندی ہونی چاہیے خصوصاً جب کہ خود کانگرس کا قطعی فیصلہ موجود ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہے ۔ میں ایک مدت تک اِس اُلجھن میں رہا کہ کیا وجہ ہے کہ جب کانگرس نے اپنے رزولیوشن اور اپنے دستور میں صاف طور سے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہندستان کی زبان ہندستانی ہے تو پھر کانگرس حکومتوں کے وزرا اور ارکان کیوں بار بار بجاے ہندستانی کے ہندی کو ملک کی مشترک زبان قرار دیتے ہیں ۔ اور جتانے پر اور اپنی غلطی ماننے پر بھی کیوں اس خیال پر قائم ہیں اور جب موقع آتا ہے تو وہ اپنی تحریر اور تقریر میں ہندی ہی کا راگ الاپتے ہیں — بہت دنوں کے بعد یہ راز کھلا اور وہ یہ ہے :

کانگرس سے بھی بالا اور اعلیٰ ایک ہستی ہے جس کے ایک اشارے ، ایک

لفظ کے سامنے کانگرس کے تمام رزول یوشن ، اس کا دستور اور اس کے ضوابط اور قواعد سب ہیچ ہیں - گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ہندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اس لیے کانگرس کے وزیر اور ہر رکن وہی کہتا ہے ''جو مہاتماجی ،، کہتے ہیں - جو نیت امام کی وہی ان کی ! ،، (رسالہ اردو ، اپریل ۳۸ء صفحہ ۴۸۰) -

اس سال کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت سبھاس چندر بوس نے کی تھی - ہندی پرچار کے اثر یا شوق میں آپ اپنا خطبہ '' نئی ہندی ،، میں لکھ کر یا لکھوا کر لائے تھے - پڑھنے کھڑے ہوے تو پڑھا نہیں جاتا تھا - '' ایک شخص کرسی کے پیچھے بیٹھا ہوا لقمہ دیتا جاتا تھا ،، - مدراس میں فرقہ پرستی پر مصلحت اندیشی غالب رہی - کانگریسی وزیر اعظم راج گوپال چاری مسلمان ہم‌وطنوں کو دشمن نہیں سمجھتے تھے - گاندھی جی کی ترغیب سے '' ہندی ،، کو نصاب میں داخل کرنا پڑا - تاہم وہ اردو یا ہندوستانی سے بالکل الگ زبان نہیں بننے پائی - دوسری طرف ''ہندوستانی اکیڈمی،، کا سالانہ اجلاس الہ‌آباد میں منعقد ہوا (مارچ سنہ ۱۹۳۸ء) سرتیج بہادر سپرو نے یہاں ، پھر لکھنؤ کی تقریر میں اہل وطن کو متنبہ کیا کہ اردو ہندو مسلمان دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے اور اس نے ان قوموں کے تہذیب و تمدن کو باہم سمجھنے اور سمونے میں بڑی بھاری وطنی خدمت انجام دی ہے - محبان وطن، خصوصاً اہل لکھنؤ کا فرض ہے کہ وہ اردو کے زندہ سلامت رکھنے میں جان لڑا دیں - انہوں نے اپنی دل‌سوزی کی تقریر کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا کہ : '' ہندو مسلم اتحاد کا انحصار اردو کی بقا پر ہے ! ،،

تقریروں کا خلاصہ لکھنے کے بعد مولوی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ :

''میں نے سرتیج بہادر کا قول یہاں اس لئے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ ایک حقیقت شناس و صاحب نظر اور ایک مقلد و بےخبر کی رائے میں کس‌قدر فرق ہوتا ہے - کانگریسی حکومتوں کے اکثر وزیر جو ہندی ، ہندی ، پکارتے ہیں، وہ نہ ہندی جانتے ہیں نہ ہندوستانی - ان میں سے اکثر ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی زبان سے نا واقف ہیں اور محض ایک بڑے شخص کی تقلید میں اندھوں کی طرح کام کر رہے ہیں - گاندھی جی بلا شبہ بہت بڑے آدمی ہیں لیکن زبان کے معاملے میں

ان کی رائے مستند نہیں ہو سکتی ۔ وہ کیا جانیں کہ ہندوستانی تہذیب کا ہندوستانی زبان سے کیا تعلق ہے ؟ ہندوستانی زبان سے غفلت کرنا ، ہندوستانی تہذیب کا برباد کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کی جڑ کاٹنی ہے ۔اس مسئلے میں اگر کسی کی رائے مستند ہو سکتی ہے تو سرتیج بہادر سپرو ہیں،، (اردو۔اپریل ۱۹۳۸ء - ص نمبر ۴۷۷) مگر سیاسیات کی دنیا میں اکثر حق ، ناحق اور قابلیت سے بحث نہیں رہتی ۔ لوگ اثر و اقتدار کی پوجا کرتے ہیں ۔ سپرو صاحب معتدل گروہ کے سرخیل تھے اور وہ مدت سے عام قبولیت کھو چکا تھا ۔ ایک اور صوبے میں ہندی کی خواہی تخواہی ترویج پر مولوی صاحب محولہ بالا رسالے میں بگڑ کر لکھتے ہیں (ص۴۷۴) :

'' اڑیسے میں کانگریسی حکومت ہے جو کانگرس کے احکام کی اسی طرح تعمیل کر رہی ہے ۔ اب بھی اس میں کسی کو شبہے کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ کانگریسی حکومتیں ، کانگرس کے احکام کو گاندھی جی کے ارشاد کے سامنے بالکل بےحقیقت سمجھتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہندوستانی کا رزولیشن جو کانگریس نے منظور کیا وہ حضرت ہی کا لکھا ہوا ہے ۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے کانگرس والے تو ان کا منشا اور نیت کو دیکھتے ہیں ۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا نام بدل کر '' گاندھی کانگرس ،، رکھ دیا جائے؟ کہیں تو قول و فعل میں مطابقت ہو ! ،،

شمالی ہند کے دورے اور متفرق شاخیں قائم کرنے کے علاوہ ، شروع سال ۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب نے کراچی میں ایک صوبائی آردو کانفرنس کی صدارت کی اور ترویج آردو کا قدم تیز کر دیا ۔ لیکن '' سندھ مرکز ،، کے قیام اور کام کی سرگزشت ہم اگلے باب کی جداگانہ فصل میں پیش کریں گے ۔

—:o:—

باب چہارم

انجمن کا ورود دهلی میں (۱۹۳۸ع)

سنه ۱۹۳۸ع میں کانگرس نے پہلی مرتبه حکم رانی کا مزا پایا - هندو اکثریت کے چھ صوبوں میں اس کی وزارتیں قائم هوئیں - سرحد کا اسلامی صوبه پوری طرح مٹھی میں، نیز سندھ اور اسام زیر اثر آ گئے تھے - لیکن قومی آزادی کے زینے چڑھنے کے ساتھ، فرقه‌واری تعصبات بڑھتے جاتے تھے - هماری کتاب کو صرف زبان اردو کے مسئلے سے سروکار ہے - پچھلے باب کے مطالعے سے اندازہ هوا هوگا که کس طرح کانگریس کے سب سے بڑے رہنما محض اس بنا پر که وہ مسلمانوں کے عہد میں وجود میں آئی اسے مٹانے کے درپے هوگئے - یه مسلمان هندوستان هی کے باشندے تھے اور یه زبان هندوستان هی میں پیدا هوئی اور پروان چڑھی تھی اور اس سے بھی کسی کو انکار نه هو سکتا تھا که زیر نظر زمانے میں اهل هند کی سب سے بڑی تعداد بلا لحاظ مذهب و ملت اسے بولتی، لکھتی پڑھتی اور سمجھتی تھی - فقط مسلمانوں کے تعلق کی وجه سے اردو کی دشمنی کے معنے یه تھے که کانگریس والے انہیں هندوستان کی "ایک واحد قوم سے خارج کرنا چاهتے هیں - حالانکه کانگریس کا بنیادی عقیدہ یه تھا که سندھ و سرحد سے آسام بلکه (بلکه برما) تک اور کشمیر سے راس کماری تک سارے بر عظیم کے باشندے ایک هی قوم هیں اور ان کے باهمی نسلی، مذهبی، تمدنی اختلافات کے باوجود کانگریس ان سب کو وطنی اخوت و مساوات کے ایک ڈورے میں پرو لینا چاهتی ہے - ماننا پڑتا ہے که آخر زمانے میں گاندھی جی کم سے کم زبان کے معاملے میں اور اکثر کانگریسی وزرا اور اکابر دوسرے مذهبی اور ملکی مسائل میں مذکورۂ بالا عقیدے سے عملاً منحرف هو گئے -

مولوی عبدالحق صاحب کے پے درپے احتجاج اور خصوصیت سے گاندھی جی کے

صوبے میں مسلمانوں کی شورش سے ، نہ صرف کانگریس کے باہر بلکہ اندر بھی لوگوں کو فکر ہوی کہ ہندو اکثریت کے اس بےجا تعصب کی روک تھام کی جائے جو صریحاً قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا مادہ رکھتا تھا - ۲٦ ستمبر کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ڈاکٹر محمد اشرف نے زبان کے مسئلے پر باقاعدہ یہ تحریک پیش کی :

''چونکہ سارے ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے اور چونکہ ہندی اردو کی بحث نے ایک فرقہ‌وارانہ صورت اختیار کر لی ، اس لئے یہ کمیٹی اس بات کو دھراتی ہے کہ کانگریس ہندوستانی زبان کو جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم‌الخط میں لکھی جاتی ہے ہندوستان کی قومی زبان مانتی ہے اور تمام کانگریس والوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کو مقبول بنانے کی کوشش کریں اور ہندی اردو کی بحث سے الگ رہیں - یہ کمیٹی ایک ہندوستانی بورڈ مقرر کرتی ہے جو ہندوستانی زبان کی ترقی کے واسطے ایک جامع تجویز کانگریس کے سالانہ اجلاس سے پہلے مرتب اور پیش کرے،، -

محرک نے اپنی تقریر میں مشترکہ زبان کی اہمیت جتائی اور کہا کہ ہندوستانی سیکڑوں برس کے میل ملاپ سے پیدا ہوئی ہے - اب اردو کے مقابلے میں ہندی کا لفظ اختیار کرنا بلا وجہ ایک خطرناک تفرقہ پیدا کرنا ہوگا - انہوں نے تقریر کو ان الفاظ پر ختم کیا - '' سن لیجئے ہماری زبان نہ ہندی ہے اور نہ '' ہندی ہندوستانی،، میرے خیال میں ایسی باتیں کرنا ایک طرح کی رجعت پسندی ہے - آپ کو میرے الفاظ ناگوار ہوے ہوں گے - لیکن میرے سامنے وہ تجربات ہیں جو مجھے مسلمانوں میں کام کرنے میں ہوے ہیں - یہ معاملہ اگرچہ تمدنی قسم کا ہے لیکن جو لوگ سیاسی میدان میں کام کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کی شکل سیاسی ہو چکی ہے - لوگ ہندوستانی کی جگہ ہندی لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس سے درحقیقت غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں اور اس لئے میں آپ سے کہوں گا کہ آپ اپنی سرگرمیوں میں اردو کا بھی خیال رکھیں،، (اردو سنہ ۳۸ - ص ۱۲۰ - کانگریسی اخبار ہندوستان کے حوالے سے) -

ڈاکٹر اشرف نسلاً راجپوت اور اعتقاداً اشتراکی - یعنی مذہب کی اساس پر کسی مسلم تہذیب یا قومیت کو نہیں مانتے تھے - کافی مدت سے کانگریس کی تبلیغ و

اشاعت کا کام ان کے سپرد تھا اور کانگریس کی ''رابطہ' مسلم عوام '' کی تحریک چلا رہے تھے - ان کی یہ قرارداد خالص وطنی اور سیاسی مصالح کی بنا پر پیش کی گئی تھی - مگر کانگریس کمیٹی نے کثرت آرا سے بے تکلف اسے مسترد کر دیا - مولوی عبدالحق تحریر کرتے ہیں :

لطف یہ ہے کہ اس تجویز سے اختلاف کیا تو کس نے ؟ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ و زاد حریتہ نے ! حالانکہ مولانا نے (چند ہی مہینے قبل) میری درخواست پر کانگریس حکومتوں کے نام سرکلر جاری کیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہ ہندوستانی کا لفظ استعمال کریں ! ''

پھر اسی رسالے میں ایک دوسرے عنوان کے نیچے (ص ۱۲۵) مولوی صاحب لکھتے ہیں :

'' ایک طرف تو کانگریس ورکنگ کمیٹی ، مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی زبان کے معاملے میں انڈین نیشنل کانگریس کی قرار داد اور عقیدے کو پیش کر کے اطمینان دلا رہے ہیں کہ کانگریس اور ملک کی زبان ہندوستانی ہے اور دوسری طرف اسی کانگریس کے وزیر اور دوسرے ارکان نئی ہندی اور دیوناگری رسم خط کی اشاعت پر زور دے رہے ہیں - یو پی کے وزیر تعلیم کی تقریر جو سرکاری محکمے کی طرف سے شائع کی گئی ہے اور اکثر اخباروں میں نقل ہو چکی ہے ایسی زبان میں ہے جو اس ملک کے کسی علاقے کی زبان نہیں ہو سکتی - عام لوگ تو اسے کیا سمجھ سکتے ہیں اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں - وہ یا تو جنات کی زبان ہوسکتی ہے یا راکشسوں کی ! . . . وہ (وزیر موصوف) فرماتے ہیں کہ اگر ہم ، چاہتے ہیں کہ ہندی جسے ہندوستانی بھی کہتے ہیں (!) آسانی سے جنوبی ہند کے باشندوں کی سمجھ میں آسکے تو لازم ہے ہندی میں سنسکرت الفاظ کی کافی تعداد داخل کر دی جائے '' - وزیر (سمپورنا نند) کی اس رائے سے مہاتما جی نے بھی پوری طرح اتفاق ظاہر کیا - (۱)

---

(۱) اسی زمانے میں یو پی کی کانگریسی حکومت نے مسلمانوں کو تسکین دینے کے لیے ایک رسالہ چھاپا تھا - اس میں زبان کے متعلق بھی بڑی ڈھٹائی سے بیان کیا کہ ہم اردو کے مخالف نہیں بلکہ کبھی کبھی اسے ہندی پر ترجیح دیتے ہیں ! (اخبار ہماری زبان ، ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء)

جنوبی ہند والوں کی سنسکرت پسندی ایک اور ڈھکوسلا تھا جسے گاندھی جی اور ان کے رفیق کمال دیدہ دلیری سے مشتہر کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ جنوبی ہند والے تو اس سنسکرت کے رائج کرنے سے ناراض ہیں۔ انکا خیال یہ ہے کہ ہندی کا صرف بہانہ ہے۔ در اصل وہ (کانگریس والے) اس آڑ میں سنسکرت کو رواج دینا چاہتے ہیں اور ہماری زبان اور تہذیب کو مٹانے کے درپے ہیں۔

''دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مدراس کی حکومت نے اپنے مدرسوں کے لئے جو ریڈریں لکھوائی ہیں وہ خالص ہندوستانی زبان میں ہیں اور ان میں کہیں سنسکرت کے بوجھل اور نا مانوس لفظ نہیں پائے جاتے جس کی تائید گاندھی جی اور ان کے رفیق کرتے ہیں۔ دکھشنی ناگری پر چار سبھا نے اپنے ٹریننگ اسکولوں کے لئے بھی انجمن ہی کی ریڈریں جاری کی ہیں اور اپنے دوسرے اسکولوں میں بھی انہی کو مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ صرف رسم خط بدل دیے گئے، زبان وہی رہے گی۔ — ان تمام باتوں سے گاندھی جی اور ان کے حامیوں کی تردید ہوتی ہے،،۔ (اردو - ۳۸ء - ص ۱۱۲۶)

خلاصہ یہ کہ سنہ ۱۹۳۸ء میں کانگریسی وزارتوں کے اقتدار کے ساتھ گاندھی جی کی اردو سے مخالفت بھی زور پکڑ گئی تھی۔ مدافعت کے لئے پورا وقت اور قوت صرف کرنی لازم ہوئی۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب نے جامعہ عثمانیہ کی پروفسری سے استعفا دیا اور صرف سابقہ پنشن پر قناعت کر کے حیدرآباد سے رخصت ہوئے (نومبر سنہ ۱۹۳۸ء) علی گڑھ کی اردو کانفرنس نے طے کر دیا تھا کے دھلی کو انجمن کا مرکز بنایا جائے۔ اورنگ‌آباد سے پورا دفتر، مطبوعات اور کتب خانے کے ذخیرے صندوقوں میں بھر بھر کر دھلی بھیجے گئے۔ اسی طرح اردو لغت کا دفتر اور مولوی صاحب کی کتابیں اور ساز و سامان حیدرآباد سے ریل کی ویگنوں میں لادا گیا۔ ریاست حیدرآباد نے کمال قدردانی اور علم پروری سے چھ سال کے لئے انجمن کو چالیس ہزار سکہ عثمانیہ (= تقریباً ۳۴ ہزار روپیہ انگریزی) کی سالانہ امداد عطا کی کہ وہ ہر سال بیس نئی کتابیں شائع کرے اور اپنے حسابات کی باقاعدہ تنقیح کراتی رہے۔ ہر چند جناب مولوی صاحب ایک بڑے علمی اور قومی مقصد کے لئے جا رہے تھے۔ لیکن ساری عمر دکن میں گزاری تھی۔ صدھا شاگرد، احباب، مداح، مستفید حضرات حیدرآباد میں تھے، انہیں مولوی صاحب کے جانے کا رنج ہوا۔ راقم‌الحروف نے ایک وداعی دعوت میں یہ قطعہ پڑھ کر گویا ان جذبات کو تسکین دینی چاہی تھی:

قطعہ

نہ رک سکے گا سفر سخت ہو کہ منزل خوب
وہ شہسوار جسے ترک تاز ہے مرغوب
مزاج برق پہ ہے سستیٔ خرام حرام
سکون موج کے حق میں ہے بدترین ذنوب
وداع دوست کا اندوہ کیا ندیم قدیم
نہیں حبیب سے یاد حبیب کم محبوب
تری خرد ہی نہیں ہے بلند بیں ورنہ
نگہہ سے چھپ کے بھی سورج کبھی ہوا نہ غروب

نہ کہہ دکن سے کہاں جارہے ہیں عبدالحق
وہ ہے مقام شرف واں شمال ہے نہ جنوب !

شروع میں نئی دھلی کی ایک کوٹھی ('' القریش ،،) انجمن کے واسطے کرائے پر لی گئی تھی ۔ مگر چند ماہ کے بعد احباب کے اصرار سے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی (نمبر۱ دریا گنج) کو کرایہ پر لیا ۔ آگے چل کر اُن مرحوم کے وارثوں نے اسے ایک سیٹھ صاحب کے ھاتھ فروخت کردیا ۔ انجمن سیٹھ صاحب کی کرایہ دار ہوگئی ۔ دفتر ، کتب خانہ ، جناب مولوی صاحب ، پنڈت کیفی صاحب اور عملے کے بہت سے افراد سنہ ۴۷ع (= آزادیٔ ہند کے فسادات) تک اسی احاطے میں مقیم رہے ۔

اردو کانفرنس ، دھلی

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ، انجمن کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا (۱۹۱۳) تو اس کا کل اثاثہ ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا ۔ مگر اب جو وہ اورنگ آباد سے دھلی آی (۳۸ع) تو اپنی چھاپی ہوئی کتابوں کے بیسیوں صندوق بھرکر لائی جن کی مالیت کم و بیش ایک لاکھ روپیہ ہوگی ۔ یہ اُس کی پچیس برس کی کمائی تھی ۔ لیکن ان مطبوعات سے بھی زیادہ بیش بہا جناب مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں انگریزی ، اردو ، فارسی اور عربی کی ہزاروں اعلیٰ درجے کی علمی کتابیں شامل تھیں ۔ صدھا قلمی نسخے تھے ، بعض اتنے قدیم اور نادرالوجود کہ اُن کی نظیر نہ تھی ان سب ذخیروں کو احتیاط سے بندھوا کر لدوانے ، ریلوں ، ٹھیلوں میں دکھن سے اُتر تک لانے میں کئی مہینے لگ گئے ۔ سارا سامان ایک مکان سے دوسرے مکان میں لے جاکر جانا خاصی دردسری اور انجمن کے مختصر عملے کے لیے بڑی محنت کا کام تھا ۔ پھر جناب مولوی صاحب کی بے چین طبیعت برابر نئے نئے ادبی اور تبلیغی میدانوں

میں دوڑتی تھی۔ کتابیں رسالے لکھنا لکھوانا ہی کچھ کم محنت و توجہ کا طالب نہ تھا کہ مولوی صاحب نے ان پر نئی نئی شاخیں اور مدرسے قائم کرنے کا اضافہ کیا۔ ان کی کارگزاری کی کیفیتیں موصول ہوتیں، الحاق کی منظوری، مراسلت، انجمن کی طرف سے بعض مدرسوں کو رقمی امداد، کتابوں کی ترسیل، خرید و فروخت، کئی کئی کتابوں کی وقت واحد میں کتابت، طباعت، تصحیح — غرض ایک پورے محکمے کا کام پھیلا ہوا تھا جو بیچارے مولوی رشید احمد ایم۔ اے کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ وہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ نیل گری کے دور دراز مقام پر مدرس ہو گئے تھے۔ جناب مولوی صاحب نے آن پہاڑی علاقوں میں دورہ کیا تو کئی جگہ ہمراہ پھرے اور دلی شوق سے دفتر انجمن میں لیے جانے کی درخواست کی۔ دھلی میں انجمن کے پہلے منیجر، محاسب، مصحح، غرض کئی مہینے تک بہت سے کام اکیلے انجام دیتے رہے۔ خود مولوی صاحب کی ذاتی خط و کتابت کسی سرکاری دفتر کی ڈاک سے کم نہ تھی۔ مصروفیت کے اس ہجوم میں دورے، گشت، جلسے، ملاقاتیں مہمان داریاں۔ دھلی آتے ہی حیدرآباد سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ ادھر دریا گنج ۱ میں پوری طرح سامان جمنے بھی نہ پایا تھا کہ مولوی صاحب نے اپریل ۳۹ع سے انجمن کا ایک نیا اخبار "ہماری زبان" جاری کردیا۔ یہ فل اسکیپ تقطیع کے ۱۶ صفحات پر بہت صاف ستھرا، مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ ملکی اور سیاسی مسائل سے اسے بحث نہ تھی البتہ زبان اردو کے متعلق ہر قسم کی خبریں اور مباحث درج کیے جاتے تھے۔ کوئی چار سال سے یہ موضوع رسالہ' اردو میں "افکار و واقعات" کا مستقل عنوان رہا تھا۔ مگر وہ خالص ادبی اور پھر سہ ماہی رسالہ تھا۔ زبان کے بارے میں اب جو روز افزوں جھگڑے پڑے تو اور بھی ضروری ہوگیا کہ انجمن کے نئے مرکز کا ایک اخبار ترجمان ہو۔ اس کی قیمت بہت کم یعنی ایک روپیہ سالانہ اور ایک آنہ فی پرچہ رکھی گئی تھی کہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے۔

ہماری زبان اور اردو کے علاوہ اسی سال انجمن کی کئی نئی مطبوعات دھلی سے (لطیفی پریس میں چھپ کر) شائع ہوئیں۔ ان میں "معلومات سائنس" اور "فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں" (جلد اول) قابل ذکر ہیں۔ لیکن ورود دھلی کی رسم دھوم دھام سے اردو کانفرنس کے انعقاد سے منائی گئی۔ یہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے پہلا عام اور "کل ھند" اجتماع تھا۔ اس کے عام اجلاس، علمی نمائش اورمشاعرے کی تاریخیں ۲۹ و ۳۰ دسمبر رکھی تھیں لیکن مہمانوں کی آمد، خاص مجلسیں،

نمائش کی تیاری میں پورا ہفتہ صرف ہوا۔ انتظامات بہت پہلے سے کیے جارہے تھے اجلاس عام، مشاعرہ اور نمائش کے لیے مقامی حکام نے مجلس بلدیہ کا وسیع ایوان مستعار دیا تھا، جو وسط شہر میں واقع اور پرانی دہلی کا سب سے بڑا ہال تھا۔

مجلس استقبالیہ میں اسّی ارکان شامل ہوے۔ اس سے کچھ زیادہ تعداد میں نئی اور پرانی دہلی کے معززین بطورخاص مدعو کئے گئے تھے۔ باہر سے آنے والے مندوب اور شاخوں کے نمائندے جو انجمن کی دعوت پر تشریف لاے کم و بیش دو سو تھے۔ عام حاضرین اجلاس کا شمار ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ بیرونی مہمان کشمیر سے مدراس، کلکتے سے بمبئی، سندھ و سرحد تک سے آئے تھے۔ زیادہ تعداد حیدرآباد، علی گڑھ، لکھنو، لاہور کے جامعی اساتذہ اور اہل علم کی تھی۔ مہمانوں کے قیام کا انتظام عربی کالج کے اقامت خانوں میں کیا تھا۔ ایک معقول تعداد خود جناب مولوی صاحب کی مہمان تھی۔

عام اجلاس

کانفرنس کا صدر نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیم ریاست حیدرآباد کو چُنا گیاتھا وہ ۲۶ دسمبر کو دہلی پہنچے۔ اسٹیشن پر انجمن ترقی آردو اور دوسرے حضرات نے جن کا ریاست حیدرآباد سے تعلق ہے، پرتپاک استقبال کیا۔ قصر نظام نئی دہلی میں مقیم ہوے۔ پہلا عام اجلاس مقررہ وقت پر دس بجے ۲۹ دسمبر کے دن تلاوت قرآن مجید سے شروع ہوا۔ اگرچہ داخلہ بذریعہ ٹکٹ رکھا تھا، لیکن سارا ٹاؤن ہال وقت سے پہلے بھر گیا اور بعد کے آنے والوں کو مشکل سے جگہ مل سکی۔ جناب کیفی نے نظم سے اور شمس العلما مولوی عبدالرحمن صاحب نے اپنے استقبالی خطبے سے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جناب صدر نے اپنے پُرمغز خطبۂ صدارت میں زبان آردو کی ہمہ گیری، ہمہ رنگی جتائی اور فرمایا کہ اسے ہندستان کے کسی خاص حصے یا خاص فرقے تک محدود قرار دینا، تاریخ اور بداہت کے خلاف ہے:

> "خاص کر ایسے ملک میں جہاں عام زبان کی سخت ضرورت ہے اور جہاں کی عام زبان (آردو) طبعی اسباب سے ترقی کر رہی ہے، اس کے راستے میں روڑے اٹکانا اسے سوائے تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ علیٰ ھذا ملک کی عام زبان کو مقامی زبانوں کا حریف سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جو بجاے خود

ایک برّ اعظم ہے اور جس میں یورپ کے بہت سے ملک سما سکتے ہیں عام ملکی زبان کے پہلو بہ پہلو مقامی زبان کا اپنے اپنے دائرے میں رواج بخوبی ممکن ہے،،۔

نواب صاحب نے آردو زبان کی خدمت کرنے والے اداروں کا ذکر کیا اور ان میں انجمن ترقی آردو اور اس کے سکریٹری کی خاص طور پر تعریف کی کہ گذشتہ پچیس برس میں انہوں نے مختلف علوم و فنون کی بلند پایہ کتابیں شایع کیں - ,, یوں تو ابتدا میں انجمن کے معتمد بڑے بڑے ادیب رہے لیکن جب ، بقول مولوی صاحب ع

قرعہ فال بنام منِ دیوانہ زدند

مولوی عبدالحق صاحب کی باری آی تو مولوی صاحب کے پاس اپنی ہمت ، استقامت ، دھن اور لگن کے سوا انجمن کا کوی سرمایہ نہ تھا جو سرمایہ کہلایا جا سکتا - مگر مولوی صاحب کا عشق دیکھیے کہ دنیوی بکھیڑوں سے جدا رہے اور , فنا فی الاردو ، اور , بقا بالاردو، کا مقام حاصل کیا - پھر مولوی صاحب کی کرامت میں کیا شک ہو سکتا ہے : بڑے بڑے فتوحات ہوے اور برابر فتوحات کا سلسلہ جاری ہے - ہمت مرداں ، مدد خدا - دل کا مطالبہ خالی نہیں جاتا ع

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد

اےخواجہ درد نیست وگرنہ علاج ہست ! ،،

نواب صاحب نے جامعہ عثمانیہ کی درخشاں کامیابی کی نسبت فرمایا کہ اس کے ,, قیام کو بیس ہی برس گزرے ہیں کہ بفضلہ ہندستان میں بلکہ یورپ میں اس کا سکہ چل نکلا - اس کے طالب علموں نے ہندستان کی جامعات میں اور یورپ کی جامعات میں شریک ہو کر مادر جامعہ کا نام بلند کیا - درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے - جب طالب علموں کا یہ رنگ نظر آیا تو پھر جامعہ عثمانیہ کی بلند معیاری سے کون انکار کر سکتا ہے چناں‌چہ نہ صرف ہندستان کی اکثر جامعات نے بلکہ یورپ اور انگلستان کی بڑی بڑی سربرآوردہ جامعات نے مثلاً اوکس‌فورڈ ، کیم‌برج اور لندن وغیرہ نے جامعہ عثمانیہ کی علمی اسناد کو تسلیم کیا - سب سے دشوار مرحلہ طبی اسناد کا تھا - لیکن ,, رایل کالج اوف سرجنس ،، کا جو وفد لندن سے ہندستان آیا اس نے خود آکر جامعہ عثمانیہ میں طبی تعلیم کا معیار جانچا ، فن طب کی آردو کتابیں معاینہ کیں اور ہر اعتبار سے قابل اطمینان پایا تو لندن جاکر مجلس مقتدر میں کیفیت

پیش کی جس کی بنا پر جامعہ عثمانیہ کی طبی اسناد بھی تسلیم ہو گئیں ،، ۔

نواب صاحب نے ایک اور اہم بات فرمای کہ جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ طلبہ نے جس قدر کتابیں اپنے شوق سے تالیف اور ترجمہ کی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

,,مادری زبان میں تعلیم دی جاے تو کیسا علمی ذوق ترقی کرتا ہے ۔ حالاں کہ سو برس تک انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہوتی رہی تو ہندستانی طالب علموں کی بےذوقی اور بدشوقی کی شکایت بڑھتی رہی کہ محض معاش کی خاطر ڈگریاں حاصل کی جاتی ہیں ، علم سے کوی لگاو نہیں ۔ تصنیف و تالیف کا کوی حوصلہ نہیں ۔ اور جو کچھ ہے وہ اس قدر کم کہ نہ ہونے کے برابر ! ،،

آخر میں نواب صاحب نے اردو رسم الخط کی بحث اور ٹائپ کے متعلق اپنے پُر وزن خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ

میں تفصیلات میں جانا ضروری نہیں سمجھتا ۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اردو رسم الخط میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کی قدر نہیں ہو رہی ہے اور جو دشواریاں بیان کی جاتی ہیں وہ مبالغے سے خالی نہیں ہیں ۔ یہ درست ہے کہ رسم الخط میں اصلاح کی ضرورت اور گنجایش ہے لیکن رسم الخط کے ترک و تبدل کا کا کوی سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ ترقی کے دھوکے میں تنزل کی ابتدا ہے اور اولوالعزمی کے نام سے کم ہمتی کی تاویل ہے ! ہر زبان کے ساتھ اُس کے رسم الخط کو ایک فطرتی تعلق ہے ، وہ تعلق منقطع ہوجائے تو زبان اپنی فطری حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ ۔ ۔ ۔ ،،

فاضل صدر نے ٹائپ کی ضرورت کو تسلیم کیا اور فرمایا ۔ کہ چوں کہ نستعلیق کا خوب‌صورت ٹائپ نہیں بن سکا ، ہمیں نسخ اختیار کر لینا چاہیے جس کی ,,لائنو،، اور ,, مونوٹائپ ،، کی مشینیں بھی تیار ہوگئی ہیں ۔

اسی اجلاس میں کئی مشاہیر کے جو شریک کانفرنس نہ ہوسکے تھے ، پیام سنائے گئے ۔ ان میں سب سے دل‌چسپ مہاتما گاندھی کا خط تھا جو انھوں نے اردو رسم‌الخط میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر مولوی عبدالحق صاحب کو بھیجا تھا ۔ خط کی عکسی تصویر کانفرنس کی مطبوعہ روداد اور اخبار ,, ہماری زبان ،، میں چھپ چکی

ہے - مضمون کی بجنسہ نقل یہ ہے :

بھای صاحب

آپ کا تار ملا تھا - مجھے دکھ ہے کی آپ کے جلسہ میں حاضر نہیں ہوسکتا ہوں - میری امید ہے کہ جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا - آپ جانتے ہیں کی میں اردو زبان کی ترقی چاہتا ہوں ، میرا خیال ہے کی سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو لکھیں اور مسلم ہندی سیکھیں -

سیگاوں واردھا ۲۶ دسمبر ۳۹ء

اصل خط علمی نمایش میں بھی رکھ دیا گیا تھا کہ جنہیں مہاتما جی کی اردو نویسی دیکھنے کا شوق ہو ، اسے معاینہ کریں - سامعین خط سن کر بہت محظوظ ہوئے جناب صدر نے اپنی اختتامی تقریر میں بھی اسے یاد رکھنے کے قابل بتایا اور یہ مزہ‌دار فقرہ کہا کہ ,,اس (خط) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ زبان جو گاندھی جی نے لکھی ہے فقط مسلم لیگ کی زبان نہیں ہوگی !،،

علمی نمایش - ذیلی مجالس

اجلاس عام کے آخر میں آنریری سکریٹری انجمن نے سالانہ کیفیت پڑھ کر سنای - اس کے ضروری اقتباسات اگلی فصل میں آئیں گے - پہلے کانفرنس کے دوسرے مشاغل کا مجمل تذکرہ کرنا مناسب ہے - ان میں سب سے امتیازی چیز علمی نمایش تھی جس میں نادر مخطوطات ، اردو کی قدیم ترین قلمی کتابیں ، خطاطی کے بہترین نمونے ، پرانے سکے اور مرقّع کثرت سے فراہم کئے گئے تھے - خود مولوی عبدالحق صاحب کے ذاتی کتب خانے میں ,, دکنیات ،، کا بیش بہا ذخیرہ تھا - محکمہ آثار قدیمہ ، حیدر آباد نے خوش نویسی کے بےمثل مخطوط بھیجے - مسلم یونی‌ورسٹی ، علی گڑھ اور نواب صدر یار جنگ شروانی کے کتب خانے سے کئی یادگار چیزیں آئیں - محمد امین صاحب زبیری نے بھوپال سے ، عبدالرحمن صاحب صدیقی نے کلکتے سے مولوی منور الدین صاحب نے دہلی سے مکتوبات قطعات وغیرہ مستعار دئے - مگر نمایش کی شان اور کام‌یابی کا سہرا بڑی حد تک پروفیسر محمود شیرانی اور پروفیسر اقبال مرحوم کے سر باندھا گیا کہ لاہور سے ایک لاری بھر کر اپنے اور سرکاری کتب خانوں کے نوادر خود لائے - بارہ گھنٹے اسی لاری

میں سفر طے کیا ۔ دو تین روز تک سارا سامان جمانے میں مصروف رہے ۔ (ڈاکٹر) عبداللہ چغتای صاحب برابر ان کے ساتھ کام کرتے رہے ۔ اسی طرح سراج الدین صاحب آذر نے جو آن دنوں دھلی کے محکمہ تعلیم کے عہدہ دار تھے ، کان‌فرنس اور نمایش کے انتظامات میں بڑی مدد دی اور اپنے ذخیرے سے بعض نایاب اشیا نمایش میں لاکر رکھیں ۔ غرض مجموعی طور پر کان‌فرنس میں یہ ایسا عمدہ عارضی عجائب خانہ تیار ہوگیا کہ شاید پہلے کبھیں دیکھنے مین نہ آیا تھا ۔ نمایش کا رسمی افتتاح ۲۹ دسمبر کی سہ‌پہر کو چیف کمشنر صاحب دھلی (مسٹر جین کنس) نے کیا اور وہ چار دن تک صدھا اھل ذوق کی سیرگاہ بنی رہی ۔

ذیلی مجلسوں میں ایک تو انجمن کی شاخوں کا نمائندہ جلسہ تھا (۲۸ دسمبر) جس کی صدارت میاں بشیر احمد صاحب مدیر ھمایوں نے کی اور ھندستان کے تقریباً سبھی صوبوں اور بڑی ریاستوں کے مندوب اس میں شریک ہوے۔ اپنے اپنے علاقے میں آردو کے حالات اور ضروریات سے ایک دوسرے کو آگہ کیا ۔ صوبای مرکزوں کی بہتر تنظیم و کارگزاری کے متعلق مختلف تجاویز پر تبادلہ خیال ھوا اور بعض تجویزیں کان‌فرنس کے دوسرے اجلاس کے لیے مرتب کی گئیں ۔ اسی جلسے کے وقت دفتر انجمن کے دوسرے کمرے میں سائنس کی ذیلی مجلس منعقد ھوی جس میں حیدر آباد ، لاھور ، دھلی ، علی گڑھ کے ۱۴ جامعی استاد شریک تھے ۔ ڈاکٹر سر ضیاءالدین صاحب نے صدارت کی ۔ حیدر آباد کی ذیلی کمیٹیوں نے سائنس ، فلسفہ ، عمرانیات پر تقریباً بیس نئی کتابیں لکھوانے کی تجاویز مرتب کی تھیں ، ان کی کیفیت سنی اور پسند کی گئی ۔ نباتات و حیوانیات پر چند اور کتابوں کے خاکے اور مولفوں کے نام تجویز کئے گئے ۔ یہ بھی قرار پایا کہ انجمن کے رسالہ سائنس کو سہ‌ماھی کی بجاے ماھانہ کر دیا جاے ۔

,, تعلیم بالغاں ،، کے سلسلے میں علی گڑھ یونی‌ورسٹی کا ایک دل‌چسپ تجربہ اور اس کے عملی نمونے پیش کئے گئے ۔ وھاں ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب نے شاگرد پیشہ لوگوں کے لیے چار مکتب قایم کئے تھے جن میں صرف ایک گھنٹے تعلیم مفت دی جاتی تھی ۔ کتابیں ، تختیاں وغیرہ بھی انجمن ترقی آردو کی مدد سے خود پڑھانے والے مہیا کرتے تھے ۔ پانچ مہینے میں ستر ملازمین کو آردو لکھنا پڑھنا سکھایا اور عملاً ثابت کر دکھایا کہ اس زبان

کی تعلیم دوسری زبانوں کے مقابلے میں سہل ہے - ڈاکٹر عابد اپنے چند خدمت گار شاگردوں کو همراہ لائے تھے انہوں نے جلسے میں کتابیں پڑھ کر سنائیں اور اپنی لکھی ہوی تختیاں دکھائیں - یہ جلسہ شام کے وقت کان‌فرنس کے هال میں ہوا تھا ''تعلیم بالغان،، کی روداد کے بعد کئی مقالات پڑھے گئے - باوجودے کہ یہ خالص علمی مجلس تھی مگر هال سامعین سے بھرا ہوا تھا - پروفیسر آنند ناتھ ورما کا مقالہ ,,اردو زبان کی فوقیت،، پر خاص دل‌چسپی سے سنا گیا -

۳۰ دسمبر کو دن کے دس بجے سے ایک بجے تک کان‌فرنس کا دوسرا اور آخری اجلاس منعقد ہوا - اس میں ۹ تجاویز منظور کی گئیں اکثر اردو زبان کو مختلف صوبوں اور علاقوں میں (خصوصاً وہاں کی جامعات میں) وهی حیثیت دلوانے پر زور دیتی تھیں جس کی وہ مستحق تھی اور بےپروای یا تعصب کے باعث محروم رکھی گئی تھی - ایک تحریک (نمبر ۷) یہ تھی کہ

''هماری زبان کی سب سے بڑی اور سب سے سرگرم خدمت گزار جماعت انجمن ترقی اردو (هند) کے لیے دهلی میں ایک عمارت تعمیر کی جائے جو اس کی دفتری اور کاروباری ضرورتوں کے لیے کافی هو اور اس کی شان کے شایاں هو - اس ضرورت کے لیے ایک سرمایہ جمع کرنے کی تدبیریں بلاتاخیر عمل میں لائی جائیں،، -

اسے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے پیش کیا تھا اور بالاتفاق منظور ہوی مگر سامعین میں سے ایک صاحب نے جناب صدر کی اجازت سے فرمایا کہ بہتر ہوتا اس نیک کام کی خود محرک صاحب اسی وقت ابتدا کر دیتے — شاید وہ ناواقف تھے کہ مولوی عبدالحق صاحب یہ کام خاموشی سے شروع کر چکے تھے اور اس کے بعد هی انہوں نے تجویز پیش کرنا جائز رکھا تھا - چنان‌چہ مولوی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ '' گو میں ابھی اس مقصد کے لیے بھیک کا ٹھیکرا لے کر نہیں نکلا ہوں تاهم جب احباب سے اس کا ذکر آیا تو انہوں نے کچھ رقوم عنایت کردیں - اور محرک (ڈاکٹر صدیقی) صاحب نے بھی تجویز پیش کرنے سے قبل اس غرض کے لیے پانچ سو روپے کا چیک مرحمت فرما دیا ہے،، -

پھر مولوی صاحب نے اپنے عطئے (ایک ہزار) اور دوسرے عطیات کی فہرست سنای - ان کی مجموعی رقم سات ہزار سے زیادہ جُڑتی تھی - اس طرح انجمن کے

'' سرمایۂ عمارت ،، کی تحریک کا عملاً آغاز ہوگیا ۔ سہ پہر کو آنریری سکریٹری نے بیرونی مہمانوں اور معززین شہر کو چائے کی پُرتکلف دعوت دی ۔ اسی رات کانفرنس کے ہال میں بڑے زور کا مشاعرہ ہوا ، جس میں تقریباً ساٹھ شعرا نے اپنا کلام سنایا ۔ مشہور مقامی اور بیرونی حضرات کے نام یہ ہیں :—

(۱) جناب عبدالباری ، آسی ، لکھنوی (۲) جناب احسن مارہروی
(۳) جناب گرسرن لال ادیب ، لکھنوی (۴) اطہر ھاپوڑی
(۵) جناب گوپی ناتھ امن ، لکھنوی (۶) جناب جوش ملسیانی
(۷) حضرت جگر مرادآبادی (۸) جناب احسان دانش
(۹) جناب محمد حسین ، حاذق کولاری (میسور) (۱۰) جناب خلیل کولاری (میسور)
(۱۱) جناب روش صدیقی (۱۲) پنڈت امر ناتھ ساحر ، دھلوی
(۱۳) نواب سراج الدین سائل دھلوی (۱۴) جناب سیماب ، اکبر آبادی
(۱۵) منشی چندر بہاری لال ، صبا جےپوری
(۱۶) پنڈت برج موھن دتاتریہ ، کیفی ، دھلوی
(۱۷) منشی بشیشور پرشاد منور ، لکھنوی (۱۸) جناب آنند نرائن ملا ، لکھنوی
(۱۹) جناب وصل ، بلگرامی (۲۰) جناب احمق ، پھپوندوی . . . وغیرہم

کیفیت (مرتبہ سکریٹری صاحب انجمن)

کانفرنس کے پہلے اجلاس کے آخر میں جناب مولوی عبدالحق صاحب نے نہایت دلچسپ تقریر کی جس میں انجمن کی کئی سال کی کارگزاری پر بہت اچھا تبصرہ آگیا ھے ۔ یہ مطبوعہ روداد کانفرنس میں چھپ گئی تھی ہم چند ضروری اقتباسات پر قناعت کرتے ھیں :

'' جناب صدر و معزز حاضرین !

انجمن ترقی اردو نے ابتدا سے کام کو مقدم رکھا اور اس سے پہلے کبھی بڑے جلسے اور کانفرنسیں نہیں کیں ۔ البتہ ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں ایک کانفرنس کی تھی مگر اس میں مخصوص اصحاب کو مدعو کیا گیا تھا کہ وہ انجمن کے ادبی اور انتظامی امور میں مشورہ دے سکیں ۔ لیکن یہ زمانہ پروپیگنڈے ، ھنگامے اور اشتہار بازی کا ھے . . . . اور تو اور آج کل بڑی حکومتیں تک اس میں مبتلا نظر آتی ھیں . . . . اس

قسم کی کانفرنسوں سے لوگوں میں ہم‌دردی اور کام کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ کام کے ساتھ ہنگامہ بھی لازم ہے۔ بقول مولانا حالی

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

۱۹۳۶ء کی کانفرنس میں جو علی گڑھ میں منعقد ہوی تھی ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ آیندہ انجمن کا صدر مقام کہاں ہو؟ ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے احباب کو اصرار تھا کہ انجمن کا صدر مقام لاہور ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کا کہنا یہ تھا کہ اب اردو پنجاب ہی میں رہ جائے گی اس لیے یہیں رہ کر کام کرنا چاہیے۔ سر سید راس مسعود (مرحوم) نے علی گڑھ کا سبز باغ دکھایا کیوں‌کہ یونی‌ورسٹی کی وجہ سے وہاں ہر قسم کا کام کرنے والے موجود تھے۔ میری راے دلّی کی طرف مائل تھی .... قطع نظر دیگر وجوہ کے میں انجمن کو ان دو بلاوں سے بچانا چاہتا تھا جو آج کل سارے ہندستان پر مسلّط ہیں۔ ایک بلا تو فرقہ واری، اور دوسری صوبہ‌واری .... اردو کسی خاص فرقے یا طبقے کی زبان نہیں نہ کسی خاص علاقے یا صوبے سے مخصوص ہے۔ اور سواے دھلی کے جہاں کہیں بھی انجمن کا صدر مقام ہوتا وہ صوبہ‌واری الزام سے نہیں بچ سکتا تھا ....''

پھر مولوی صاحب نے بتایا کہ اب تک انجمن نے ۱۳۰ کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے کئی درجے کر رکھے ہیں: (۱) عام پڑھے لکھے لوگوں کے پڑھنے کی کتابیں (۲) درسی کتب (۳) علوم و فنون خاص کر سائنس کی کتابیں (۴) مختلف لغت کی کتابیں (۵) شائستہ زبانوں کی اعلیٰ تصانیف کا، جو زندۂ جاوید ہیں، ترجمہ (۶) قابل قدر پرانی کتابیں جو اب نایاب ہو گئی ہیں (۷) قدیم اردو کی کتابیں (۸) اردو شعرا کے قلمی تذکرے جو ڈھونڈے سے نہیں ملتے . . . . ''ان کتابوں کے شائع ہونے سے، نیز انجمن کے رسالۂ اردو کے مضامین سے اردو زبان و ادب کے متعلق خاصا انقلاب ہو گیا۔ تحقیق و تنقید کا نیا باب کھل گیا اور جس زبان کی ابتدا ولی سے کی جاتی تھی، اس کی عمر میں دو سو برس کا اضافہ ہو گیا!''

''اب رہی زبان کی اشاعت سو اس کا خیال چند سال سے پیدا ہوا اور اس غرض سے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا گیا۔ انجمن کی شاخیں قائم کیں اور جہاں جہاں ممکن ہوا شبینہ مدارس اور دن کے مکتب اور کتب خانے یا مطالعہ

خانے کھولے گئے - اس وقت انجمن کی شاخیں تمام صوبوں میں ۱۸۰ ہیں اور صدر انجمن اور اس کی شاخوں کی نگرانی میں ۶۲ مدارس کام کر رہے ہیں،، -

پھر مولوی صاحب نے اپنے رسائل کا ذکر کیا کہ "اردو ۱۹ سال سے برابر جاری ہے اور اس کی افضلیت اس قدر مسلّم ہو چکی ہے کہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں - سائنس کو جاری ہوئے ۱۲ سال ہوتے ہیں - اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو داں طبقے میں سائنس کے مضامین سے شوق پیدا ہو اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو . . . اس سال انجمن نے ایک پندرہ روزہ اخبار ہماری زبان کے نام سے جاری کیا ہے - اس زمانے میں ایسے اخبار کی شدید ضرورت تھی - ہمارا علمی سہ ماہی رسالہ اسے پورا نہیں کر سکتا تھا - ہمیں ضرورت تھی کہ لوگوں کو اپنی زبان کی حقیقت، اس کی ہمہ گیری، اس کی اہمیت سے آگاہ کریں - روزمرہ کے بیجا حملوں سے بچائیں اور اس کی بقا کی فکر کریں - ارکان انجمن نیز عام طور پر لوگوں کو انجمن کے حالات اور کارگزاریوں سے آگاہ کرتے رہیں . . . غرض اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لئے ہمیں کالی داس کے "میگھ دوت،، کی طرح ایک قاصد کی ضرورت تھی جو اس خدمت کو انجام دے - یہ پرچہ شروع سے بہت مقبول ہوا اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے ..... -

اس سال میں نے بمبئی، گجرات، خاندیس، کرناٹک، کشمیر، حیدرآباد وغیرہ کا دورہ کیا - صوبہ بمبئی کے متعدد شہروں، قصبوں اور گانووں میں جانے کا اتفاق ہوا ان مقامات میں مجھے یہ دیکھکر بہت خوشی ہوی کہ اردو زبان کا عام طور پر چرچا ہے اور وہاں کے شہروں اور قصبات میں کثرت سے لوگوں کی زبان اردو ہے - سورت میں بوہروں کی بزم میں ان کی شستہ تقریریں اور نظمیں، الکلیشور اور ھسوٹ جیسے قصبوں میں لوگوں کی بول چال، شولا پور میں مزدوروں کے شبینہ مدراس اور ان کی بے تکلف اردو بات چیت، دھولیا اور مالے گاوں کے متعدد مدرسے اور کتب خانے دیکھکر مجھے مسرت بھی ہوی اور حیرت بھی - میں اتنا تو جانتا تھا کہ گجرات، خاندیس، کرناٹک میں اردو سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا خیال بھی نہ تھا کہ وہاں کے لوگ ایسی اچھی اردو جانتے اور ایسی شستہ تقریریں کر سکتے اور ایسی عمدہ نظمیں لکھ سکتے ہیں . . .

بمبئی سڈن‌ہم کالج کے بعض طلبہ نے اردو زبان لے رکھی تھی لیکن کالج میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میں نے مسٹر کھیر کو جو وزیر اعظم تھے، لکھا پھر خود جا کر ان سے دوبارہ ملاقات کی۔ غرض سال ڈیڑھ سال کی خط کتابت اورملاقاتوں کے بعد یہ ہُوا کہ حکومت بمبئی نے سڈن‌ہم کالج میں ایک اردو لکچرار مقرر کردیا انجمن کی اسی قسم کی کوششوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ حکومت بمبئی نے جل‌گاوں میں اردو ٹریننگ کالج قائم کر دیا ہے۔

خاص دلّی میں بھی ہم نے تھوڑا بہت کام شروع کر دیا ہے۔ گزشتہ سال جب میں کلکتے میں مولوی فضل‌الحق اور ان کے بعض وزرا اور اہل الرائے سے ملا اور بنگال میں اردو زبان کی اشاعت کے متعلق گفتگو کی تو منجملہ دوسری مشکلات کے ایک عذر انہیں یہ تھا کہ بنگال میں اردو پڑھانے والے استاد نہیں ملتے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو میں کلکتے ہی میں ایک ٹریننگ اسکول قائم کر دیتا ہوں اور آپ ہی کے مدرّسوں کو اردو سکھانے کے لئے تیار کردونگا۔ اسے انہوں نے منظور نہیں کیا، شاید اپنی حکومت کی سبکی سمجھے۔ خیر، جب میں دلی آیا تو دیکھا کہ یہاں کے عربی مدراس میں بہت سے بنگالی طلبہ پڑھتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے ہاں بلایا اور بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ اگرچہ وہ سالہا سال سے دلی میں ہیں مگر بول چال میں کچّے اور نوشت و خواند سے عاری ہیں۔ میں نے انہیں اردو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی اور جھٹ پٹ اس کا انتظام کر دیا۔ اب ان کی تین جماعتیں ہیں اور دو سو طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔ اگرچہ انہیں پڑھتے ہوے چند ہی مہینے ہوے ہیں لیکن اب وہ بلاتکلف اردو میں تقریریں کرتے اور مضمون لکھتے ہیں اور بعض تو ایسی اچھی اور صحیح اردو لکھنے لگے ہیں جیسے عام اہل‌زبان۔ اُن کی دیکھا دیکھی سرحد کے پٹھان طالب علموں کو بھی جوش آیا، اور اُن کے جوش سے خدا پناہ میں رکھے! انہوں نے انجمن کے دفتر پر حملّہ کیا اور کہا "ہم بھی اردو پڑھے گا!" ہم نے کہا "ہم ضرور پڑھائے گا"، چنانچہ ان کے اردو پڑھانے کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ ان طلبہ کی تعداد تقریباً ایک‌سو پچاس ہے۔ انشا' اللہ یہ بنگالی اور سرحدی طالب علم ہمارے سب سے اچھے مشنری ہوں‌گے۔

"کشمیر کا حال دیکھکر مجھے خاص مسرت ہوی۔ شاید ہندوستان کے کس صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں ہے جس قدر کشمیر میں۔ وہاں متعدد

مقامات میں جانے کا موقع ملا - شہر تو شہر قصبات و دیہات میں بھی اردو سمجھتے اور بول سکتے ھیں . . . کشمیر میں مدت سے اردو رائج اور ذریعہٴ تعلیم ھے۔ بہت اچھے اردو کے ادیب اور شاعر موجود ھیں - وھاں کی اسمبلی کے اجلاس کو جاکر دیکھا - سب ممبر بلا استشنی اردو میں بلا تکلف تقریریں کرتے تھے . . . ھم کشمیر کو اردو کا بہت اچھا مرکز بنانا چاھتے ھیں اور وھاں کے صدر (شیخ عبدالحمید صاحب اڈوکیٹ) اور سکریٹری (پنڈت دینا ناتھ صاحب، مست) سے توقع ھے کہ اس منصوبے کو عمل میں لانے کی کوشش کریں گے،، -

حیدرآباد خاص اور اورنگ‌آباد میں دو مرکزی شاخوں کے قیام کا ذکر کرنے کے بعد جناب مولوی صاحب نے جناب پنڈت کیفی صاحب نیز راقم‌الحروف کے شریک‌کار ھونے پر اطمینان کا اظہار فرمایا اور صدرنشین انجمن سرتیج بہادر سپرو کی عنایت کا شکریہ ادا کیا - ان کی تقریر ان پُر اثر کلمات پر ختم ھوی :

” ھندوستان جو آج ٹکڑے ٹکڑے ھو رھا ھے اور ھر جماعت دوسری جماعت کو اور ھر فرقہ دوسرے فرقے کو بھنبھوڑنے اور ھضم کرنے پر آمادہ ھے، اُن کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے اور اُن کو اعتدال پر لانے کے لئے یہی (زبان کا) نسخہ کام دے‌سکتا ھے، یہ ٹکڑے گوند یا لیئی سے نہیں جُڑ سکتے - کچے تاگے سے نہیں بندھ سکتے - ان کے یکجا کرنے اور باندھنے کے لئے شیرازے کی ضرورت ھے اور یہ شیرازہ ھماری اردو زبان ھے جس کے خمیر میں اتحاد ھے۔ یہ اتحاد سے بنی اور اتحاد کے لئے بنی تھی اور آیندہ بھی اگر اتحاد پیدا کرے گی تو یہی کرے گی۔ وہ بقول سرتیج بہادر سپرو کے ” ھندو مسلمان کے آبا و اجداد کا مشترک اور مقدس ترکہ ھے جو قطعاً ناقابل تقسیم ھے ! ،،

--:o:--

باب پنجم

دھلی کے نو سال

دھلی کی اردو کانفرنس کا حال ہم نے کسی قدر تفصیل سے لکھنا ضروری سمجھا کیوں کہ وہ انجمن کے حال میں ایک بڑے تغیّر کا اعلان تھی۔ لوگوں نے برای‌العین دیکھ لیا کہ علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کا ''شعبہ علمیہ،، نہ صرف مستقل بلکہ ایک ممتاز کل ھند ادارہ بن گیا ۔ جناب مولوی صاحب کی مخلصانہ جد و جہد نے ایک ادبی زاوئے کو اردو کے مضبوط مورچے میں بدل دیا ۔ یہ مورچہ ھندوستان کی آزادی اور تقسیم سنہ ۴۷ع تک دھلی میں قائم رھا اور اس کی علمی ، اشاعتی ، اور دفاعی سرگرمیوں میں مزید قوت آتی گئی ۔ جہاں تک مولوی صاحب کی ذات کا تعلق ھے ، ان کے اخلاص و استقامت کا ملک بھر نے لوھا مانا۔ سنہ ۳۷ع میں الہ‌آباد یونی‌ورسٹی نے علمی‌خدمات کے صلے میں ''ڈی، لٹ،، کی ڈگری دی (۱) کوی تین برس‌بعد یہی اعزاز مسلم یونی‌ورسٹی علی‌گڑھ سے انہیں حاصل ھوا۔ (۱۹۴۱ع) انجمن کی شائع کردہ کتابوں پر مفصل تبصرہ ھم ایک آئندہ باب میں تحریر کریں گے۔ یہاں اجمالاً اتنا بیان کرنا کافی ھے کہ دھلی کے دور میں ۴۲ع تک ھر سال تیئس چوبیس کتابیں چھاپی گئیں۔ اس کے بعد کاغذ کے استعمال پر حکومت نے پابندی لگادی اور عالم‌گیر جنگ کی تباہ کاریوں نے طباعت میں سخت مشکلات پیدا کیں تو یہ اوسط لازماً کم ھوگیا ۔ پھر بھی نو سال میں مجموعی طور پر کوی ڈیڑھ سو کتابیں صدر دفتر دھلی سے شائع ھوئیں اورسابقہ کتابوں سے مل کر انجمن کی مطبوعات کا شمار ڈھائی سو کے

(۱) جناب مولوی صاحب نے ۱۸۹۴ع میں ایم‌اے‌او کالج علی گڑھ سے الہ‌آباد یونی‌ورسٹی ھی کا امتحان دیا تھا ۔ مگر کامیابی کی اطلاع کے بعد بی اے کی سند لینے بھی وھاں نہیں گئے تھے ۔ اب ڈاکٹریٹ کا خلعت فضیلت اسی جامعہ نے پنہایا ۔

قریب آلگا - جس میں سے بعض بہت بلند پایہ تھیں - یوں بھی انجمن کی طرف سے جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں وہ معیاری تسلیم کی جاتی تھیں اور زبان اردو کی قدر و منزلت بڑھاتی تھیں - اسی طرح انجمن کے رسالے ، اردو ، سائنس ، ہماری زبان ، معاشیات، اس کا نام چمکاتے تھے - سہ ماہی اردو نے زبان کی تاریخ و تحقیق میں بے نظیر خدمات انجام دیں علمی تنقید کے نئے باب کھول دئے - نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ میں بھی جن حلقوں میں زبان اردو سے دلچسپی لی جاتی تھی ، اس رسالے کا مطالعہ کیا جانے لگا تھا - ہماری زبان اخبار کے طور پر مہینے میں دو بار چھپتا تھا - اس کی قیمت بہت کم رکھی گئی تھی - زمانہ جنگ کی گرانی میں جتنی اشاعت بڑھی ، انجمن کا خسارہ زیادہ ہوتا گیا - یہ اخبار کم و بیش چھ ہزار چھپتا تھا - اور نہ صرف انجمن بلکہ زبان اردو کا نقیب ہو گیا تھا - شروع میں ادارت (ڈاکٹر) ریاض الحسن صاحب کے تفویض تھی ، وہ تعلیم کے لئے اطالیہ گئے تو رفیق الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) رہے - ۴۲ع سے جناب دتاتریہ کیفی صاحب نے قلم اور کرسی ادارت سنبھالی اور دور دہلی کے ختم تک اپنی تیکھی تحریر سے ہماری زبان کی خدمت انجام دی - ۴۶ع سے ایک اور ماہ نامہ معاشیات جاری کیا گیا جس میں صرف معاشی یا اقتصادی مضامین اور معلومات ہوتی تھی - خاصا مقبول ہوتا جاتا تھا کہ دوسرے ہی سال ملک میں آزادی کا طوفان آ گیا -

مالیات اور تنظیم انجمن

انجمن کی آمدنی بہ تدریج بڑھتی رہی - ۳۸ع میں حیدرآباد کی سالانہ امداد نے اسے اسی ہزار سے اوپر پہنچا دیا - ۴۴ع کی سالانہ کیفیت میں آئندہ سال کی آمدنی کا تخمینہ ایک لاکھ سے بھی کچھ زیادہ کیا گیا تھا واقعۃً یہ چھ مند سے کی رقم آسے ۴۵ع میں حاصل ہوی - اگلے سال مرزا اسمعیل نظام کی ریاست میں "ڈھائی گھڑی کے بادشاہ" بنے - انہیں انجمن سے خاص عناد ہو گیا تھا کیوں کہ ریاست جے پور کے دیوان ہو کر وہاں ہندی چلای اور انجمن کی نکتہ چینی کی بدولت خوب رسوای کمای تھی - اب حیدرآباد کی تقریباً چالیس ہزار کی سالانہ آمدنی روک دی - لہذا اس برس انجمن کی آمد و خرچ کا موازنہ دو تہای رہ گیا - مرزا صاحب حیدرآباد سے نکالے گئے مگر اگلے ہی سال فسادات نے دہلی بلکہ ہندوستان میں ترقی اردو کا سارا دفتر تہ و بالا کر دیا - انجمن پناہ لینے کے لئے پاکستان میں منتقل ہوئی -

اس انقلاب کے وقت ایک لاکھ سے کچھ کم مد محفوظ اور ایک لاکھ سے زیادہ عمارت فنڈ کی رقوم امپریل بنک ، حیدرآباد دکن میں جمع تھی - یہاں یہ واقعہ بھی تحریر کرنے کے قابل ہے کہ ۴۲ع میں جناب مولوی صاحب مد ظلہم نے اپنا عمر بھر کا اندوختہ انجمن کی نذر کردیا - یہ چون (۵۲) ہزار سکہ عثمانیہ (=۴۷ ہزار روپیہ انگریزی) سے کچھ زیادہ رقم تھی اور اس اعتبار سے کہ ایک متوسط الحال فرد کی تیس برس کی سخت محنت کی کمائی تھی ، لاکھوں کی قیمت اور ایثار و فیاضی کی نادر مثال کا مرتبہ رکھتی ہے - ۱۹۳۶ع میں جب مولوی صاحب نے اردو یونیورسٹی بنانے کا منصوبہ پیش کیا ، ایک عطیہ جناب حافظ محمد صدیق صاحب تاجر و رئیس کانپور نے انجمن کو پچیس ہزار روپے کا مرحمت کیا (۱) - دہلی کا دور ختم ہونے تک والیان ملک کے علاوہ ، ایسے سرپرستوں کی تعداد جنہوں نے پانچ ہزار یا زیادہ روپیہ دیا ، چھ اور ایک ہزار روپیہ دینے والے معاونین کا شمار ۱۸ تھا - ڈھای سو یا تین سو روپے دینے والے ارکان دوامی سو کے قریب تھے - آمدنی کا بڑا حصہ یعنی تقریباً ساٹھ ہزار روپے سالانہ مطبوعات انجمن کی فروخت سے وصول ہونے لگا تھا - سند یافتہ تنقیح سازوں نے ۴۶ع کے آخر تک کے حسابات کی جانچ کی اُن کی تصدیق مورخہ ۱۷ فروری ۴۷ع اسی سال تمام کی مطبوعہ رپورٹ میں چھپی ہے جس کی رو سے انجمن کے زرنقد ذخیرہ کتب ، کاغذ ، اور کتب خانے وغیرہ کی مجموعی مالیت چار لاکھ اٹھاسی ہزار تین سو اٹھانوے روپے تھی - کوی دو لاکھ نقد بیش‌تر حیدرآباد دکن کے بنک میں جمع تھے - مطبوعات کی ایجنسی رائے بہادر سوہن لال کے پاس تھی ، ان کا ذخیرہ انجمن کے دفتر دریا گنج میں انہی کے آدمیوں کی تحویل میں رہتا تھا - کتب خانے کی مذکورہ مالیت میں جناب مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ شامل نہیں ہے جس میں بیش بہا مخطوطات اور عربی ، فارسی ، انگریزی کی کئی ہزار مفید و منتخب کتابیں ، ایک عمر کے وسیع مطالعہ اور عالمانہ شوق نے فراہم کی تھیں - آزادیٔ ہند کی تقریب میں مولوی صاحب کا ذاتی ساز و سامان ظروف و پارچہ ، بلوائیوں نے لوٹا تھا ، کتابیں اور بنک کا سرمایہ بھارت کی نئی

(۱) یہ اعلان آل انڈیا اردو کانفرنس ، کانپور (منعقدہ ۲۳ ، ۲۴ اکتوبر ۳۶ع) میں کیا گیا تھا -

قومی حکومت نے سنگوالیا ۔

انجمن کے آمد و خرچ کی نگرانی اور حسابات کی باقاعدہ تنقیح میں جناب مولوی صاحب کی احتیاط کا اوپر ذکر آچکا ہے ۔ دہلی آکر انہوں نے حسب قانون رجسٹری انجمن ہائے ہند ، متعلقہ محکمے میں اپنا آئین اور ضروری کاغذات بھیج کر اسے با ضابطہ رجسٹری کرایا ۔ انجمن کے مالی اور انتظامی اختیارات آنریری سکریٹری کے ہاتھ میں تھے لیکن سارے اخراجات دفتر و طباعت کی اجازت مجلس نظما سے لی جاتی تھی ۔ سالانہ کارگذاری ، آمد و خرچ کا موازنہ ، آیندہ سال کا پیش نامہ ، مجلس کے اجلاس میں لازماً منظوری کے لئے پیش ہوتا تھا اور ۳۹ع سے سرکار حیدرآباد میں بھی ان کی نقول بھیجی جاتی تھیں۔ مجلس نظما ابتدا میں سکریٹری کو مشورہ دینے والی جماعت تھی لیکن بعد میں نیا آئین بنا اور مختلف صوبوں کے ممتاز اہل‌علم شامل کئے گئے ۴۷ع تک ان کی تعداد ۲۶ ہو گئی تھی ۔ آیندہ انتخاب کا عنصر داخل کرنے کی غرض سے پچاس ''رفقائے انجمن،، کی ایک اور جماعت مرتب کی جا رہی تھی ، علی‌ہذا انجمن کی باقاعدہ شاخوں کو بھی رائے کا حق دینے کی تجویز زیر غور تھی کہ اتنے میں دہلی کا جا جمایا کارخانہ ہی آکھڑ گیا ۔ کچھ مدت پہلے ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی کو جو شروع سے انجمن کے کاموں میں شریک و معاون رہے ، شریک معتمد منتخب کیا گیا تھا (۴۵ع) دوسرے ممتاز نظما کے نام یہ تھے (۱) :—

۱ ۔ سر تیج بہادر سپرو (صدر)
۲ ۔ سر احمد سعید خاں رئیس چھتاری
۳ ۔ نواب مہدی یار جنگ (حیدرآباد)
۴ ۔ نواب فخر یار جنگ
۵ ۔ نواب صدر یارجنگ شروانی
۶ ۔ سر شیخ عبدالقادر (لاہور)
۷ ۔ سرکیلاش نرائن ہاکسر
۸ ۔ جناب سید عبدالعزیز صاحب (پٹنہ)
۹ ۔ جناب میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر (لاہور)

---

(۱) منقول از رپورٹ ۱۹۴۶ع

۱۰ - جناب غلام محمد صاحب بالقابہم
۱۱ - ڈاکٹر تاراچند (الہ آباد)
۱۲ - خان بہادر ڈاکٹر عبدالحق (مدراس)
۱۳ - جناب سید حسین امام صاحب (گیا)
۱۴ - جناب پیر الہی بخش صاحب (سندھ)
۱۵ - جناب محمد شعیب صاحب قریشی (بھوپال)
۱۶ - پنڈت دتاتریہ کیفی (دھلی)
۱۷ - نواب صدیق علی خاں (ناگ پور)
۱۸ - جناب عبدالرحمن صاحب صدیقی (کلکتہ)
۱۹ - ڈاکٹر سر ضیاء الدین (علی گڑھ)
۲۰ - ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الہ آباد - شریک معتمد)
۲۱ - ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہم (معتمد اعزازی)

سکریٹری کے دورے

دھلی کا دور جناب مولوی صاحب کے دوروں کی وجہ سے بھی انجمن کی تاریخ میں یادگار ہے - سلسلہ کچھ دن پہلے سے چل نکلا تھا مگر ریاست حیدرآباد سے باہر کیا آئے کہ معلوم ہوتا تھا سارا برعظیم جولاں‌گاہ بن گیا ہے - ان آٹھ دس برس کے دوروں کی مسافت لگائی جائے تو پچاس ساٹھ ہزار میل سے کم نہ نکلے گی - گویا تمام کرۂ ارض کے گرد ریل میں دو چکر لگا لیے - مشرق شعرا جہاں گردی ، بادیہ پیمای کو عشق کے وظائف میں شمار کرتے ھیں :

مانع دشت نوردی کوی تدبیر نہیں　　ایک چکر ہے مرے پاوں میں زنجیر نہیں

مولوی صاحب کے دوروں سے تصدیق ہوئی کہ کسی مقصد عزیز کی دھن واقعی آدمی کو زمین پیما بنادیتی ہے - اس کتاب میں سب دوروں کی اتنی تفصیل بیان کرنے کی بھی گنجائش نہیں جتنی انجمن کی رودادوں میں ہر سال چھپتی رہی ھیں - لیکن ان سے نہ صرف جناب مولوی صاحب کی سعئی پیہم بلکہ دوردست اقطاع میں ان مساعی کے خیرمقدم اور اثرات کا اندازہ ہوتا ہے - اس لیے ترقی اردو کی تاریخ میں انہیں جگہ ملنی چاہیے - ہم نمونے کے طور پر صرف دو سال کے دوروں کا خلاصہ پیش کریں گے:

۱۹۴۰ (۱)

جبل پور "کل ہند اردو کانفرنس، دہلی (دسمبر ۳۹ع) کے اختتام کے بعد ہی اہل جبل پور کی دعوت پر مجھے وہاں جانا پڑا - ۳ جنوری کو یوم اردو کے تحت ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں صوبے کے اکثر اضلاع اور مقامات کے نمائندے شریک ہوئے . . . میں نے چند اصحاب کو منتخب کیا کہ وہ کل ہند اردو کانفرنس کی تجویزیں جو صوبہ متوسط و برار کے متعلق منظور ہوئی ہیں، انہیں گورنر کے سامنے پیش کریں . . . "، یہ وفد ۲ فروری کو گورنر سے ملا اور کانفرنس کی تجاویز نیز اردو سے متعلق مقامی شکایات پیش کیں۔

کلکتہ - "جبل پور سے واپس آنے کے بعد ۱۰ جنوری کو کلکتہ گیا جہاں وزیر اعظم بنگال اور چند دیگر عمال حکومت سے بنگال میں اردو کے مسئلے پر ضروری گفتگو ہوئی - متعدد غیر سرکاری اصحاب سے بھی تبادلۂ خیالات ہوا "۔

سید سراواں - "کلکتے سے واپس ہوتے ہوئے سید سراواں گیا جو الہ آباد سے تھوڑے فاصلے پر بڑا قصبہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (صدر شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی) بھی ہمراہ تھے - ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں قرب و جوار کے بعض دیہات کے لوگوں نے بھی شرکت کی . . . سید سراواں کے نوجوان کارکنوں نے اس قصبے میں اردو کتب خانہ اور مدارس شبینہ کے ذریعے تعلیم بالغاں کے انتظام کرنے کا وعدہ کیا۔

علی گڑھ - ۲۰ جنوری کو حدیقۃ الشعرا اور انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر علی گڑھ گیا - یہ انجمنیں ہر سال اردو ہفتہ مناتی ہے جس میں اردو کی بقا اور توسیع کے متعلق مناسب کارروائیاں کی جاتی ہیں . . .

ناگ پور - اہل صوبہ کی دعوت پر ۳ مارچ کو ناگ پور پہنچا - بڑے پیمانے پر اردو کانفرنس کا انتظام کیا گیا تھا - صوبے کے تمام اضلاع سے نمائندے آئے ہوئے تھے . . . وہ (میرے مطبوعہ) خطبۂ صدارت کی کاپیاں اپنے ہمراہ لے گئے اور ان کے ذریعے صوبے کے تمام علاقوں میں مردم شماری (میں خانۂ زبان) کے متعلق ضروری ہدایات ابتدا ہی میں پہنچ گئیں - بعد کی اطلاعات سے جو دفتر کو موصول ہوئیں پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک اس صوبے کا تعلق ہے، اردو بولنے اور جاننے والوں نے

خطبے کی ہدایتوں پر پورا پورا عمل کیا . . . اس سنگلاخ سرزمین کے باشندوں کو آردو سے جو محبت اور دل‌چسپی ہے، وہ ان کے لئے قابل آفرین اور خادمان آردو کے لیے امید افزا ہے،، ۔ کانفرنس میں جناب پنڈت کیفی صاحب نے محققانہ مقالہ پڑھا اور ایک بڑے مشاعرے کی صدارت فرمائی ،،۔

تروپتی ۔ ماہ مارچ میں اوری‌انٹل کانفرنس میں شعبۂ آردو کی صدارت کے لئے جنوبی ہند کے اس قصبے میں جانا ہوا ۔ کانفرنس کے تمام اجلاس تو پھیکے اور بےمزہ رہے ، لیکن جناب مولوی صاحب نے ممتاز اہل قصبہ سے مل کر وہاں انجمن کی شاخ اور آردو کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کرادیا ۔

جموں ۔ ” انجمن ترقی آردو ، جموں کے افتتاح کے سلسلے میں ۱۶ اپریل کو جموں پہنچا ۔ جناب پنڈت اقبال کشن‌در کی صدارت میں ایک بڑا جلسہ ہوا ۔ انجمن کا باضابطہ قیام عمل میں آیا . . . شیخ عبدالحمید صاحب صدر انجمن ترقی آردو نے بیان کیا کہ ریاست کے اکثر مقامات پر انجمن کی شاخیں قایم ہوگئی ہیں۔

تروندرم ۔ ماہ جون میں میں نے تامل ناڈ کا دورہ کیا جو مدراس کا انتہائی جنوبی حصہ ہے . . . (تروندرم میں) ریاست ٹراونکور کے مدبر اور فاضل دیوان سر سی.پی راما سوامی آئر سے ملاقات ہوئی ۔ صاحب موصوف نے ٹراونکور یونی‌ورسٹی میں عربی و آردو کا شعبہ قایم کرنے کا وعدہ کیا ۔ اس کے متعلق ایک جلسہ خان‌بہادر (عبدالکریم صاحب ناظم پولس) کے دولت‌کدے پر ہوا جس میں بعض صاحبوں نے اردو میں بے تکلف تقریریں کیں ۔ ایک دن کے لیے ہم راس‌کماری پہنچے جو ہندستان کا انتہائی جنوبی نقطہ ہے ۔ وہاں بھی بعض اردو داں حضرات سے مل‌کر بہت خوشی ہوئی ،، ۔

ڈنڈی گل ۔ ” ۲۵ جون کو پلنی سے ڈنڈی گل آیا . . . اس قصبے کے محلہ بیگم پورہ میں اسی روز ایک شان‌دار جلسہ ہوا . . . ایک شاخ اور ایک اردو مدرسے کا قیام عمل میں آیا ۔ مدرسے کے تمام مصارف کی ذمہ داری مقامی حضرات نے لے لی ۔

مدورا ۔ ۲۶ جون کو جنوبی ہند کے قدیم تاریخی شہر مدورا پہنچا . . . شام کو ایک جلسے کا انتظام کیا گیا ۔ بہت کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوے ۔ میں

نے ,, ہمیں اردو کیوں سیکھنی چاہیے،، کے موضوع پر تقریر کی ... اسی جلسے میں انجمن کی شاخ کا قیام عمل میں آیا اور اردو تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا گیا ... سید غلام حسین وکیل نے جو مدورا مشن کالج میں اردو کے لیکچرار ہیں اور شاعر بھی ہیں، اردو پڑھانے کا ذمہ لیا ۔

کیڑے کرے — ۲۷ جون کو ڈاکٹر منیار صاحب کے ہمراہ براہ رام ناد، کیڑے کرے آیا ... یہاں ایک قدیم مدرسہ ,, صدقۂ جاریہ،، کے نام سے ہے ۔ اس میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے ۔ ... مغرب کے بعد بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا ... یہاں دو محلوں میں انجمن کی دو شاخیں قائم ہوئیں ۔ ...

ترچنا پلی — ''اس شہر میں میرے قیام کے موقع پر اردو سے متعلق چار جلسے ہوے ۔ ان میں سے ایک صرف خواتین کا تھا ... یہاں تین شاخیں قایم ہوئیں ...

حیدرآباد — ترچنا پلی سے مدراس ہوتا ہوا حیدر آباد آیا اور ۲۰ جولای کو رسالہ سائنس کی مجلس ادارت میں شرکت کی ۔ جلسے میں رسالہ سائنس کو حیدرآباد سے ماہانہ شایع کرنے کا فیصلہ ہوا ۔ گیارہ ماہرین سائنس کی ایک مجلس ادارت بنادی گئی ....

کلکتہ — ۲۶ اکتوبر کو بعض احباب کی طلب پر پھر کلکتہ جانا پڑا ۔ اس موقع پر کلکتے کی شاخ کے استحکام کے متعلق ... گفتگو اور اکثر نوجوانوں سے تبادلہ خیالات ہوا ...

پٹنہ — ۳۰ نومبر سے ۲ دسمبر تک ہندستانی کمیٹی کے جلسے میں شرکت کی غرض سے پٹنے میں قیام رہا ۔

لاہور — ۸ دسمبر کو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام لاہور میں اردو کانفرنس منعقد ہوی جس کی صدارت میرے سپرد کی گئی ...

کان پور — بڑے دن کی تعطیل کے موقع پر کل ہند اردو کانفرنس کان پور میں منعقد ہوی ۔ سر عبد القادر کانفرنس کے صدر تھے ۔ بعض نمائندے اور معززین باہر سے آے تھے ۔ ایک اچھی خاصی علمی نمایش کا انتظام بھی تھا ۔ متعدد علمی اور ادبی مقالات پڑھے گئے ۔ کانفرنس کے اختتام پر شان‌دار مشاعرہ ہوا ۔

مہگانو ــ کان‌پور کان‌فرنس سے فرصت پاتے ہی پرگنہ چائل ضلع الہ‌آباد کی سب سے بڑی بستی مہگانو کے تعلیم یافتہ اصحاب کے اصرار پر چائل آردو کان‌فرنس میں شرکت کی . . . بستی کے لوگوں میں علمی اور ادبی ذوق ترقی پذیر ہے ۔ ایک اچھا خاصا آردو کا دارالمطالعہ . . . ایک مدرسۂ شبینہ بھی ہے ۔ کان‌فرنس کے موقع پر انجمن کی شاخ کا قیام عمل میں آیا . . . . ،،

(۲) ۱۹۴۳ء

پٹنہ ــ ’’ ۵ جنوری ۴۳ء کو پٹنہ پہنچا ۔ ہندستانی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی اور ’’ ہندستانی ڈکشنری ،، کا نمونہ جو میری نگرانی میں تیار ہوا ہے پیش کیا . . متعدد مقامی حضرات سے آردو کے متعلق گفتگو ہوی . . .

دیناج پور ــ ۷ مارچ کو دیناج پور (بنگال) کی آردو کان‌فرنس کی صدارت کی(۱) اور اسی روز شب کو مدرسہ شبینہ آردو کے جلسہ تقسیم انعام میں شرکت کی ۔ یہاں کی انجمن اور مدرسہ حبیب الرحمن صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔

ٹھاکر گاوں — ۸ مارچ کو ٹھاکر گاوں پہنچا ۔ ۱۰ مارچ کو ٹھاکر گاوں کی ’’ آردو منزل ،، کا افتتاح کیا اور مدرسہ شبینہ آردو کے طلبہ اور طالبات کی تعلیم کا معاینہ کیا ۔ ۔ ۔

بیگوں باڑی ــ (بنگال) ۱۰ مارچ کو بیگوں باڑی کے مدرسے کا معاینہ اور سالانہ جلسے کی صدارت کی ۔

شتاب گنج — ۱۱ مارچ کو شتاب گنج (بنگال) میں ہندی مدرسے کا معاینہ کیا ۔

جمشید پور — ۱۳ مارچ کو جمشید پور پہنچا ۔ سہ پہر میں وہاں کی لٹریری سوسائٹی میں ہندستان کی مشترکہ زبان پر لکچر دیا ۔ بعد مغرب جلسہ عام میں جو ایک میدان میں منعقد ہوا تھا آردو زبان کی اہمیت اور اشاعت پر تقریر کی ۔ ،،

---

(۱) اس کان‌فرنس کے خطبۂ صدارت میں جناب مولوی صاحب نے بنگال میں آردو کے رواج اور پھر قریب زمانے میں اسباب زوال کو بڑی تحقیق اور بصیرت آموز تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ یہ خطبہ ’’خطبات عبدالحق ،، کے مجموعے ، جلد دوم میں چھاپ دیا گیا ہے ۔

رانچی — ۱۰ مارچ چھوٹا ناگ پور کے اردو مرکز رانچی اور شبینہ مدارس کا معاینہ کیا ۔ علی ھذا موضع اریا اور کانکے کے اردو مدارس دیکھے جن میں ھندو ، مسلمان ، عیسای لڑکے اردو پڑھتے ھیں ۔ رانچی کے رومن کیتھولک عیسائیوں کے مدرسے میں تین سو طالب علم تھے ۔ ''انجمن کی کوشش سے ان سب کے لیے اردو لازم کردی گئی ھے،، ۔ ۔ ۔ ۔

گیا — ۱۸ مارچ کو گیا پہنچ کر معززین شہر سے عمارت فنڈ میں حصہ لینے کی تحریک تازہ کی گئی ۔ بعض صاحبوں نے اعانت کا وعدہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔

۲۸ مارچ کو الہ‌آباد اکاڈمی میں اور ۴ اپریل کو میرٹھ کی انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسے میں شرکت کی ۔ ۲ مئی کو بزم ادب ، مرادآباد کے جلسے کی صدارت کی ۔ ان ھی تاریخوں میں وھاں ایک بڑا مشاعرہ مقامی حکام نے منعقد کیا تھا جس میں اکثر مشہور شعرا بلائے گئے تھے ۔ رائے بہادر رام بابو سکسینہ میر مشاعرہ تھے۔

ٹونک — ۱۹ مئی کو براہ جے پور ، ٹونک آکر اردو کے ایے ایک جلسے میں شرکت کی ۔ علی گڑھ کے طلبہ نے عمارت فنڈ کے لیے چندہ جمع کیا ۔ '' پروفیسر شیرانی صاحب نے تین سو روپے اور کچھ قلمی کتابیں انجمن کو عنایت فرمائیں،، ۔ ۔ ۔

رام پور — ماہ جون میں رام پور کے سرکاری اور نئے غیر سرکاری کتب‌خانے کا معائنہ کیا ۔ آخر الذکر کے سپاس نامے کے جواب میں اردو کتب خانوں کی ضرورت پر تقریر کی ۔

اورنگ آباد — (دکن) ستمبر میں انجمن کے شبینہ مدارس کا معاینہ اور انعامات تقسیم کئے ۔

ویجا پور — اورنگ آباد سے وھاں کی تحصیل (تعلقہ) ویجا پور گیا ۔ لوگوں نے تحصیل‌دار مسٹر سیتا رام کی صدارت میں بڑا جلسہ کیا ۔ عمارت فنڈ کے لیے پانچ سو پندرہ روپیہ چندہ ھوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شملہ — یورپین اور اینگلو انڈین باشندوں کی تعلیمی مجلس کی زبان کی کمیٹی میں شرکت کی ۔ اردو ریڈروں کا تیار کرانا میرے تفویض کیا گیا ۔ ۴ اکتوبر کو وای ایم سی کے ھال میں ایک جلسہ ھوا اور انجمن ترقی اردو کی شاخ قایم کی گئی — ۱۰ اکتوبر کو ایوان ادب کے جلسے میں شرکت کی ۔،،

کالی کٹ — ملیبار کے لوگوں نے کالی کٹ میں ایک آردو کان‌فرنس منعقد کی اور صدارت کے لیے جناب مولوی صاحب کو بلوایا ۔ وہ براہ مدراس ۶ نومبر کو پہنچے ۔ راستے کے اسٹیشنوں پر خیر مقدم اور خاص کالی کٹ میں پرتپاک استقبال ہوا ۔ کان‌فرنس میں ملیبار کے ہر حصے کے معززین آئے تھے ۔ جناب مولوی صاحب کا بلیغ و پر اثر خطبہ ان کے خطبات (جلددوم) میں چھپ گیا ہے ۔ انجمن کی ایک شاخ قائم کی گئی ۔ جس میں علاقے کے مشہور ذی اثر حضرات شامل ہوے ۔ عام اجلاسوں میں بہت سی کارآمد تجاویز اور تقاریر کے علاوہ رات کو بڑے زور کا مشاعرہ ہوا اور جناب مولوی صاحب ہی کو لوگوں نے میر مشاعرہ بنایا(۱) ۔

وانیے کاٹ — کالی کٹ سے کچھ فاصلے پر یہ قصبہ ایک ”دارالعلوم“ کا مالک ہے جس میں عربی کی آٹھ جماعتوں میں تاریخ ، جغرافیہ ، ریاضیات کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے ۔ مولوی صاحب کے پہلے دورۂ ملیبار کے بعد ہی سے اردو کی تعلیم بھی لازمی کردی گئی تھی ۔ مولوی صاحب نے ۸ نومبر کو اس کا معاینہ کیا اور نئے آردو خوانوں سے آردو پڑھوا کر سنی ۔

ملا پرم — ۹ نومبر کو مولوی صاحب چند رفیقوں کے ساتھ ملا پرم گئے جو موپلا آبادی کے اندرونی علاقے میں واقع ہے ۔ یہاں کے ہای اسکول میں نو سو طلبہ پڑھتے تھے ۔ صدر مدرس نے مہمانوں کا تعارف کرتے ہوے کہا کہ ”یہ مدرسہ موپلا قوم کا تعلیمی اور تہذیبی مرکز ہے ۔ پہلے موپلا طلبہ اختیاری مضامین میں عربی اور ملیالم کو ترجیح دیتے تھے ۔ لیکن اب ہوا کا رخ انجمن ترقی آردو کے بوڑھے مگر جوان ہمت سکریٹری کے طفیل بدل گیا ہے . . . چناں‌چہ امسال ستر طلبہ نے اسے اختیاری مضمون کے طور پر لیا اور مدراس یونی‌ورسٹی کے کالجوں میں بھی یہاں کے طلبہ بی اے میں آردو اختیار کرنے لگے ہیں . . . . “ پھر ایک موپلا بچے نے مہمانوں کا خیر مقدم نظم سے کیا جس کے پہلے تین شعر یہ تھے :

---

(۱) بلکہ ایک شعر بھی ”تبرکاً“ پڑھوایا ! (ہماری زبان - ۱۶ دسمبر ۳۸ء)
مولوی صاحب کا وہ طبع زاد شعر یہ ہے:
”گو پیر ہیں یہ دل سے ہمیشہ‌جواں رہے   گل کی طرح شگفتہ رہے ، ہم جہاں رہے“

ہے شہد سے بھی میٹھی اردو زباں ہماری		سچ پوچھیے تو یہ ہے تسکین جان ہماری
دل کا سرور ہے یہ آنکھوں کا نور ہے یہ		اردو زباں کے ہم ہیں، اردو زباں ہماری
ہندستاں سے چل کر یورپ پہنچ گئی ہے		دنیا پہ چھارہی ہے اردو زباں ہماری ...

خوش الحانی کے ساتھ بچے کا تلفظ بالکل صاف اور صحیح تھا۔ جناب مولوی صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں کہا:

"یہ عجیب بات ہے کہ دلّی سے ایک بوڑھا سینکڑوں میل کے فاصلے پر یہاں اردو میں تقریر کر رہا ہے اور اس سے بھی عجیب و غریب بات یہ ہے کہ یہاں ایک موپلا بچے سے "اردو زباں ہماری" کا گیت گاتے ہوے سنتا ہے۔ میں ہر جگہ اردو کے عام اور مشترک زبان ہونے کی دلیلیں پیش کیا کرتا ہوں لیکن اس موپلا بچے سے یہ گیت سن کر پھر کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ..."

تیتور۔ یہاں ملیبار کا واحد زنانہ ہائی اسکول قائم تھا۔ ۱۰ نومبر کو مولوی صاحب نے اس کا معاینہ کیا اور صدر مدرسہ نے وعدہ کیا کہ وہ مدرسے میں اردو تعلیم کے لئے محکمے سے منظوری حاصل کرے گی۔

مدراس۔ واپسی پر دو تین دن کے قیام میں ۲ میئرز کالج کی طالبات اردو کی بزم اور پریسیڈنسی کالج کی اردو سوسائٹی کے جلسوں میں تقریریں ہوئیں۔ ۱۵ کو براہ حیدرآباد، مراجعت کی۔

ناگ پور۔ ۲۱ نومبر کو ناگ پور پہنچ کر اردو سوسائٹی کے جلسے میں تقریر کی۔ اٹارسی۔ ۲۳ نومبر کو مدرسۂ نورالاسلام اور انجمن کی شاخ کا معاینہ کیا۔

علی گڑھ۔ ۶ دسمبر کو علی گڑھ جاکر نواب صدر یار جنگ شروانی سے درخواست کی کہ وہ کُل ہند اردو کانفرس ناگ پور کی صدارت قبول فرمایں . . .

مذکورۂ بالا تلخیص میں جناب مولوی صاحب کی سچی لگن، غیر معمولی مشقت اور بے چین فطرت کی جھلک نظر آسکتی ہے لیکن احساس کی بیداری اور حمایت اردو کی وہ تڑپ جو اس مسلسل گشت، زبان اور قلم اور قدم کی اس پیہم سعی سے ملک بھر میں ساری ہوی، ان اثرات گرم کا اندازہ لگانا ہو تو اس زمانے کے خاص خاص اردو اخبارات اور کم سے کم ہماری زبان کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ کوششیں جس طرح حامیان اردو کے دلوں کو قوت و مسرت بخشتی تھیں، اسی

نسبت سے فرقہ پرست مخالفوں کو زہر معلوم ہوتی تھیں - اُن کے مختلف اخبارات و رسائل، سبھائیں اور انجمنیں عناد کے تیر چلاتی اور عداوت کی سرنگیں لگاتی رہتی تھیں - خود گاندھی جی زبان کے بارے میں تنزلی کا یہ سیلاب امنڈتا دیکھکر پریشان ہوئے اور پنڈت سندر لال جیسے کھرے دوستوں کی نہمائش سے اپنے سابقہ طرز عمل پر پچھتانے لگے تھے - پشیمانی کا کھلا ہوا اعتراف ہم آئیندہ سنیں گے مگر واقعہ یہ ہے کہ جس بارود کو شتابہ لگا دیا تھا، اس کی آگ روک لینی ممکن نہ تھی - ادھر سلطنت برطانیہ کے آثار زوال کے ساتھہ سیاسی اقتدار کے حصول کی کوشش، جان و مال کی بازی بن گئی تھی - فرقہ‌واری جنگ کے نئے دروازے کھل رہے تھے - جن رہبروں کو اپنے جذبات حرص پر قابو نہ تھا، وہ سر پھرے لشکروں کو کیا سنبھال سکتے تھے؟ بایں ہمہ حیرت ہوتی ہے اور انصاف کے منہ سے بےساختہ آفرین نکلتی ہے کہ اردو کی مفرط محبت بلکہ مضطربانہ حمایت کے باوجود مولوی عبدالحق صاحب نے ہمیشہ اُسے فرقہ‌واری مسئلہ بن جانے کی انتہائی مزاحمت کی - وہ مذہبی تعصبات سے بالکل بری تھے اور تقسیم ہند یا اس کے قریب زمانے تک ہندوستان کی متحدہ قومیت کے آرزومند رہے - بلکہ یہی آرزو انہیں اور طیش دلاتی تھی کہ اردو جو اسی متحدہ قومیت کی علامت تھی اور نہایت آسانی اور خوبی سے قومی زبان کا کام دے سکتی تھی، اُسے فرقہ‌واری تعصّب یا تنگ دلی سے نقصان پہنچایا جا رہا ہے - اگست سنہ ۱۹۴۵ء کے رسالہ ' کریسنٹ **(سورت)** میں سرتیج بہادر نے اُن کے علم و فضل اور عظیم ادبی خدمات کی تحسین کو اس یادگار فقرے پر ختم کیا تھا :

(ترجمہ) — " جب کبھی ہمارے زمانے کی تاریخ جذبات سے الگ ہوکر لکھنے کی نوبت آئے گی، تو میں سمجھتا ہوں کہ بے لاگ مورخ کا فیصلہ یہ ہوگا کہ اردو ادب اور سب سے بڑھ کر باہمی آشتی اور مفاہمت کے مقاصد کے لئے ڈاکٹر عبدالحق نے جو خدمات انجام دیں، ان کی کماحقہ تعریف نہیں ہو سکتی! "

کانفرنسیں

بہرحال، اردو کی دشمنی ملک میں بڑھتی رہی - انگریزی صوبوں سے چل کر یہ وبا اُن دیسی ریاستوں تک پھیلی جن میں سے بعض اردو کی سرپرستی میں مشہور

تھیں اور اس کے ادب کا مرکز سمجھی جاتی تھیں۔ یہ کیفیت ہم ایک آیندہ فصل میں یکجای پیش کریں گے، سردست انجمن ترقی اردو کی دوسری دفاعی اور اشاعتی کوششوں کے چند عنوان لکھتے ہیں۔ ان میں ایک وہ اردو کانفرنسیں ہیں، جو انجمن کی تحریک و ترغیب سے زیر نظر سنین میں منعقد ہوئیں جناب مولوی صاحب کے دورے کے ضمن میں سنہ ۴۰ اور سنہ ۴۳ کے بعض اجتماعات کا اوپر ذکر آیا جن میں کالی کٹ اور دیناج پور (بنگال) کی اردو کانفرنسیں نہایت کامیاب رہیں۔ لیکن انجمن کی تبلیغ اور تقلید کی بدولت ہندوستان کے قریب قریب ہر گوشے میں جو کانفرنسیں، جلسے، مظاہرے (اور مشاعرے) اردو کی حمائت میں ہوے انکا شمار بتانا محال ہے۔ اول تو خود مولوی صاحب قبلہ کا جہاں گزر ہوتا۔ اور وہ کونسی جگہ تھی جہاں انکا گزر نہ ہوا — وہیں اردو کا میلا لگ جاتا تھا۔ دوسرے انجمن کی طرف سے بعض صاحبوں نے رضاکارانہ گشت لگاے اور اپنے اپنے علاقے میں بڑے بڑے جلسے بلاے۔ انجمن کی شاخیں قائم کیں۔ ان میں مولوی نجم الدین صاحب جعفری (سابق ناظم اطلاعات، حکومت) اور علی شبر حاتمی (حیدرآباد دکن) کی سعی و محنت خاص طور پر اعتراف کے قابل ہیں۔ حاتمی صاحب نے دو رفیقوں کے ساتھ ریاست حیدرآباد کے بہت بڑے رقبے کا سائیکلوں پر دورہ کیا۔ انجمن کے سفیر خیر صاحب بھوروی اور حکیم اسرار احمد صاحب کریوی الگ اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت اور شاخیں نصب کرتے رہے۔ ان شاخوں کی کثرت و کارگزاری پر ہم آیندہ نظر ڈالیں گے۔ سنہ ۱۹۴۰ کی کانفرنسوں میں سب سے بڑے اجتماع ناگ پور (مارچ) اور دسمبر میں بہ مقام لاہور ہوے۔ ان کی صدارت جناب مولوی صاحب نے کی مگر مدراس میں امبور کی اردو کانفرنس (جولائی ۴۰) کی صدارت نواب صدیق علی خاں (ناگپوری) نے کی تھی۔ جنوری ۴۱ء میں ایک کانفرنس گوالیار میں، دوسری کل پنجاب اردو کانفرنس، لائل پور میں (مارچ میں) جناب مولوی صاحب ھی کی صدارت میں منعقد ہوئیں جہاں انھیں دونوں ہندی اور پنجابی کو اردو کا حریف بنانے کا شوشہ چھوڑا گیا تھا۔ اسی مہینے اکولہ (برابر) میں "صوبہ اردو کانفرنس" کی کامیابی کا سہرا بہادر یار جنگ مرحوم کی خطابت کے سر بندھا۔ سنہ ۴۲ کے متفرق جلسوں میں کل ہند اردو کانفرنس الہ‌آباد (اپریل) قابل ذکر ہے جس کے صدر نواب مسعودالرحمن صاحب شروانی تھے۔ جنوبی ہند میں کالی کٹ

کانفرنس کا اوپر تذکرہ آیا لیکن سال (سنہ ۴۳) کا آغاز ان علاقوں میں میل و شارم کی اردو کانفرنس (۲ جنوری) سے ہونا چاہیے جہاں ارکاٹ کے مقامی حضرات نے فصیح و بلیغ زبان میں تقریریں کیں۔ (ملاحظہ ہو ہماری زبان۔ یکم فروری ۴۳)

ناگ پور کانفرنس سنہ ۴۴

صوبای اور اضلاعی کانفرنسوں سے قطع نظر ایک بڑی کل ہند اردو کانفرنس، ناگ پور میں منعقد ہوئی۔ انجمن ترقی اردو سے گاندھی جی کا مناظرہ یہیں چھڑا تھا۔ یہاں کی کانگریسی حکومت نے اپنے اقتدار کے پہلے ہی دور میں سب سے بڑھکر تعصب دکھایا تھا۔ ”ودیا مندر،، اسکیم اور بسوا چاندور کا ہول ناک مقدمہ اسی حکومت کے اعمال سیاہ میں تحریر ہوا۔ ان وجوہ سے اس صوبے کے مسلمان تعداد میں کم لیکن سب سے زیادہ ناراض ہوئے تھے۔ انہی نے جناب مولوی صاحب کی اردو کی مہم میں سب سے بڑھکر ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ قید و بند کی مشقت جھیلنے پر تیار ہو گئے تھے جس کا اوپر حوالہ آ چکا ہے۔ پہلے سنہ ۳۸ میں پھر سنہ ۴۰ میں یہاں بہت کامیاب اردو کانفرنسیں ہوی تھیں لیکن جنوری سنہ ۴۴ کا اجتماع کل ہند پیمانے پر کیا گیا بعض اعتبار سے انجمن ترقی اردو کی تاریخ میں دھلی کی کانفرنس سے کچھ کم یادگار نہ تھا۔اس کے باقاعدہ مندوب تین سو سے زیادہ تھے اور حاضرین کا شمار دس ہزار سے اوپر تخمین کیا گیا ہے۔ عالم گیر جنگ کی بربادیوں کی وجہ سے ضرورت کی اشیا نہایت گراں اور کم یاب ہورہی تھیں۔ بایں ہمہ اہل ناگ پور نے کانفرنس کے مہمانوں، رضا کاروں، خادموں کے نہ صرف قیام کا بلکہ طعام کا ایسی فراخ دلی سے انتظام کیا کہ اسلامی مہمان نوازی کی دیرینہ روایات تازہ ہوگئیں۔ نہایت خوبصورت وسیع پنڈال شامیانوں سے بنایا گیا اور اعلیٰ درجے کے فرش فروش، صوفے اور کرسیوں سے آراستہ تھا۔ برقی روشنی کی کثرت اور حسن انتظام سے رات میں دن کا سماں نظر آتا تھا، کیوں کہ کانفرنس کا پہلا اجلاس عام بعد عشا رات ہی کو شروع کیا گیا تھا (۱۹ جنوری)۔ صدارت کے لیے نواب‌صدر یارجنگ شروانی علی‌گڑھ سے تشریف لائے تھے۔ افتتاح حیدرآباد کے وکیل مختار (ایجنٹ) برائے برار (نواب مرزا یار جنگ) نے فرمایا۔

جناب مولوی صاحب نے بہ حیثیت سکریٹری انجمن ترقی اردو اجلاس میں جو

کارگزاری کی کیفیت سنای وہ گذشتہ تین چار سال کے احوال پر ایک جامع تبصرہ تھی۔ ہم صرف اس کے ضروری اجزا کا ملخص پیش کرنے پر قناعت کریں گے :-

مولوی صاحب نے فرمایا کہ گاندھی جی اور ان کے رفقا کے اس اعلان نے کہ "وہ ھندی کو ھندستان کی عام زبان بنا کر رھیں گے"، ھمیں خواب خرگوش سے بیدار کیا ۔ اس وقت ھماری آنکھیں کھلیں اور ھم سمجھے کہ کمروں میں بیٹھ کر کاغذ سیاہ کرنے اور قلم گھسنے سے کیا حاصل اور یہ سب کچھ کس دن کے لئے اور کس کے لیے ؟ تب انجمن کے مقاصد میں "اشاعت و حفاظت زبان" کا مقصد بڑھانا پڑا اور انجمن میدان میں آئی ۔ پہلی مہم کا آغاز اسی شہر سے ہوا جسے میں نے اس کے بعد سے "جاگ پور" کا نام دیا کیوں کہ اس نے ھمیں اور آپ کو جگایا تھا . . . انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے یہاں تو میں بار بار آیا لیکن ھندستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی دورے کیے ۔ بنگال ، بہار ، یو پی ، سندھ ، کشمیر ، گوالیار ، رانچی ، جنوبی ھند ، مدراس ، آندھرا ، ارکاٹ ، ملیبار ، تامل ناڈ ، ٹراونکور تک گیا اور راس کماری پر جا کر دم لیا ۔ لوگ مبالغے سے "کشمیر تا راس کماری" کا فقرہ کہا کرتے ھیں لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے راس کماری میں بھی اردو بولنے والے ملے . اس جلسے میں انجمن کی گذشتہ چند سالہ کارگزاریوں کا تفصیل تو کیا ، اجمال سے بھی بیان کرنے کا نہ تو کافی وقت ھے اور نہ سننے والوں میں اتنا صبر لہذا اختصار کے ساتھ چند باتیں عرض کرتا ھوں . . .

۱ - دھلی میں اردو کالج قایم کیا جس میں ادیب عالم ، ادیب فاضل کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ھے ۔ اس کے نتائج بہت اچھے رھے ۔ پڑھانے والے سب فاضل اور مخلص حضرات ھیں ۔

۲ - یوروپین اور اینگلو انڈین جماعت سے ، مراسلت اور ملاقاتوں کے بعد یہ فیصلہ کرایا کہ ان کے مدارس میں اردو دوسری لازمی زبان ہوگی اور اس کا بدل کوئی دوسری ھندستانی زبان نہیں ھوسکتی اور نہ ان کے ھاں

پڑھای جاے گی - اس فیصلے کے مطابق ان مدارس کے لیے اردو کی درسی کتابیں مرتب کرانے کا کام میرے تفویض کیا گیا ہے۔

۳ - انجمن کی کوشش اور امداد سے بریلی اور آگرہ کے کالجوں میں اردو ایم اے جماعتیں کھولی گئیں -

۴ - طرفہ تر یہ کہ دھلی یونیورسٹی میں سرے سے اردو تھی ھی نہیں - کیسی ستم ظریفی کی بات ھے کہ مدراس اور ناگ پور یونیورسٹی میں تو آردو ھو اور نہ ھو تو دھلی یونیورسٹی میں - انجمن کی کوششوں سے امید ھے کہ اب یہ زبان دھلی یونیورسٹی میں باریاب ھوگی۔

۵ - انجمن نے ۱۹۴۱ء میں ایک نئے کام کا آغاز کیا - یعنی چھوٹا ناگ پور کے لیے جہاں ہندستان کی قدیم ترین قومیں آباد ھیں، اردو مرکز قایم کیا - یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے رومن کیتھولک مشنریوں کا راج ھے لیکن جب انہیں اطمینان ھوگیا کہ ھم مذھب کی تبلیغ کرنے نہیں آے تو وہ بھی تعاون پر آمادہ ھوے اور اب ان کے تقریباً سب مدرسوں میں اردو پڑھای جاتی ھے - اب تک دو ہزار سے زیادہ لڑکے آردو پڑھ چکے ھیں جن میں تقریباً ایک چوتھای عیسای ھیں . . . پادری اور ننیں تک آردو پڑھ رھی ھیں - بلکہ عیسائی عورتیں اور لڑکیاں بہت شوق سے آردو سیکھتی ھیں - ان کی املا کی کاپیاں میرے پاس آتی ھیں - یہ دیکھ کر حیرت ھوتی ھے کہ چند مہینے میں وہ اردو لکھنا پڑھنا سیکھ جاتی ھیں اور خط تو ان کا ایسا اچھا ھے کہ ھمارے گرے جوانیٹوں کو رشک آئے! . . . پادریوں میں بھی اردو کا کافی شوق پیدا ھوگیا ھے - ایک صاحب (فادر کرتوا) نے خاص اردو کی تحصیل کے لیے لکھنؤ اور دھلی کا سفر کیا - دلی میں تقریباً دو مہینے میرے مہمان اور تمام وقت آردو پڑھنے میں مصروف رھے . . . . . چھوٹا ناگ پور اردو مرکز کے مہتمم سہیل صاحب عظیم آبادی نے جس خلوص اور سرگرمی سے کام کیا ھے وہ نہایت قابل تعریف ھے -

پھر مولوی صاحب نے کشمیر و جے پور میں آردو کی مخالفت اور انجمن کی طرف سے دفاعی کوششوں کا ذکر کیا جس کا حال ھم آگے پڑھیں گے - ایک خوش خبری یہ سنای کہ کابل کے ٹریننگ کالج میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی گئی جس میں

انجمن کی سعی و تحریک کو بھی دخل تھا . . .

''لیکن اس نئے مقصد کے پیچھے ہم نے اپنے پہلے مقصد کو نہیں بھلایا ۔ بلکہ اس کے بعد سے ہماری مطبوعات کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوگئی اور ہم نے گزشتہ تین سال میں ۸۳ کتابیں شائع کیں ۔ ایسے قدیم تذکرے جن کے صرف نام کہیں کہیں کتابوں میں ملتے تھے، مگر وجود ناپید تھا، بڑی جستجو اور صرف کثیر سے بہم پہنچائے . . . ان کو صحت و احتیاط سے مرتب کر کے چھپوایا۔ نیز ملک کو اردوے قدیم سے روشناس کیا ۔ جس سے بقول ایک فاضل نقاد کے اردو کی عمر میں دو سو برس کا اضافہ ہوگیا ۔ لغات کے سلسلے میں انگریزی اردو کی جامع لغات، فرہنگ اصطلاحات پیشہوراں کی چھ جلدیں شائع ہوچکی ہیں ۔ باقی دو اور دوسری لغات زیر ترتیب ہیں ۔ '' اس کے علاوہ دنیا کی متعدد امہات کتب کے ترجمے شائع کیے ۔ ان میں عربی، سنسکرت، فارسی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی کی کتابیں ہیں۔ نیز سائنس کی مختلف شاخوں پر، فلسفہ، تعلیم، تاریخ، معاشیات، تنقید اور دیگر علوم پر بہت سی کتابیں شایع کیں ۔ یہ ایک بیش بہا خزانہ ہے جو انجمن کی بدولت اردو ادب کو حاصل ہوا ہے ۔ کسی ادارے نے اردو داں طبقے کے لیے علمی اور ادبی معلومات کا ایسا ذخیرہ بہم نہیں پہنچایا ''۔ سائنس کی کتابوں کے ایک سہ سالہ منصوبے اور اردو رسم خط کی اصلاحی تجاویز کا ذکر کر کے مولوی صاحب نے انجمن کے رسالوں کے متعلق فرمایا کہ ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔ ''سائنس'' تو اپنی نظیر آپ ہے لیکن ''ہماری زبان'' بھی ایک بڑی کمی پوری کرتا ہے اور بہت مقبول ہوتا جاتا ہے ۔

. . . '' یہ پچھلے تین سال کی مختصر سی روداد ہے ۔ ہندستان بھر میں انجمن ترقی اردو ہی ایسا ادارہ ہے جو منظم طور پر تمام ہندستان میں اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور مختلف مقامات پر اس کی شاخیں اسی اصول پر کام کررہی ہیں۔ انجمن کی ترقی اور قوت باہمی تعاون پر ہے . . . اس معاملے میں انجمن '' اشاعت اردو '' ناگ پور کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے کہ اس نے اپنی ہستی کو انجمن ترقی اردو ہند میں ضم کرکے اتحاد و ایثار کی بے نظیر مثال پیش کی ہے۔ پھوٹ نے بہت سے گھر گھالے ہیں۔ عظیم الشان اور جلیل القدر سلطنتوں اور باکار اداروں کو آن کی آن میں بٹھا دیا ہے۔ ہمیں اس سے خبردار رہنا چاہیے کیوں کہ حریف ہماری تاک میں ہے . . . ''

ایک ذیلی مجلس میں ماہرین کے سامنے اصلاح رسم الخط کی بہت سی تجاویز جو انجمن کی طرف سے مرتب ہوئی تھیں، زیر بحث لائی گئیں اور اکثر قابل پسند قرار

پائیں۔ چند اعلیٰ درجے کے ادبی اور تاریخی مقالات پڑھے گئے ۔ زنانہ اجلاس میں بعض خواتین نے پرمغز تقریریں کیں اور بلند پایہ نظمیں سنائیں ۔ کانفرنس کے تیسرے عام اجلاس میں بہت سی مفید قراردادیں منظور ہوئیں جس میں سب سے اہم اور مقدم یہ تحریک تھی کہ ''اردو کی مقبولیت اور صلاحیت کے پیش نظر . . . اس امر کی ضرورت ہے کہ برطانی ہند کے کسی مرکزی مقام میں ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے اور انجمن ترقی اردو ہند سے درخواست ہے کہ وہ اس کے قیام کے امکانات پر غور کرے اور ابتدائی تدابیر عمل میں لائے''۔

ناگ پور کے اس یادگار اجتماع کا اختتام ایک بڑے مشاعرے پر ہوا جس میں حضرت کیفی دہلوی ، محوی لکھنوی ، پروفیسر احتشام لکھنوی ، خمار بارہ بنکوی ، اختر شیرانی ، ماہرالقادری ، عبدالقیوم باقی حیدرآبادی جیسے مشاق سخن وروں کے پہلو بہ پہلو امامی بنگوری ، شعری بھوپالی ، نیز ممتاز مقامی شعرا نے معیاری زبان میں کلام سنا کر داد لی۔

دوسری کئی کانفرنسوں میں ضلع گورکھ پور کے دو اجتماع قابل ذکر ہیں: ایک (برہج بازار) کی صدارت کے لیے پنڈت کیفی صاحب دہلی سے وہاں گئے۔ دوسری (دیوریا) کے صدر رائے گیان ناتھ صاحب تھے ۔ (اپریل ۴۴ع) آیندہ دو تین مہینے میں بستی اور بھاگلپور میں اسی قسم کے نمائندہ جلسے بڑے پیمانے پر منعقد ہوئے اور ان میں ہندو مسلمان سبھی فرقوں نے خوشی خوشی شرکت کی۔ صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع میں اردو کی حمایت کے یہ مظاہرے بہت کچھ انجمن کے سفیر خیر بھوروی صاحب کی سرگرمی کا نتیجہ تھے۔ اپریل ۴۴ع ہی میں ایک بڑی صوبائی کانفرنس کراچی میں بلائی گئی ۔ ہندستان کے دوسرے سرے (کلکتہ) سے جناب عبدالرحمن صاحب صدیقی صدارت کے لیے تشریف لائے۔ جناب مولوی صاحب اور انجمن کے کارکنوں کی شرکت سے یہ اجتماع نہایت کام یاب ہوا۔ جناب پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیم اور داؤد پوتہ صاحب ناظم تعلیم کی سرگرم اعانت سے صوبہ سندھ کے ابتدائی اور وسطانی مدارس میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ انجمن ترقی اردو نے ایک خاص مرکز سندھ میں قائم کیا ۔

شاخیں اور مرکز

اردو اور انجمن سے بعض مخالفتوں کا تذکرہ سنانے سے پہلے اس کے ایک اور

تبلیغی پہلو پر نظر ڈال جانی مناسب ہے۔ اورنگ آباد ہی کے دور میں مرکزی انجمن کی مقامی شاخیں قائم کی جانے لگی تھیں۔ علی گڑھ کانفرنس، دهلی میں منتقلی اور جناب مولوی صاحب کے طویل دوروں کے بعد یہ سلسلہ بڑی سرعت سے پھیلا۔ ممالک ھند کے ھر حصے میں کثرت سے شاخیں قائم ھوئیں۔ صدر انجمن سے الحاق کی فیس صرف ایک روپیہ تھی اور بارہ روپے سال رکن خریدار بننے کے لیے دینے ھوتے تھے جس کے عوض میں انجمن پندرہ روپے قیمت کی مطبوعات دیا کرتی تھی۔ ان آسان شرطوں سے ابتدای جوش خروش کے زمانے میں سینکڑوں شاخیں بن گئیں۔ سنہ ۴۰ و ۴۱ء میں ان کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ اور انجمن کے مدارس ستر کے قریب ھوگئے تھے۔ لیکن سنہ ۴۴ء میں نئے قواعد کا نفاذ ھوا۔ اور ھر شاخ کے لیے دارالمطالعہ یا کوئی آردو مدرسہ قائم کرنا، نیز سہ ماھی کارگزاری صدر دفتر کو بھیجنا لازمی کردیا گیا۔ ایک بستی میں ایک ھی شاخ اور اس میں کم سے کم پچیس چندہ دینے والے ارکان کی شرکت ضروری تھی۔ الحاق کی فیس اور انجمن کی طرف سے کتابوں کی رعایت بدستور رھی لیکن جدید قواعد کی اکثر شاخیں پابندی نہ کرسکیں البتہ جو باقی رھیں وہ حقیقت میں کارگزار و باکار تھیں۔ دهلی کا دور ختم ھونے تک ان کی تعداد ستر اور انجمن کے امدادی مدارس بیس کے قریب تھے جن کی کیفیت باقاعدہ وصول ھوتی اور ھماری زبان میں شائع کی جاتی رھتی تھی۔ سب سے مضبوط اور بڑی شاخ بلدہ حیدرآباد میں سرسبز ھوئی جس کے صدر اکبر یار جنگ اور سکریٹری ایک پارسی فاضل کیقباد جنگ تھے۔ علی شبر صاحب حاتمی نے پہلے بڑا شبینہ مدرسہ چلایا تھا پھر گشتی کتب خانہ قائم کیا جس میں آخر سال ۴۶ء تک سات ھزار آردو کتابیں جمع ھوگئی تھیں اور وہ شہر میں نہایت مقبول ھوگیا تھا۔

صدر انجمن کی براہ راست نگرانی میں ھندستان کے مشرق اور مغربی سرے پر دو آردو مرکز قائم کئے گئے جن کا اوپر سرسری ذکر آ چکا ہے۔ کراچی کی شاخ انجمن جناب مولوی صاحب کے سکریٹری منتخب ھونے کے بعد ھی ۱۹۱۳ء میں قائم ھوگئی تھی مگر اس میں سیٹھ فدا علی علی بھائی کی مالی اعانت سے ۱۹۲۳ء میں نئی جان پڑی۔ انھی کے گراں قدر عطیہ (ڈھای ھزار روپے) سے کراچی کی انجمن ترقی آردو کا کتب خانہ وجود میں آیا۔ سنہ ۲۷ء میں منظور احمد صاحب افسر صدیقی امرو ھے سے کراچی آئے اور شعر و سخن کی محفل گرما دی۔ کئی سال شاخ انجمن کے سکریٹری

رہے۔ دھوم دھام سے مشاعرے کیا کرتے تھے۔ سنہ ۴۰ء میں بست و پنجم ("نقرئی") سالگرہ منائی اور انجمن کی مفصل باتصویر روداد چھپوائی تھی۔ انجمن کے صدر نشینوں میں سر عبداللہ ہارون، مسٹر حاتم علوی، خان صاحب فضل الٰہی جیسے روشناس حضرات کے نام تحریر ہیں۔ دوسری طرف ہندی زبان کے حامی بھی اردو کی مخالفت اور ہندی کی اشاعت میں سر گرم کار تھے۔ یکم نومبر ۱۹۳۹ء کے ہماری زبان میں روز نامہ حیات، کراچی کا ایک مضمون نقل کیا گیا ہے جس سے ان کوششوں کی گہرائی اور وسعت کا پتہ چل سکتا ہے۔ سال آیندہ چالاکی سے سندھی کو اردو کا مد مقابل بنانے کی تدبیر کی گئی تھی مگر غالباً ہماری زبان کے فوری مواخذے نے اس فتنے کو سر اٹھانے نہ دیا۔ سنہ ۴۱ء میں کاکا کالیلکر صاحب نے بھی "دھوئیں کی آڑ" میں سندھ پر حملہ کیا۔ لیکن اب مسلم لیگ کے وزرا چوکنے ہوگئے تھے اور کانگریسی حملوں کی روک تھام ہونے لگی تھی۔ آخر اردو کانفرنس ۴۴ء اور مرکز اردو کے قیام نے مصنوعی ہندی کے خطرے کا پورا سدباب کیا۔ مرکز کو حامد علی صاحب ندوی جیسا ذہین و مستعد مہتمم مل گیا تھا۔ جگہ جگہ شاخیں کھولی گئیں۔ مدارس اور دارالمطالعے بنائے گئے۔ کارکنوں نے دورے اور جلسے کر کے قومی زبان کا چرچا پھیلایا۔ صوبائی حکومت نے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اردو کی تعلیم لازمی کردی۔ انجمن ترقی اردو کی مدد سے درسی کتابیں تیار کرائی گئیں۔ تقسیم ہند سے ٹھیک ایک سال پہلے کراچی میں ایک اور شان دار صوبائی کانفرنس منعقد ہوئی (ستمبر ۴۶ء) جس کا افتتاح جناب مولوی صاحب نے اور صدارت چودھری خلیق الزمان صاحب نے فرمائی۔

لیکن سندھ مرکز کے قیام سے کہیں زیادہ دشوار و اہم مہم وہ تھی جو ہندستان کے دور دست اور غیر آباد علاقے چھوٹا ناگ پور میں چلائی گئی۔ سنہ ۴۱ء کی سالانہ کیفیت میں مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "جون ۴۱ء میں انجمن کی طرف سے ایک اولوالعزم اور انقلابی طریق کار زبان کی اشاعت کے سلسلے میں اختیار کیا گیا۔ انجمن نے طے کیا کہ ہندستان کی قدیم اقوام کو اردو سے آشنا کیا جائے۔ اس کے لیے جنوبی بہار کا انتخاب کیا گیا۔ اس خطے میں ہو، منڈا، کھڑیا اور اراؤں قومیں بستی ہیں۔ رانچی کو مرکز بنا کر ان اقوام کو اردو سیکھنے کی طرف راغب کرنا شروع کیا۔ انجمن کی یہ تحریک ابتدا ہی سے غیر معمولی کام یابی سے ہم کنار

ہوئی جس پر انجمن کو بجا طور پر فخر ہے۔ ان قدیم اقوام کے گانوؤں سے مدرسین اور مدارس کی اتنی مانگ بڑھتی جاتی ہے کہ انجمن اپنے محدود ذرائع آمدنی کے سبب پورا کرنے سے قاصر ہے۔ ان اقوام کے بچے اور بچیاں اس قدر کم مدت میں اردو پڑھنے اور لکھنے پر قادر ہوجاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔۔۔۔،،۔

حقیقت میں ایسی جنگلی قومیں جنہوں نے اردو کا پہلے کوئی لفظ بھی نہ سنا ہوگا اور جن کی اپنی بولیاں ہندستان کی مروجہ زبانوں سے مناسبت کا کوئی رشتہ نہ رکھتی تھیں، ان میں اردو کا تعارف سخت بنجر توڑنے اور پہاڑی زمین میں باغ و خیابان تیار کرنے سے کم نہ تھا۔ مارچ میں جناب مولوی صاحب نے اس علاقے کا دورہ کیا۔ ان دیہات اور جنگلوں میں تمدن کی دنیا سے پادریوں کے سوا اور کوئی شخص اپنی خوشی سے نہ جاتا تھا۔ البتہ رومن کیتھولک مشنری تقریباً دو سو سال سے ان جنگلی قوموں میں اپنا دین پھیلارہے تھے۔ ان کے بہت سے مدرسے، گرجے ہسپتال بنے ہوئے تھے۔ رانچی میں بڑا اسقف (،،لارڈ بشپ،،) رہا کرتا تھا۔ جناب مولوی صاحب اردو کی تبلیغ کے لیے پہنچے تو پادریوں کو اول اول بدظنی پیدا ہوئی کیوں کہ کچھ پہلے آریہ سماجیوں نے یہاں مذہب کا ہنگامہ مچایا اور تفرقہ پھیلایا تھا۔ لیکن بعد میں وہ انجمن ترقی اردو کی صداقت اور سلامت روی کے نہ صرف قائل ہوگئے بلکہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، جناب مولوی صاحب کا مذہب قبول کرلیا اور خود اپنی مدرسوں میں اردو کی تعلیم لازمی کردی۔ دو تین سال بعد ہی مولوی صاحب نے ان علاقوں کا پھر دورہ کیا تو یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوے کہ انجمن کے مدرسوں سے کہیں زیادہ تعداد مسیحی مدارس میں اردو لکھتی پڑھتی ہے۔ حتیٰ کہ ان کی لڑکیوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے جو میٹرک پڑھ کر پٹنہ کے زنانہ کالج میں داخل ہوتی تھیں، خود اس کالج میں اردو تعلیم کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ جیسا کہ انجمن کی مطبوعہ سالانہ کیفیتوں سے معلوم ہوتا ہے، اردو پڑھنے والوں کی تعداد کا سالانہ اوسط سات سو ہوگیا تھا، جو اس غیر آباد خطے میں یقیناً حیرت انگیز ہے۔ پڑھنے والوں کی زیادہ تعداد عیسای بچوں اور خود پادریوں اور ننوں پر مشتمل تھی۔ اشاعت زبان کے اس قابل قدر کام کی عملی کام یابی کا سہرا رانچی مرکز کے لایق اور مخلص مہتمم جناب سہیل عظیم آبادی کے سر تھا جو ہر سہ ماہی پر پابندی سے کارگزاری کی اطلاعیں انجمن کے صدر دفتر کو بھیجتے رہتے تھے۔ مرکز نے جس

طرح کام کیا اور جیسے کچھ نشیب و فراز دیکھے ؛ ان کی تفصیل دلچسپ ہے مگر ایک جداگانہ کتاب چاہتی ہے - دعلی دور کی آخری مطبوعہ رپورٹ ، بابت ۴۶ع سے ہم سہیل صاحب کی مرسلہ کارگزاری کا مختصر سا خلاصہ لکھ دیتے ہیں جس میں گذشتہ سنین پر بھی سرسری تبصرہ آگیا ہے :

,, چھوٹا ناگ پور اردو مرکز نے دسمبر ۱۹۴۶ع میں اپنی زندگی کے ساڑھے پانچ سال پورے کئے . . . باوجود بےشمار دشواریوں کے چھوٹا ناگ پور اردو مرکز اپنے وجود کو قائم رکھنے میں کامیاب رہا اور اپنی سرگرمیوں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دی - اس سلسلے میں حد درجے احسان فراموشی ہوگی اگر ہم یہ اقرار نہ کریں کہ ہر مشکل میں ہمارے مخدوم بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب قبلہ نے ہماری ہمت بندھای ، حوصلہ بڑھایا اور انہی کی ہدایتوں کے سہارے ہم نئے حوصلوں کے ساتھ کام کرنے لگے - . . . . . ہم نے ۱۹۴۱ع میں جو کام شروع کیا تھا ، وسط ۴۲ع تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا - ہمارے شبینہ مدرسوں میں پڑھنے والوں کی تعداد اور شوق تعلیم برابر بڑھتا رہا - لیکن ۴۲ کے اواخر میں رانچی جنگی اور فوجی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور شہری زندگی میں تیزی سے تبدیلی ہونے لگی - ۴۳ع میں ہم کوی ایسا کام نہ کر سکے جو لایق بیان ہو - البتہ جو مدرسے بن چکے تھے انہیں چلاتے رہے - لیکن ان میں بھی پڑھنے والے یکایک غائب ہوجاتے اور فوجی محکموں میں نوکر ہوکر چل دیتے تھے - تب ہم نے شہروں کو چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا اور یہی صحیح طریق کار تھا جس سے نہ صرف مرکز قائم رہا بلکہ بہت کچھ کام بھی ہوا - ۴۴ع میں پورا شہر بلکہ سارا ضلع فوجیوں سے بھر گیا . . . . لوگوں کی پریشانی اور اشیا کی گرانی اتنی بڑھی کہ شبینہ مدارس ایک طرف ہای اسکول کے لڑکے تعلیم چھوڑ کر نوکریاں کرنے پر مجبور ہوئے - ساری زندگی جنگ اور تجارت ، دو لفظوں میں سمٹ کر رہ گئی ! . . . . ۴۵ع اور بھی صبر آزما سال ثابت ہوا - شہری مدرسے بند کرنے پڑے - تاہم دیہات کے مدارس کو جس طرح ہوسکا ، چلایا اور کہیں کہیں ترقی دی - جیسے موضع اربا کا اسکول جو ابتدای سے نیم ثانوی بنا لیا گیا . . . . مشن کے مدارس کی بھی حالت کچھ بہتر نہ تھی اور پڑھنے والے ہوں بھی تو پڑھانے والے میسر نہ تھے - ایک خانقاہ

(کون وینٹ) میں سولہ ننوں نے اردو مڈل کا امتحان دیا ۔ چوں کہ بچاریوں کی پڑھای ٹھیک نہ ہو سکی تھی ، صرف پانچ کام یاب ہو سکیں ۔ جو امتحان میں ناکام رہیں ، ان میں سے کئی خوب روئیں ۔

رانچی سے تیس میل قصبہ کھونٹی کا ابتدای ڈسٹرکٹ بورڈ کا مدرسہ مرکز نے اپنی نگرانی میں لے کر چلایا مگر زیادہ ترقی نہ کر سکا کیوں کہ مشن کے دو تین مدرسے اور ایک ھای اسکول پہلے سے موجود تھے ۔ آخر الذکر میں بھی مرکز کی کوشش سے اردو تعلیم کا انتظام کر دیا گیا تھا ۔ کرماتار میں مرکز کے اعلیٰ ابتدای مدرسے نے ترقی کی ۔ مسلمان لڑکے جو بنگالی پڑھا کرتے تھے ، اکثر اردو پڑھنے لگے ۔ کالکے سب عیسای بچوں نے اپنے مشن کے مدرسے میں اردو پڑھنی شروع کردی ۔ آدی باسی مدرسوں میں بھی بچے اردو پڑھنے کا شوق رکھتے تھے ۔ روپے اور معلموں کی کمی سے مرکز جیسا چاهتا تھا تعلیم کا انتظام نہ کر سکا . . . . ۱۹۴۶ء میں نئے انتخابات پھر سیاسی فسادات اور خون ریزی نے ساری فضا خراب کردی تھی ۔ تاهم سب اردو مدرسے کام یابی کے ساتھ چلتے رہے ۔ مرکز کے آربا اسکول کے سات لڑکوں نے مڈل کا امتحان دیا اور سب امتیاز کے ساتھ کام یاب ھوے ، جس کا اچھا اثر محکمہ تعلیم پر بھی پڑا :

> ”جن حالات میں مہتمم مرکز کو کام کرتے رهنا پڑا (ان کا اندازہ اس طرح ھو سکتا ھے کہ) جن دنوں میں امتحانات کی تیاریاں ھورهی تھیں تو مہتمم مرکز کا سارا گھر بہار کے هنگاموں کی نذر ھوگیا ، پھر بھی وہ اپنے فرایض کو نہیں بھولا اور شبانہ روز (چھوٹا ناگ پور میں) کام کرتا رها “ ۔ ۱۹۴۶ء میں اردو مرکز کے مدرسوں کا اندازہ ذیل کے نقشے سے ھوگا :

آربا مڈل اسکول	۱۰۷ (هندو ، مسلم ، آدی باسی)
کرماتار	۷۶ مسلمان
کھونٹی	۳۴ مسلمان
هسل	۳۶ هندو مسلم آدی باسی
وینکیل	۵۶ عیسای
سملت آدی باسی اسکول	۱۳۴ آدی باسی
سملت مشن اسکول	۱۱۳ عیسای اور مسلمان

میزان طلبہ ۵۵۵

اس نقشے میں وہ پڑھنے والے شامل نہیں جو آردو مرکز کی تحریک سے متاثر ہو کر (مشن کے مدارس میں) آردو پڑھنے لگے تھے ، ان کی سالانہ اوسط ڈیڑھ سو کے قریب تھی -

اُردو کالج اور معیاری امتحانات

پنجاب یونیورسٹی میں السنہ مشرقیہ کے مختلف امتحانات ہوتے اور سندیں دی جاتی ہیں لیکن ان کی تعلیم کا سرکاری انتظام نہیں ہے - لوگ اپنے طور پر نصاب کی کتابیں پڑھتے اور امتحانات میں شرکت کرتے ہیں - مدرسوں میں معلمی کے لیے ان کی سند تسلیم کی جاتی ہے ، لہذا وہ خاصے مقبول رہے ہیں - بعض صاحبوں نے جماعتیں بنا کے طلبہ کو تیار کرنے کی بھی راہ نکالی مگر عموماً یہ ذاتی کوششیں دیرپا ثابت نہیں ہوئیں - سید اخلاق احمد صاحب دہلوی نے انجمن کی سرپرستی میں ایک "آردو کالج" ۱۹۴۰ء میں قائم کیا جس میں رات کے اوقات میں ان امتحانات خصوصاً (آردو ادیب ، فاضل ، عالم) کی تعلیم بہت معمولی آجرت پر دی جاتی تھی - پنڈت کیفی صاحب اعزازی صدر تھے - ان کی توجہ اور اخلاق صاحب کی تن دہی سے چند سال میں یہ کالج کافی ترقی کر گیا اور طلبہ کا اوسط پچاس سے زیادہ ہو گیا - لائق آستادوں کی فراہمی سے نتائج بھی عموماً اچھے رہتے تھے - تعلیم کے لیے اینگلو عربک کالج نے اپنے چند کمرے دے دئے تھے - امتحانات کی تیاری کے علاوہ اس کالج کے طلبہ میں آردو کی خدمت اور ادب کا ذوق نشو و نما پاتا تھا - ہر سال کسی مشہور ادیب یا شاعر کا "یوم" منایا جانے لگا تھا اور اس کی بزم ادب کے جلسوں میں شہر کے ممتاز افراد شرکت کرتے تھے -

۱۹۴۵ء میں خود صدر دفتر نے آردو کی تعلیم و اشاعت کا ایک اور کام اپنے ذمے لیا - یہ تین "معیاری امتحانات" (واقف آردو ، قابل آردو ، فاضل آردو) کا انتظام تھا جن کا نصاب اور قواعد اسی سال شایع کر دیے گئے - دسمبر تک ۵۰ آمیدواروں کی درخواستیں وصول ہوئیں اور ان کے امتحانات فروری ۱۹۴۶ء میں سات مرکزوں میں لیے گئے جن میں بٹالہ ، ٹونک ، کالی کٹ ، نرسی (ریاست حیدر آباد) کے نام قابل ذکر ہیں - آیندہ سال یہ سلسلہ بہت سرعت سے ترقی کرنے والا تھا کہ آزادی اور تقسیم ہند کے مژدے کے ساتھ ملک میں خانہ جنگی کے نقارے بجنے لگے ، ترقی کی زبان بند ہو گئی -

مخالفین اُردو کی کارستانیاں ریاستوں میں

مصنوعی هندی کی فرقہ واری تحریک هندو ریاستوں میں سرائت کر گئی تھی جس نے عملی سیاسی وطنی ، غرض کئی اعتبار سے بہت مضر نتائج پیدا کئے بعض والیان ریاست کا علانیہ هندو فرقہ پرستوں کے گروہ میں نمودار هونا ، هندستان کے ایک قومی نظریئے کی بدیہی تردید تھی جس نے مسلمانوں کو عموماً اپنے هندو هم وطنوں سے سخت بدگمان و بیزار کیا ۔ فرقہ پرستی کا یہ زہر برطانی هند سے انگریزوں کے تربیت‌یافتہ حضرات هی ریاستوں میں لے گئے تھے - ۱۹۱۰ء میں پنڈت مدن موهن مالوی نے الور کے راجہ جے سنگھ کو سکھا پڑھا کر اس ریاست میں هندی جاری کرای حال‌آں‌کہ اٹھارویں صدی میں یہ ریاست محض چند مسلمان رفیقوں کی دوستی اور مدد سے وجود میں آی اور هنگامہ ۵۷ کے بعد تک انهی کے تہذیب و تمدن کے زیراثر تھی - یہ راجہ اپنی گندی فطرت کے باعث بدنام هوا اور غالباً عقلی توازن کھو بیٹھا کہ ۳۳ء میں انگریزوں نے اسے معزول کردیا ۔ بہرحال ، پنڈت مالوی جو انچھر کان میں پھونک گئے تھے وہ راجہ کو یاد رهے اور باخبر حضرات کا بیان هے کہ اپنی راجگی میں اسی کی ترغیب یا تقلید سے بھرت پور کے راجہ نے بھی اپنی ریاست میں آردو کی بجاے هندی کو رواج دیا (۱۹۲۰) - برابر کی ریاست دھول پور میں یہ تبدیلی (گوالیار) کے دباو سے ۱۹۲۹ء میں هوی - یہاں کا ایک سکرٹری مولی چند شرما مشہور هے جس نے فارسی میں ایم اے پاس کیا - آردو کی قابلیت کی وجہ سے بھی قدر و منزلت حاصل کی پھر ساری عمر اسی محسنہ کی تخریب میں جد و جہد کرتا رها - هماری معلومات بیش‌تر " جایزہ زبان آردو " (حصہ اول) سے ماخوذ هیں جسے جناب مولوی صاحب نے خاص اهتمام سے مرتب کرایا تھا - اسی کتاب میں لکھا هے (ص ۲۲۳) کہ مہاراجہ بیکانیر کی سال‌گرہ ۱۹۱۲ء کے موقع پر پنڈت مالوی نے سر دربار درخواست کی تھی کہ میں بہ‌حیثیت برهمن بھیک مانگتا هوں - میری دکشنا یہ هے کہ آردو کو هندی سے تبدیل کردیا جاے " - پنڈت جی اور آن کے هم‌نوا اسی طرح اکثر هندو ریاستوں میں مذهبی هت‌کھنڈوں سے کام لیتے اور کام‌یاب هوتے رهے - آردو والوں کی طرف سے کسی بڑے

پیمانے پر مزاحمت کا سراغ نہیں ملتا البتہ قریب‌تر زمانے میں انجمن ترقی آردو نے کئی بڑی بڑی ریاستوں میں اس کے حفظ و بقا کی جس قدر ممکن تھی، کوشش کی ۔ ان کوششوں کا مختصر حال کتاب کی گنجایش کے مطابق ہر جگہ کی اہمیت کے لحاظ سے ذیل میں ترتیب دیا جاتا ہے :-

۱ ۔ پٹیالہ ۔ اس ریاست میں پہلے فارسی پھر آردو سرکاری زبان رہی ۔ ۱۹۴۳ع میں یہاں کے محکمۂ مال نے اعلان کیا کہ آیندہ آردو کی بجاے گرمکھی یا انگریزی کا استعمال کیا جاے گا ۔ گرمکھی تحریر سکھ "تہذیب" کا مرقع کہی جاتی ہے ۔ لیکن باشندوں کی اکثریت غیر سکھ تھی، وہ اس پریشان صورت تحریر کا تداخل سن کر بہت پریشان ہوے ۔ اخبار ہماری زبان (یکم مئی ۴۳ء) میں احتجاج کیا گیا ۔ مگر ارباب اقتدار پر شاید آلٹا اثر ہوا کہ فروری ۴۴ع میں مہاراجہ بہادر کا یہ حکم "چیف جسٹس" پٹیالہ اسٹیٹ کے دستخط سے شایع کیا گیا کہ آیندہ عدالتوں میں آردو کی جگہ "گرمکھی بہ طور ورنیکلر استعمال ہوگی" ۔ ہماری زبان نے اس حکم کی "نقل مطابق اصل" چھاپ کر فاضل جج صاحب کو متوجہ کیا کہ گرمکھی رسم خط کا نام ہے اسے دیسی زبان کی طرح استعمال کرنے کا کیا مطلب ہوا ؟ دوسرے اخباروں میں خوب مذاق آڑایا گیا ۔ چناں‌چہ وہ "حکم" ملتوی کیے جانے کا حکم صادر ہوا ۔ مگر ۴۵ع سے ریاست کی سرکاری زبان پنجابی، رسم خط گرمکھی قرار دے دیا گیا ۔ تین ماہ بعد نابھے میں بھی یہی سکھا شاہی حکم وہاں کے راجہ نے نافذ کردیا ۔

۲ ۔ گوالیار ۔ گوالیار کے مرہٹہ راجہ نے پٹیالے کے سکھوں سے بھی زیادہ بدمذاقی کا مظاہرہ کیا ۔ یہاں الہ‌آباد یونی‌ورسٹی کے لایق پروفیسر (نیز وائس چانسلر) پنڈت امر ناتھ جھا تشریف لاے اور ستمبر ۳۹ع میں خاص راجہ کے محل میں ایک مذہبی تقریب پر وعظ کہا کہ ہندوؤں کو سنسکرتی ہندی اختیار کرنی لازم ہے ۔ گوالیار کے سندھیا خاندان کا مسلمان پیروں سے حسن اعتقاد مشہور تھا مگر نیا راجہ بہت متعصب، خفیف العقل بتایا جاتا ہے ۔ اگلے ہی مہینے حکم یا اعلان کی بجاے دربار گوالیار سے دیوناگری میں "اورگھوسڑا" شائع ہوا جس کی "ہندی" معمولی سنسکرت داں آستادوں کی بھی سمجھ میں نہ آتی تھی (دیکھو اخبار ہماری زبان، ۱۶ نومبر ۳۹ع) مغل بادشاہوں کا دیا ہوا لقب "عالی‌جاہ" سرکاری کاغذوں کی

پیشانی پر چھاپا جاتا تھا - لقب تو باقی رہا مگر نفیس طغرے کی بجائے دیوناگری حروف کندہ کرادئے گئے - گوالیار کو آردو سے ایک اور خصوصیت رہی تھی - وہ یہ کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ع سے بھی پہلے یہاں کی سرکاری زبان فارسی کی بجائے آردو بنائی گئی اور اس میں غالباً سب سے پہلا سرکاری گزٹ ۱۸۵۲ع میں یہیں سے چھپنا شروع ہوا تھا - زبان کی ایکا ایکی تبدیلی عام طور پر اعتدال پسندوں نے پسند نہیں کی - انجمن ترقی آردو نے بار بار احتجاج کیا - جنوری ۱۹۴۱ع میں ایک آردو کانفرنس جناب مولوی صاحب کی صدارت میں گوالیار میں منعقد ہوی لیکن راجہ نے عقل و مصلحت کی آنکھیں بند کرایں - ریاست والوں نے جھوٹے سچے وعدوں کے باوجود ۴۳ میں نیا ضابطہ فوجداری آسی مصنوعی ہندی میں چھاپ کر نافذ کردیا جسے عام ہندو مسلمان کوی بھی نہ سمجھ سکتا تھا - اس مجموعے کا نام " اپرادھ سم بندھی ودھیکا سنگرہ، گوالیر راجیہ " تھا - لوگوں کے شور مچانے پر نومبر ۴۴ع میں مہاراج کا ایک اور قطعی اعلان شایع ہوا کہ اب آردو کی بجائے گوالیار میں یہی ہندی یا انگریز کی زبان چلای جائے گی (۱) !

۳ - کشمیر — ہندو فرقہ پرستوں کو گاندھی جی کے پرشد سے بڑی قوت پہنچ گئی تھی کہ نہ صرف اپنی اکثریت بلکہ اقلیت کے علاقوں میں بھی وطن پرستی کے نام سے ہندی چلانی چاہتے تھے اور درپردہ آردو کے استیصال سے دل ٹھنڈا کرنا منظور تھا - کشمیر کی ریاست صدیوں سے فارسی کے حلقۂ اثر میں رہی اور وہاں کے پہلے دو ڈوگرہ رئیس بھی اسی زبان کے دلدادہ بتائے جاتے ہیں - راجہ پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۵ع میں فارسی کی بجائے آردو کو سرکاری زبان بنایا اور زیر نظر زمانے میں وہاں کی ساری تعلیمیافتہ اور شہری آبادی اسی سے کام لیتی تھی جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ضمناً بیان ہوا ہے - بایں ہمہ ۹۳۰ع میں فرقہ پرستی کی بلا چور دروازے سے داخل

---

(۱) اس عجیب و غریب ضابطہ فوجداری کے ناقابل فہم ہونے پر ایک وفد بھی مہاراجہ اور متعلقہ حکام کے پاس گیا جس میں زیادہتر ہندو وکیل، زمیندار، مزدور سبھا کے نمائندے شامل تھے درخواست میں التجا کی گئی تھی کہ "عدالتوں اور دفتروں میں سہل زبان کو بحال رکھا جائے - ہماری یہ درخواست ثابت ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت رعایا کے تمام طبقوں کی طرف سے ہے " - مگر قبولیت سے محروم رہی - (ہماری زبان ۱۶ اگست ۴۳)

ہوی ۔ سرکاری اسٹامپ ، پھر ڈاک کے ٹکٹوں پر دیوناگری حروف چھاپ دئے گئے ۔ انجمن ترقی اردو نے فوراً اس بدعت پر گرفت کی اور بار بار اہل کشمیر کو (اخبار ہماری زبان کے ذریعے) خبردار کرنا شروع کیا ۔ ادھر ہندی والوں نے ایک مسلمان مہتمم تعلیم (علاقہ جموں) کے دستخط سے یہ حکم جاری کرایا کہ فی الحال ایک سال کے لئے دو ابتدای مدرسوں میں ہندی کی تعلیم کا انتظام تجربتہً کیا جاے گا کیوں کہ ہندو آبادی کا ایک بڑا گروہ (خصوصاً لڑکیوں کو) ہندی میں تعلیم دلوانا چاہتا ہے ۔ جناب مولوی صاحب نے خود کشمیر جا کر اس لسانی فتنے کے سدباب کی کوشش کی ۔ کشمیر میں انجمن کی ایک مرکزی شاخ بنای گئی ۔ بہت سے فاضل پنڈت جن کی عزیز مادری زبان اردو تھی ان مساعی میں معین و شریک رہے ۔ اگلے سال شیخ عبداللہ صاحب بانئی نیشنل کانفرنس نے جموں کے عام جلسے میں حکومت کے اس اقدام کو خطرناک تفرقہ قرار دیا ۔ انہوں نے کہا :

> " اگر محض اس لیے کہ اکثر مسلمانوں کی زبان اردو ہے ، اسے غیر ملکی قرار دیا گیا ، تو پھر مسلم لیگ کا نعرۂ پاکستان غلط نہیں ہے ۔ . . . کشمیر میں ننانوے فی صدی باشندوں کی مشترکہ زبان اور رسم خط اردو ہے اور اسی کو سرکاری رہنا چاہیے ۔ جو لوگ ہندی پڑھنا چاہتے ہیں آپ شوق سے ان کی تعلیم کا انتظام کردیجئے لیکن اسے آپ سرکاری یا تعلیمی زبان نہیں بنا سکتے . . . " (تقریر ۳ نومبر ۴۰ء)

دیوان ریاست مسٹر آئنگار نے ایک کمیٹی بھی مقرر کی تھی اور اس نے یہی راے دی کہ کشمیر میں دو دو زبانیں یا دو رسم خط جاری کرنا مضر ہوگا ۔ تاہم یہ فساد انگیز تحریک چلتی رہی بلکہ رام چندر کاک نے اس کی وکالت سے شہرت و رسوخ حاصل کیا ۔ یہ پنڈت جی خود ہندی نہیں جانتے تھے مگر بنارس ، الہ آباد جا جا کے ہندی کی انجمنوں میں پرجوش تقریر کرتے تھے ۔ ادھر کشمیر میں سیاسی حقوق کے مطالبے نے ڈوگرہ راجہ کو فرقہ پرستوں کی مدد کا محتاج بنا دیا تھا ۔ کاک اچھل کر دیوان کی کرسی تک پہنچے اور نیشنل کانفرنس کو دبانے کے ساتھ ہندی کو چلانے کی بھی کچھ خفیہ کچھ علانیہ تدبیریں کرتے رہے ۔ زبان کا قضیہ وہاں کی عام سیاسی تحریک کے شاخسانوں میں الجھ گیا ، تاہم انجمن اور اس کی شاخ اور ہم نوا حضرات کی

مسلسل مزاحمت سے ریاست کشمیر ,,هندی،، کو اپنی سرکاری زبان نہیں بناسکی البتہ اپنے کم زور مسلمان ڈائرکٹر تعلیم کی مدد سے آسان آردو کے پردے میں سنسکرتی الفاظ چلانے کی ریشہ دوانیاں کرتی رهی - (۱)

(۴) جے پور - انجمن کو سب سے سخت معرکہ ریاست جے پور میں سر مرزا اسمعیل سے لڑنا پڑا - یہ صاحب فارسی نژاد ، راجہ میسور کے هاں پرورش پائے هوئے هیں اسی مربی نے دبیر و وزیر کے رتبے تک بڑھایا تھا مگر وهاں نیابتی حکومت بنی تو مرزا صاحب نہ رہ سکے- البتہ انگریزوں کی دست گیری سے جے پور کے دیوان بنا لیے گئے (۱۹۴۲ع) - ان دنوں انگریز عالم گیر جنگ کی مصیبت میں گرفتار تھے اور هندوستان کے سیاسی فرقوں میں آیندہ اقتدار کی سخت کشمکش هو رهی تھی - گاندھی جی کے سابقہ اقدام نے زبان کے مسئلے کو سیاسی خانہ جنگی کا جز بنا دیا تھا - ریاست جے پور دهلی اور اجمیر کے درمیان مغل تہذیب کی وسطی منزل تھی، وهاں اس معرکے نے مرزا اسمعیل کے زمانے میں بڑی ناگوار شکل اختیار کرلی - جناب مولوی صاحب نے اس باب میں مختلف بیانات کے بعد ایک رسالہ شائع کیا تھا - یہ ۱۶ مئی سنہ ۱۹۴۳ع کے اخبار هماری زبان میں بھی چھپا اور ذیل میں هم اسی کا ملخص پیش کرتے هیں : —

”ریاست جے پور راج پوتانے کی سب سے بڑی ریاست هے . . . جہاں تک فارسی اور اس کے بعد آردو زبان کا تعلق هے بلا خوف تردید کہا جاسکتا هے کہ جے پور هی وہ مقام هے جہاں سے آردو زبان پورے راج پوتانے میں پھیلی اور یہاں تک پھیلی کہ اس نے عام طور پر مادری اور علمی زبان کا مرتبہ حاصل کرلیا . . . انیسویں صدی کے آخری دنوں میں فرقہ پرستی کا جو زهر برطانوی هند میں پھیلا ، ان میں ایک ”آردو هندی،، کا جھگڑا بھی تھا - برطانوی هند میں یہ قضیہ وهاں سے شروع هوا ، جہاں سب سے پہلے (انگریز) کمپنی کو حاکمانہ حیثیت حاصل هوئی تھی -

---

(۱) هماری زبان میں ان سازشوں کی برابر قلعی کھولی جاتی رهی - ایک مضمون خود جناب مولوی صاحب نے ”کشمیر کے مدارس میں آسان آردو،، کے عنوان سے لکھا اور حکومت کی چالاکیوں کا پردہ چاک کیا تھا - (هماری زبان - ۱۶ جون ، ۱۹۴۳ع)

یہ تھی سرزمین بنگال و بہار۔ ....۔ جے پور میں ابتداءً تمام ہندستان کی طرح فارسی زبان دفتروں میں رائج تھی۔ ۱۸۶۵ء میں مہاراجہ رام سنگھ نے تنظیم جدید کی اور اندازہ لگالیا کہ ریاست بھر، بلکہ ملک بھر میں جو زبان آسانی کے ساتھ سمجھی اور بولی جاسکتی ہے، وہ آردو زبان ہے تو فارسی کے بجائے آردو کو دفتری اور سرکاری زبان قرار دیا۔ اگرچہ اس وقت بھی ریاست میں راجستانی بولیاں زیادہ بولی جاتی تھیں، ہندی کا قضیہ بھی برطانی ہند میں پیدا ہوچکا تھا۔ مہاراجہ کے لیے کوئی امر مانع نہ تھا کہ وہ راجستانی یا ہندی کو اختیار کر لیتے مگر آسانی کے ساتھ سارے ملک میں جو زبان استعمال ہوسکتی تھی، انہوں نے اسی کو پسند کیا۔ اور اس معیار پر آج بھی جے پور میں آردو کے سوا کوئی زبان پوری نہیں آترتی۔ ....

۱۸۸۰ء سے حامیان ہندی نے ریاست جےپور میں آردو کے خلاف کام شروع کیا۔ یہ بلاشبہ جے پور کے باشندے نہیں بلکہ وہ لوگ تھے جو برطانوی ہند سے فرقہ واری ذہنیت لیے ہوئے آئے اور معاشی وجوہ کی بنا پر یہاں رہ پڑے تھے۔ اس مفسدانہ کوشش کے گویا جواب میں ریاست کی طرف سے ۱۸۸۴ء میں یہ حکم‌جاری ہوا کہ ”عدالتوں میں آردو بہت صاف اور شستہ لکھی جائے۔ عربی فارسی اور انگریزی کے نامانوس الفاظ بالکل نہ لکھےجاویں“ اس‌حکم کا نتیجہ نکلا کہ دفاتر میں زبان کی سلاست اور صفائی پر خاص توجہ کی جانے لگی۔ ادھر شہر میں آردو شعرا اور ادبا کی چہل پہل، ادھر دربار کی طرف سے سرکاری زبان کی شستگی کا یہ اہتمام، غرض جےپور، دلّی بن گیا اور فی الواقع راج پوتانے میں مدتوں تک ”چھوٹی دلّی“ کہلاتا رہا .... ۱۹۲۱ء میں جب کہ مہاراجہ مادھوسنگھ کے انتقال پر انتظامات ایک کونسل (= مجلس نیابت) کے سپرد تھے، جےپور میں ہندی پرچارنی سبھا قائم کی گئی۔ اس کے مقامی صدر ٹھاکر کلیان سنگھ (جج) فرقہ پرستی کے عناصر برطانوی ہند سے لائے تھے اور اہل جے پور سے انہیں کوی ہم‌دردی نہ تھی۔ .....

ان حضرات کی بےہم تگ و دو اور بیرونی اثرات سے ۱۹۲۵ء میں بالاخر کونسل دب گئی اور جےپوری رعایا کی عام مرضی کے خلاف اس نے ہندی حروف کے استعمال کی اجازت دے دی - بایں ہمہ ۱۹۴۲ء تک عملاً اردو رسم خط ھی سے دفتروں میں زیادہ کام لیا جاتا تھا - حکومت جےپور نے صریحاً اردو کے خلاف کوی قدم نہیں اٹھایا اور اپنی ذاتی قبولیت اور خوبی کی وجہ سے ان بیس برسوں میں اسی کا رواج اور غلبہ نظر آتا تھا -

۱۹۴۲ء میں سر مرزا اسمعیل دیوان ریاست مقرر ھوے - شاید اس موقع کو فوری انقلاب کے لیے مناسب سمجھ کر ایک شخص پنڈت رام‌چندر شرما نے ''مرن برت،، رکھا، کہ اگر اردو کی جگہ جےپور میں ہندی جاری نہ ھوی تو میں فاقے کر کے جان دے دوں گا - اسی اعلان کے ساتھ ہندو مہا سبھا نے ریاست اور بیرون ریاست میں بڑا شور مچایا مرزا اسمعیل دھمکی میں آگئے اور ۲۸ جنوری ۴۴ء کو ایک یادداشت شایع کی جس کی ظاھری خصوصیت یہ تھی کہ رواج و روایات کے خلاف اسے صرف انگریزی اور (مصنوعی) ہندی میں چھاپا گیاتھا۔ اردو میں ایک حرف تک نہ تھا - ''میمورنڈم،، میں یہ ظاھر کردیا تھا کہ حکومت کی منشا دیوناگری کو رواج دینے کی تھی لیکن صراحتاً اردو کی ممانعت نہیں کی تھی لہذا حامیان ہندی نے پھر ھنگامہ مچایا اور کچھ بااثر سرمایہ داروں کی اندرونِ پردہ ریشہ دوانیوں کے ذریعے اور اصل میں دیوان صاحب کی کم‌زوری کے باعث انہیں مزید کام‌یابی ھوی اور صیغہ نشر و اشاعت کی طرف سے دوسرا ''نوٹ،، انگریزی ، ہندی ، اردو تینوں زبانوں میں نکلا جس میں اعلان تھا کہ سرکار کا مطلب پہلے میمورنڈم سے یہی ھے کہ ''جلدی سے جلدی سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں دیو ناگری کا عام استعمال ھونا چاھیے،، جناب مولوی صاحب لکھتے ھیں کہ ''مندرجہ بالا احکام اور تصریحات کو دیکھ کر ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ھے کہ یہ محض ابن الوقت حکوست ھےجو ''گپت

عبارتوں،، اور ”مبہم الفاظ،، کے ذریعے آردو والوں کو طفل تسلی دینا اور ناگری والوں کو مطمئن کرنا چاہتی ہے . . . . ،، پھر مولوی صاحب نے سر مرزا کے نام ایک خط خاص قاصد کے ہاتھ جےپور بھیجا ۔ خط میں لکھا تھا کہ

”آپ کی حکومت کے مبینہ فیصلے سے کہ تمام ریاست میں آردو کی بجائے ہندی اور دیوناگری حروف جاری کر دئے جائیں،، ایک ہیجان پیدا ہوگیا ہے . . . . ایک مدت سے آردو کو جےپور میں سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل رہا ہے۔ راج پوتانے میں ہندی اسلامی تہذیب اور آردو شاعری کا مرکز جےپور ہی کو کہا جاتا ہے۔ کیا سبب ہے کہ جے پور ایک ایسی عام کل ہند زبان کے خلاف عمل پیرا ہو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں سے بنی اور مستقبل میں ادبی ترقیوں کی گوناگوں صلاحیتیں رکھتی ہے؟ یہ ایسا معمہ ہے جسے میں حل نہیں کر سکتا ۔ اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ یہ ایک فرقہ وارانہ مسلہ ہے (حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے) پھر بھی میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندستان کی کوئی حکومت جس کی رعایا میں مختلف فرقے موجود ہوں، بغیر دوسرے فرقے کو نقصان پہنچائے کس طرح ایک فرقے کی جانب داری کرسکتی ہے؟ . . . . . ،،

انجمن کے نمائندے (سید صلاح الدین صاحب جمالی) نے ۱۰ فروری سنہ ۴۳ع کو سر مرزا سے مل کر مولوی صاحب کا خط پیش کیا اور زبانی بھی سمجھایا کہ وہ ایسی نئی بات نہ کریں جس سے تمام ہندستان کے آردو والے ان کے خلاف مشتعل ہو جائیں گے۔ اسی ہفتے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں یہ مسئلہ پیش ہونے والا تھا لہذا جناب مولوی صاحب نے براہ خیر اندیشی مشورہ دیا تھا کہ سر مرزا جلد اپنی صفائی کی کوئی صورت نکال سکیں تو بہتر ہے۔

سر مرزا، نمائندۂ انجمن کو بار بار اپنے ”مسلمان،، ہونے کا یقین دلاتے رہے اور حسب وعدہ ۱۲ فروری کو ایک اور نوٹ بھی سرکاری مطبع میں چھپوایا جس میں لکھا تھا کہ پہلے احکام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آردو تحریر میں کوئی کاغذ قبول نہ کیا جائے یا یہ کہ جو عمال اچھی طرح ہندی نہیں جانتے وہ آردو نہ

استعمال کریں . . . مگر یہ نوٹ سرکاری مطبع میں چھپ رہا تھا کہ سر مرزا کو خدا جانے کیا وہم پیدا ہوا کہ اسے روکنے اور تلف کر دینے کا حکم دیا اور ایک دوسرا نوٹ تین دن بعد (۵ فروری کو) چھپوایا جس میں لکھا تھا کہ (صرف وہ) لوگ جو ہندی بالکل نہ جانتے ہوں، سرکاری کاموں میں اردو استعمال کر سکتے ہیں! پہلا نوٹ جو منسوخ و تلف کرایا گیا، اس کی ایک مطبوعہ نقل جناب مولوی صاحب کے ہاتھ آ گئی اور اس کی عکسی تصویر انہوں نے اپنے رسالے اور اخبار ہماری زبان میں چھپوا دی - سر مرزا کے دوسرے نوٹ یا حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعصب حکام نے اپنے دفتروں میں اردو کی بالکل ممانعت کر دی - رسالے کے آخر میں مولوی صاحب نے پھر سر مرزا سے بہ اصرار درخواست کی کہ اردو اور ہندی کو حسب سابق جے پور میں رہنے دیں اور کسی فرقہ پرست کے مرن برت یا دوسرے دباؤ میں نہ آئیں کیونکہ اس طرح کوئی حکومت انصاف و معقولیت کے ساتھ نہیں چل سکتی -

سر مرزا نے اپنی روش نہ بدلی - شاید اپنی کمزور و بے اصول فطرت سے مجبور تھے - ادھر مولوی صاحب اردو پر اس ظلم صریح کو خاموشی سے برداشت نہ کر سکتے تھے - احتجاج و اعتراض کا سلسلہ جاری رہا - اردو اخباروں کے علاوہ مورننگ نیوز اور اسٹار (کلکتہ) ڈان (دہلی) دکن ٹائمز (مدراس) کے مسلمان انگریزی اخباروں میں مرزا صاحب کی سخت فضیحت ہوئی - ان کی طرف سے کسی نے ڈان میں صفائی پیش کی تھی مگر نام لکھنے کی جرات نہ کر سکا - البتہ اخبار پیام (حیدرآباد) اور الکلام (بنگلور) مرزا صاحب کی وکالت کرتے رہے اور نتیجے میں بہت مطعون و نا مقبول ہوئے - اول اول خواجہ حسن نظامی صاحب نے پہلودار حمائت کی تھی مگر خود جے پور گئے تو سر مرزا نے ملاقات سے پہلوتہی کی - خواجہ صاحب نے بھی وقت کے وقت ادھر سے منہ پھیر لیا - اسی سال (۴۳ء) مرزا صاحب کچھ روز کے لیے اپنے وطن بنگلور گئے - وہاں ایک جم غفیر کالی جھنڈیاں لے کر اسٹیشن پر جا چڑھا - بارے وہ ایک اسٹیشن پہلے ہی اتار لئے گئے اور چپکے سے اپنے گھر جا گھسے - ان سے لوگوں کی مخالفت بڑھتی رہی - انہوں نے غصے میں ہماری زبان (جو بلا قیمت بھیجا جاتا تھا) لینا تک بند کردیا - ہندی ساہتیہ سمیلن کا

جلسہ جے پور میں بلوایا تھا مگر سمیلن والوں کا باہمی جھگڑا ہوجانے سے جناب مرزا کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی (جنوری ۱۹۴۴ع) راج پوتانے میں ایک ہندی یا سنسکرت یونی‌ورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ بھی حضرت مرزا اسمعیل سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ اگرچہ اس زبان سے خود ناواقف تھے ۔ یونی‌ورسٹی تو نہ بن سکی تاہم ۱۹۴۵ع میں کسی سنسکرت ساھتیہ سمیلن کا افتتاح کرنے کی مسرت حاصل ھوی ۔ خطبہ افتتاحی میں آپ نے بڑا زور اس پر دیا کہ ”سنسکرت کا مطالعہ ہماری روحانی تشنگی دور کر سکتا ھے!“ اسی مقالہ عالیہ کے کچھ روز بعد سر مرزا جے پور سے ہٹا دئے گئے ۔ حیدر آباد پہنچ کر آپ نے انجمن کے خلاف جو انتقامی حرکتیں کیں، ان کا ذکر باب کی آخری فصل میں ہم کریں گے ۔

گاندھی جی کی ہندستانی سبھا

محبان آردو کو گاندھی جی کا ”ساھتیہ پرشد“ غیرت و حرکت میں لایا تھا ۔ بعض کانگریسی مسلمانوں اور خاص ہندو دوستوں نے انہیں پرشد کی علم برداری کرنے پر ٹوکا تھا لیکن کانگریسی وزارتوں کے پہلے عہد اقتدار (نومبر ۱۹۳۹ع) تک آن کے خیالات میں کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا ۔ اسی دسمبر میں دھلی کی آردو کانفرنس کو جو خط بھیجا، اس میں بھی آردو کو مسلمانوں کی اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان بتایا تھا ۔ ہماری زبان (۱۶ جنوری ۱۹۴۰ع) میں گاندھی جی کے اس خیال پر تاسف کیا گیا اور ان کے مقابلے میں سر تیج بہادر سپرو، مہاراجہ کشن پرشاد، راجہ پرتاب گیر وغیرہ ہندو اور بعض مسلم اکابر کے اقوال دھرائے گئے تھے ۔ اسی قسم کی تنقید دوسرے اخباروں میں ھوی پنجاب کے چند کانگریسی مسلمانوں سے گفتگو میں پنڈت جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کی تردید کی اور خود اپنے کنبے برادری کی زبان کا آردو ہونا بدیہی مثال میں پیش کیا ۔ مولوی صاحب نے گاندھی جی کے خط کا شکریہ لکھنے میں ان کی اس غلطی پر توجہ دلای ۔ جواب (مورخہ ۶ مارچ ۱۹۴۰ع) میں مہاتما نے تسلیم کیا کہ آردو اپنے علاقے میں ہندو مسلمان دونوں کی مادری زبان ھے اور ان کا مطلب تو یہ تھا کہ سبھی ہندو، آردو رسم خط اور مسلمان ہندی تحریر سے شناسای حاصل کریں ان کا اصل انگریزی خط (آردو ترجمہ کے ساتھ) یکم اپریل کے ہماری زبان

میں چھپا اور امید ظاہر کی گئی کہ اس تحریر سے کئی غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی : ''فرقہ واری کشیدگی کا ایک بڑا سبب زبان کا تنازعہ بھی رہتا ہے اور یہ رائے اب بھی درست ہے کہ کانگریسی لیڈروں کے لیے کسی ایک (زبان) کا بیڑا اٹھانا بڑی سیاسی غلطی تھی مگر اس کا احساس غنیمت ہے کہ بہت جلد ہوگیا۔''

آیندہ چار سال تک گاندھی جی اور کانگریس کو زبان کے مسئلے پر غور و بحث کی فرصت ہی نہ مل سکی ہوگی - ۱۹۴۲ع میں کانگریس خلاف قانون (باغی) جماعت قرار دی گئی - اس کے اکثر اکابر و رہنما قید کر لیے گئے - ۱۹۴۴ع میں نجات ملی - اب ان کی طاقتور حریف مسلم لیگ ہوگئی تھی - گاندھی جی اور ان کے رفیق پوری قوت سے اس کے دو قومی نظریے کی تردید اور لیگ کو نیچا دکھانے کی سعی و تدبیر میں منہمک تھے - رسم و آئین کے خلاف کئی سال سے برابر ایک مسلمان (حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد) کو کانگریس کا صدر بنائے رکھا تھا - بظاہر اسی یک قومی نظریے کے مظاہرے کے لیے ضرورت ہوی کہ ہندی اردو کی جداگانہ ''قومیت''، جسے خود تیار کیا تھا، مٹای (یا چُھپای ؟) جائے - نئی لسانی حکمت عملی کا آغاز ۱۹۴۲ع کو کہہ سکتے ہیں جب کہ گاندھی جی کے مشہور کروڑ پتی مرید سیٹھ جمن لال بجاج نے ایک ''ہندستانی پرچار سبھا'' کی وردھا میں بنا ڈالی - لیکن سیٹھ صاحب کا اسی زمانے میں انتقال ہو گیا - ملک میں خون‌ریز فسادات اور گاندھی جی وغیرہ اسی سال قید ہوے - ''سبھا'' کی پہلی بڑی محفل جمانے کی فروری ۱۹۴۵ع میں نوبت آی - جناب مولوی صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا تھا اور جب انہوں نے بمبئی کی اردو کانفرنس میں شرکت کا عذر کیا تو گاندھی جی نے ان کی خاطر سبھا کی تاریخیں بدلنی منظور کیں اور انہیں شریک کیے بغیر نہ رہے - مگر قبل ازیں کہ ہم جناب مولوی صاحب کی زبانی سبھا کا حال سنیں چند کلمے بمبئی اردو کانفرنس کی نسبت لکھنے ضروری ہیں جو موصوف کی صدارت میں ۲۳—۲۵ فروری ۱۹۴۵ع کو منعقد ہوی - کانفرنس کا انتظام انجمن ترقی اردو کی شاخ بمبئی نے کیا تھا، لیکن عام اہل شہر نے بڑے ذوق شوق سے حصہ لیا - کمیونسٹ اور ترقی پسند مصنفین اسلامی انجمنوں اور اہل مدرسہ کے شانہ بہ شانہ اردو کی حمایت میں صف بستہ نظر آئے - ایک ہی جلسے میں مولوی صاحب

کی پر سوز تقریر پر "عمارت فنڈ" کے لیے گیارہ ہزار روپیہ چندہ ہوا۔ جوشیلے نوجوانوں نے یقین دلایا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ رقم آیندہ فراہم کر کے بھیجیں گے۔ کانفرنس کے مشاعرے میں جو مولانا حسرت موہانی مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا، جناب مولوی صاحب کی ایک پنسلی تصویر دو ہزار روپے میں نیلام ہوی۔ مجموعی طور پر ان جلسوں نے واضح کر دیا کہ بمبئی بہت جلد لاہور و حیدرآباد کی طرح اردو زبان کا بڑا مرکز بن جائے گا۔ کانفرنس کی نمائش میں اردو کی ترقی نقشوں کے ذریعے دکھای گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس وقت ہماری زبان کے بارہ روزنامے اور پچاس کے قریب ہفت روزہ اخبارات و رسائل شہر بمبئی میں چھپتے تھے۔ گجراتی اور مرہٹی دونوں کو اردو مطبوعات نے دبالیا تھا۔

گاندھی جی کی ہندستانی سبھا کے متعلق جناب مولوی صاحب انجمن کی سالانہ کیفیت ۱۹۳۵ء (ص ۳۳) میں تحریر فرماتے ہیں :

"۲۶ فروری کو کلکتہ میل سے وردھا روانہ ہوا۔ وردھا میں "ہندستانی پرچار سبھا" کا پہلا سالانہ جلسہ تھا۔ گاندھی جی نے اب ہندی کی طرف سے رخ موڑ کر ہندستانی کی طرف نظر التفات فرمای ہے۔ اب ہندی کو ان کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی، وہ اپنا کام کرچکے تھے! میرا ارادہ شریک ہونے کا نہ تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ ان جلسوں اور ان تحریکوں میں شریک ہونا لاحاصل ہے لیکن ڈاکٹر تارا چند اور پنڈت سندر لال میرے پاس خاص طور پر بھیجے گئے دو تین روز تک برابر صبح شام ان سے گفتگو اور بحث رہی۔ آخر میں شرکت پر تو رضامند ہوگیا مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس سبھا یا اس کی کمیٹی کا ممبر نہ بنونگا۔ یہ بات ان صاحبوں نے قبول کرلی۔ اب جو جلسے کی تاریخ دیکھی تو وہی نکلی جو ہماری بمبئی کی اردو کانفرنس کی تھی۔ ادھر گاندھی جی اپنے دعوت‌نامے بھیج چکے تھے۔ ان صاحبوں نے گاندھی جی کو اطلاع دی۔ تب گاندھی جی نے پہلی تاریخیں منسوخ کر کے دوسرے دعوت نامے بھیجے تاکہ میں بمبئی سے وقت پر وردھا پہنچ سکوں۔

۲۷ فروری کو سبھا کا دوسرا اجلاس ہوا۔ سہ پہر کی نشست میں گاندھی جی نے (بہ حیثیت صدر) مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آکول بھارت ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور (۱۹۳۶ء) میں میری تحریک بھی

تھی کہ ہندستانی اختیار کی جائے۔ گاندھی جی نے اسے رد کردیا ۔ آج دس برس بعد وہی تجویز خود پیش کر رہے ہیں۔ اگر اس وقت منظور کرلیتے تو یہ دس سال کا نقصان نہ ہوتا ۔ زمانہ آج کل ایسی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ یہ دس سال پچاس سال کے برابر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گاندھی جی نے اپنی آخری تقریر میں فرمایا کہ میں نے (۱۹۳۶ء میں) مولوی صاحب کو دوست کر کے بلایا تھا ، وہ دشمن ہوکر گئے ، غلطی میری تھی ۔ میں اُن کی بات کو نہیں سمجھا ۔ آج میں اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر رہا ہوں ! (۱) . . . .

جناب مولوی صاحب نے سبھا کی مجوزہ کمیٹی میں شرکت سے قطعی انکار کردیا لیکن گاندھی جی نہ صرف سبھا کے صدر بنے بلکہ اُنہوں نے ” ہندی سمیلن،، سے استعفا بھیج دیا ۔ اس پر ہندی والوں نے بڑا شور مچایا ۔ سمیلن کے صدر ٹنڈن جی نے شکایت بھرے خط لکھے ۔ گاندھی جی نے اُن کو یقین دلایا کہ وہ اب بھی ہندی کے ویسے ہی (درپردہ ؟) حامی ہیں جیسے پہلے تھے ۔ یہ خط کچھ مدت بعد امرت بازار پتریکا ، اور ہندستان اسٹینڈرڈ میں منظر عام پر آیا ۔ گاندھی جی کے یہ جملے نقل کرنے کے لائق ہیں :

” میں نے کوئی نئی راہ نہیں اختیار کی ۔ بات یہ ہے کہ کبھی ایسا وقت ہوتا ہے جب میں کسی جماعت سے باہر رہ کر اس کی بہتر خدمات انجام دے سکتا ہوں اور کبھی اندر رہ کر ۔ میں اب ہندی ساہتیہ سمیلن سے باہر رہ کر اس کی زیادہ خدمت کر سکتا ہوں ۔ ،، (دیکھو ہماری زبان یکم فروری ۱۹۴۶ء)

ممکن ہے مہاتما جی مسٹر ٹنڈن کو بھی دم دلاسا دینا چاہتے ہوں لیکن اسی سال ان کا ” دریجن سیوک،، جو اُردو رسم خط میں اُن کی ” ہندستانی،، کا نمونہ بن کر شائع ہوا ، اس کی زبان وہی مصنوعی اور نامانوس ہندی پائی جاتی ہے ۔ ہندو مسلمان سبھی اُردو شناسوں نے اس نئی انشا پردازی کی مذمت کی ۔ ۱۹۴۶ء کے ہماری زبان ہی میں بیسیوں مضمون اور مراسلے مخالفت میں چھاپے گئے ۔

---

(۱) ۔ اگرچہ سبھا میں گاندھی جی کے عقیدت مند زیادہ تھے ، تاہم ایک صاحب (مسٹر وینکٹ راو) نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہندی ہندستانی کا جھگڑا مہاتما جی کی ضد سے پیدا ہوا تھا ۔ (ہماری زُبان ، ۱۶ مارچ ۱۹۴۵ء)

انجمن سے علانیہ اور خفیہ مخالفتیں

انجمن ترقی اردو کا دہلی آنا اور اس کے کام اور نام کی روز افزوں ترقی اردو کے دشمنوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ۔ ابتدا ہی سے ہندو فرقہ پرست اخبار مخالفت میں سرگرم رہے ۔ کبھی کبھی پنڈت کیفی صاحب کو دھمکیاں بھی دی گئیں ۔ خود مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ذاتی اختلاف کی بنا پر ساری قوم سے لڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ انہیں لالچ یا دھوکا دے کر قوم کا دشمن بنا دینا کیا مشکل ہے ۔ دہلی کی کل ہند اردو کانفرنس کے وقت ہی کئی مسلمانوں کے دستخطوں سے ایک اشتہار نکلا تھا جس میں انجمن کے کام کی بجائے کام کرنے والوں کی ذات پر حملے کئے اور جھوٹے الزام لگائے تھے ۔ ہندی کے طرف داروں کو طبعاً انجمن کے فروغ سے غصہ آتا تھا ۔ پھر ہندو مہا سبھا ان کی حامی و مددگار ہوگئی ۔ مسٹر ساورکر (صدر مہا سبھا) نے ۱۹۴۴ع میں بڑے پیمانے پر ''اینٹی اردو ویک،، منانے کا حکم دیا ۔ گاندھی جی کی ہندی سمیلن کی صدارت اور ناگ پور کے پرشد کی قیادت نے اردو کی دشمنی کو جس طرح قوت دی اس اس کا کچھ اندازہ پچھلے اوراق سے ہوسکتا ہے ۔ اسی سال خاص حیدر آباد میں ''آل انڈیا اردو کانگرس،، کے نام سے ایک نئی جماعت بنانے کا اعلان ہوا ۔ مقاصد وہی تھے جو انجمن ترقی اردو کے تھے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اردو والوں کے ہاتھ سے اردو کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کی جا رہی تھی کانگریس کی دعوت پر جناب مولوی صاحب بھی شریک اجلاس ہوے ۔ چالاک مفسدوں نے صدر اعظم نواب چھتاری تک کو صدر کانگرس بنا کر اپنے جال میں پھانس لیا تھا ۔ علی گڑھ ، الہ آباد وغیرہ کے بعض اساتذہ ، بمبئی کے چند اخبار نویس حیدر آباد کی میزبانی سے بہرہ مند ہونے کے لیے جمع ہوے لیکن جہاں تک علم ہے کانگرس پھس پھسی رہی (جولای ۱۹۴۴ع) اور بڑی بڑی لن ترانیوں کے باوجود اس کا دوسرا اجلاس ہونے کی کبھی نوبت نہیں آی ۔

حاسدوں کا یہ وار تو اوچھا پڑا لیکن اُن کی خوش بختی سے کوی ڈیڑھ سال بعد جناب مرزا اسمعیل حیدر آباد میں حاکم اعلیٰ بن کر نازل ہوے ۔ خیرخواہوں

نے حضور نظام کو بہت سمجھایا ، قائد اعظم تک نے روکا مگر خدا جانے انہیں کیا لالچ تھا کہ سر مرزا کو پہلے مشیر بنایا پھر چور دروازے سے کرسی صدارت پر لا بٹھایا ۔ مرزا صاحب نے جو حرکتیں کیں اور مسلمانوں کو ناراض و مشتعل کیا وہ واقعات ہماری تاریخ کے دائرے سے خارج ہیں لیکن سر مرزا جے پور کے جلے ہوئے آئے تھے ، انجمن ترقی اردو کو بدلا لیے بغیر نہ چھوڑ سکتے تھے ۔ حسابات کی تنقیح کے نام سے ایک خاص کمیشن ایسے عمال کی بھیجی جن کی نسبت انجمن یا جناب مولوی صاحب سے بغض للّٰہی کا یقین تھا ۔ کوئی قابلِ گرفت غلطی تو وہ کیا نکالتے ، دفتر کی معمولی بےضابطگیوں پر لمبے لمبے اعتراضات کیے ۔ انہیں حیدر آباد کے اعلیٰ حکام کی ایک کمیٹی نے فضول قرار دیا ۔ بہر حال سر مرزا کو یہ موقع مل گیا کہ تحقیقات کے بہانے حیدر آباد کی بیش قرار سالانہ امداد روک لی ، اور آیندہ سال (۴۷ء) اپنے علاحدہ کیے جانے تک انجمن کو ادا نہیں ہونے دی ۔

اسی سال جون ۱۹۴۷ء میں جناب مولوی صاحب ایک سرکاری کمیٹی میں شرکت کے لیے بنگلور گئے تھے ۔ وہاں سر مرزا کے ہم وطنوں نے جس دھوم کے ساتھ ایک خاص اردو کانفرنس "باباے اردو" کے اعزاز میں منعقد کی ، اور اس میں "میسور کے چھ لاکھ اردو دانوں" کی طرف سے مرزا صاحب کی اردو دشمنی پر متفقہ نفرین بھیجی وہ انجمن کے ساتھ اُن کی زیادتی کا گویا خدائی انتقام تھا ۔ مولوی صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ اور مدح و ستائش کی کئی پرجوش نظمیں پڑھی گئیں ۔ ایک منظوم خیر مقدم کا یہ مصرعہ کانفرنس بھر میں زبان زد ہوگیا تھا کہ ع

آئیے آئیے اے جان جہان اردو

کانفرنس کی روح رواں ، اردو زبان کے عاشق اور زبردست شاعر حکیم محمد امام صاحب امامی بنگلوری تھے جو ابھی تک آفتاب اخبار کے ذریعے بنگلور میں اردو کی مشعل اٹھائے ہوئے ہیں ۔ زادالله عمره و اکرامه ۔

جناب مولوی صاحب نے کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اعداے اردو کی گہری چالوں کا بڑی تذکرہ کیا ۔ اسی کے اقتباس پر ہم یہ باب ختم کرتے ہیں (۱) : ۔

---

(۱) کانفرنس کی مفصل رو داد ، خطبات اور سپاس نامہ ہماری زبان مورخہ ۱۶ جون ، اور ۱۶ جولائی ۱۹۴۷ء میں چھپے تھے ۔

اُنھوں نے فرمایا کہ ۔

" اردو کو کچلنے اور دبانے کی بعض اوقات بہت گہری تدبیریں کی گئیں جو بظاہر بڑی معصوم معلوم ہوتی ہیں لیکن اُن کی تہ میں ایک ہی چیز تھی یعنی اردو کی جڑ کھوکھلی کرنا ۔ بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک انجمن بنائی گئی تھی جس میں ہندستان کے چوٹی کے لیڈر اور نامور لوگ شریک تھے ۔ اس کا نام " ون لنگوایج اینڈ ون اسکرپٹ "، یعنی ایک زبان اور ایک رسم خط ۔ وہ کیا تھا : وہ زبان ہندی اور رسم خط ناگری۔ اگرچہ صاف صاف نہیں کہتے تھے مگر غرض یہی تھی ۔ اس انجمن کے دو چار جلسے ہوئے اور پھر رہ گئی ۔ اب اس کی صرف یاد باقی ہے ۔ ایک دوسری تجویز جو کئی سال سے چکر لگا رہی ہے اور جسے گاندھی جی اور کانگریس کے ممتاز لیڈروں کی تائید و سرپرستی حاصل ہے ، بہت خطرناک ہے ۔ یہ ہندستان کی تقسیم لسانی اعتبار سے ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنوب میں تامل ، تلنگی، ملیالم ، کنڑی ۔ گجرات میں گجراتی ، مہاراشٹر میں مرہٹی ، بنگال میں بنگالی ، یوپی اور بہار میں ہندی ، کشمیر میں کشمیری ، سرحد میں پشتو ۔ اب آردو کہاں رہی ؟ اگرچہ آردو سارے ہندستان میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے لیکن اس تجویز کی رو سے اس کا کوئی مقام نہیں ۔ یہ نکھری ہو جاتی ہے ۔ گویا یہ آسے ہندستان سے دیس نکالے کا پیغام ہے ! "

خطبے کا ایک جوش انگیز مقام وہ تھا جہاں انھوں نے پول قوم کی مثال حاضرین کو سنائی : ۔

" روس اور جرمن فاتحوں نے پولش زبان کا لکھنا اور بولنا قانوناً جُرم قرار دے دیا تھا۔ اور اس پر بڑی کڑی نگرانی کی جاتی تھی ۔ بازاروں یا شارع عام میں تو بولنے کی کیا مجال تھی ، پولیس کے ڈر سے لوگ گھروں میں بھی نہیں بول سکتے تھے ۔ لکھنا اور چھاپنا کسی حال میں ممکن نہ تھا ۔ اس لیے قومی نظمیں اپنے ہاتھ سے لکھتے اور چوری چھپے ایک دوسرے سے نقل کر لیتے اور راتوں کو کمرے مقفل کر کے یا تہ خانوں میں بیٹھ کر

پڑھتے تھے - چند دوست باہر گلی میں پہرہ دیتے رہتے کہ اگر پولیس آجائے تو خبردار کریں اس صورت میں وہ جھٹ اپنے مسودے دھکتی آگ میں جھونک دیتے تاکہ پولیس کے ہاتھ نہ لگ جائیں - اگر بے خبری میں پولیس نے چھاپا مارا تو ان وطن پرستوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں - مگر مائیں اپنے بچوں کو رات کے وقت بستر میں چپکے چپکے اپنی زبان میں مذہبی دعائیں اور احکام سناتیں اور یاد کراتیں - پولستانیوں نے یہ سب مظالم سہے ، سختیاں برداشت کیں ، قیدیں بھُگتیں ، کوڑے کھائے ، جلا وطن ہوئے لیکن اپنی زبان کو نہ چھوڑا - وہ اسے اپنے سینے سے لگائے رہے اور جان سے زیادہ عزیز رکھا - اسی کا نتیجہ ہے کہ پولش زبان زندہ ہے اور پولش قوم زندہ ہے اور اس کے بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں ! ،،

باب ششم

تقسیم ہند کے فسادات اور انجمن کی ہجرت

(نوشتہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہم)*

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

دلی جو ۱۸۵۷ع کے بعد سے کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی ۱۹۱۱ع میں یکایک اس کی قسمت جاگی اور وہ اعزاز جو قدرت نے اس کی تقدیر میں لکھا تھا، انہیں کی ہاتھوں اسے ملا جنہوں نے اسے محروم کیا تھا۔ یعنی ایک جُگ گزرنے کے بعد یہ سدا بہار بستی ایک بار پھر سلطنت ہند کی راج دھانی بنی۔ جس طرح شاہجہاں نے ایک نئی دلی تعمیر کی تھی اسی طرح انگریز نے بھی ایک نئی دلی بسائی۔ اور عالیشان عمارتیں، سڑکیں اور بازار بنائے اور جی بھر کے دل کی حسرت نکالی۔ دلی والوں نے کبھی اسے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور ہمیشہ اس کا ذکر حقارت سے کیا۔ اور لطف یہ ہے کہ یورپ کے بعض ماہرین فنون لطیفہ جب کبھی یہاں آتے اور پرانی دلی کی سیر کرکے نئی دلی پہنچتے تو وہاں کی دوغلی اور بدہئیت عمارتوں کو دیکھ کر انہیں بڑی مایوسی ہوتی۔ شاہجہان کی عمارتوں میں جو حسن، تناسب، دل‌کشی اور سبکی نظر آتی ہے وہ نئی دلی کی عمارتوں میں مفقود ہے۔ نئی دلی باہر والوں کا کمپو بن گئی۔ اگرچہ ۵۷ع کے بعد دلی کے ساتھ حکومت نے بڑی

---

* یہ پورا باب جناب مولوی صاحب نے اپنی یادداشتوں سے تحریر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ ان سے بہتر اسے کوئی نہ لکھ سکتا تھا۔ انجمن کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھنے کے علاوہ یہ باب تقسیم ہند کے فسادات کا تاریخی مطالعہ کرنے والوں کے واسطے بھی نہایت مفید ہوگا۔ س۔ ہ

ناانصافی کی تھی بلکہ طرح طرح سے اسے ذلیل کیا تھا تو بھی اس کی مقبولیت میں فرق نہ آیا تھا اور لوگ اسے اسی شوق اور محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس کی تہذیب اصل تہذیب اور اس کی زبان مستند زبان سمجھی جاتی تھی۔ دارالحکومت بننے کے بعد یہ سارے ملک اور ہر جماعت و ملت کا مرجع ہوگئی۔ جگہ جگہ کے لوگ یہاں آکر بس گئے۔ آبادی بڑھنے لگی۔ آئے دن کانفرنسوں، جلسوں، کمیٹیوں، کمیشنوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ تقسیم کے بعد جو دہشت ناک اور وحشیانہ قتل و غارت اور فسادات ہوئے اس کی نظیر اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اب مغربی پنجاب سے پناہ گزینوں کا ریلا آیا اور ساری دلی پر چھا گیا۔ یہاں کے قدیم شرفا یا تو مارے گئے یا بے سروسامانی کی حالت میں جان سلامت لےکر نکل بھاگے اور جہاں سینگ سمائے جا بسے۔ دلی نے بہت سے رنگ دیکھے ہیں۔ اس پر شان و شوکت اور بربریت کے بہت سے دور گزرے ہیں۔ لیکن یہ رنگ سب سے جدا ہے۔ دلی کی آبادی اب بیس لاکھ کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے۔ اور ایسے ایسے لوگ آکر آباد ہوئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے۔ نہ معلوم دلی والے جو یہاں رہ گئے ہیں اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ دلی کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کی زبان، بول چال اور وضع قطع سب کا خاتمہ ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب نئے لوگ نیا رنگ جمائیں گے۔ نئی زبان، نئی وضع قطع کا چلن ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہڑبونگ دلی کی شان میں اضافہ کرے گی یا اسے بٹا لگائے گی۔ سچ ہے

تلک الایام نداولہا بین الناس

انجمن کے مکان میں یوں تو پہلے ہی سے مہربانوں اور مہمانوں کی آمد رہتی تھی لیکن جب دلی کی آبادی اور رونق اور اس کی اہمیت بڑھنے لگی تو ہمارے مہمانوں کی چہل پہل بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی اور ہمارے کمرے بھرے پڑے نظر آتے تھے۔ ان میں لیگی بھی تھے اور کانگرسی بھی، خلافتی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی، کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی، اہل علم بھی تھے اور طالب علم بھی، گاندھی جی کے خاص معتقد اور چیلے بھی تھے اور ان کے مخالف بھی، ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھیں سیاست سے یا دوسرے کاروبار سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اگرچہ یہ مختلف خیالات اور مختلف اصول کے لوگ تھے۔ مگر

اردو کے بہی خواہ اور انجمن کے ہمدرد تھے اور جو جس سے بن پڑسکتا تھا وہ ہماری مدد کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا ۔ اس لیے وہ مجھے سب عزیز تھے ۔ ان میں اور مجھ میں صرف ایک رشتہ تھا اور وہ رشتہ اردو زبان کا تھا ۔ ایک بڑی خوبی اس محبت میں یہ تھی کہ نہ میں ان کے معاملات میں دخل دیتا تھا نہ وہ میرے کام میں ہارج ہوتے تھے ۔ میں بڑے اطمینان سے اپنا کام کرتا رہتا تھا ۔ اس لیے ان صاحبوں کا آنا مجھے کبھی نا گوار نہ ہوتا بلکہ بڑی خوشی ہوتی تھی ۔ اور ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ان سے باتیں اور گپ شپ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا ۔ دن بھر کی تھکن اور کوفت دور ہوجاتی تھی اور دوسرے دن کام کے لیے ہشاش بشاش تیار ہو جاتا تھا ۔ کام کرنے والے کے لیے ایسی تفریح ٹانک کا کام دیتی ہے ۔ پھر ایسی صحبت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے ۔ یہ خدا کی دین ہے ۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا کہ ایسے اصحاب جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے کام میں خاص امتیاز رکھتا ہے میرے حال پر اس قدر مہربان ہیں اور اپنی مہربانی سے مجھے عزت بخشتے ہیں ۔ میں آن کی اس عنایت اور محبت کو کبھی نہیں بھول سکتا ۔ اب ان دنوں کی یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے ۔ خدا آن سب کو خوش رکھے اور آن کی عزت آبرو پر آنچ نہ آنے پاے ۔

جولای ۱۹۴۷ع کی ۱۴ تاریخ اور پیر کا دن تھا ۔ حسب معمول اپنے کمرے میں بیٹھا کام کررھا تھا ۔ دن میں کھانا کھاتا نہیں اس لیے بےتکان کام کرتا ہوں ۔ تیسرے پہر یکایک میرے ایک عزیز مہمان جو کئی روز سے ٹھہرے ہوے تھے میرے کمرے میں داخل ہوے اور کہنے لگے تیار ہوجائیے ، آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا ۔ میں نے کہا کہاں ؟ کہنے لگے حیدرآباد ۔ میں نے کہا ناممکن ۔ میرا بہت کام پڑا ہوا ہے میں اسے اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتا ۔ کہنے لگے ، وہاں بھی تو آپ کا کام ہے اور میں انجمن ہی کے کام کی خاطر آپ کو وہاں لےجانا چاھتا ہوں ۔ انجمن کی امداد کا معاملہ درپیش ہے آپ کا وہاں رہنا نہایت ضروری ہے ۔ پھر ایسا موقع نہیں ملے گا ۔ حالات جلد جلد بدل رہے ہیں ۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے ۔ میں ضرور حیدراباد جاؤں گا لیکن اس وقت نہیں چند روز کے بعد ۔ کہنے لگے میں آپ کا ٹکٹ

خرید چکا ہوں کل صبح ہوائی جہاز جاتا ہے تیار رہیے۔ ہرچند میں نے سمجھایا منایا مگر وہ نہ مانے۔ میں اس لیے بھی ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہ میرا ٹکٹ خرید لیتے ہیں اور رقم نہیں لیتے۔ میں ان کے والد کا دوست ہوں یہ میرے سامنے کے بچے ہیں۔ لیکن انہوں نے میری اور انجمن کی ایسی محبت اور خلوص سے خدمت کی ہے کہ میں بعض اوقات ان کی بات ماننے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔ غرض میں تیار ہوگیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ وہ ریل سے میرا سامان لے کر حیدرآباد آجائے۔ یہ ۱۰ جولائی منگل کا دن تھا۔

اسی روز ہم دوپہر کے بعد حیدرآباد پہنچ گئے۔ وہاں مجھے رسالہ سائنس اور سائنس کمپنی کے متعلق بعض معاملات طے کرنے تھے۔ اردو لغات کی طباعت اور پروف ریڈر کے تقرر کے بارے میں بعض امور کا فیصلہ کرنا تھا جو ایک مدت سے زیر بحث تھے۔ نیز امداد انجمن کے متعلق جو بعض غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں انہیں رفع کرنا تھا۔ یہ امداد سر مرزا اسمٰعیل کی عنایت سے مسدود ہوگئی تھی۔ علاوہ اس کے ترقی و اشاعت اردو کے لیے ایک لمیٹڈ کمپنی بنانے کا ارادہ تھا اس کے متعلق بعض کارداں اصحاب سے مشورہ کرنا اور اس کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ ان تمام کاموں سے آخر اگست تک بہت کچھ فراغت ہوگئی۔ اب دلی کا قصد کیا۔ ۳ ستمبر کی شام کو گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہوا۔ وہاں سے بذریعۂ ہوائی جہاز دلی جانے کا ارادہ تھا۔ اس سفر میں سید علی شبر حاتمی میرے ہمراہ تھے۔ ۵ ستمبر کی شب کو بھوپال پہنچے۔ اسٹیشن پر میرے کرم فرما مہربان شعیب قریشی صاحب ملے۔ فرمایا یہاں سے کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا آپ کو لکھ چکا ہوں پرسوں دلی روانہ ہوجاؤں گا۔ انہوں نے کہا دلی کے حالات آج کل خراب ہو رہے ہیں ایسے وقت میں جانا خلاف مصلحت ہے۔ میں نے کہا اخبار والے ایسی خبریں لکھدیا کرتے ہیں آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجیے۔ جولائی میں جب میں وہاں تھا تو اخباروں میں ہم اس قسم کی خبریں روزانہ پڑھا کرتے تھے۔ کہا کہ یہ اخبار والوں کی خبریں نہیں ہیں، میں جو کہہ رہا ہوں وہ واقعی کیفیت ہے اور مجھے یہ حالات معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے ہیں۔ اس باب میں شعیب صاحب نے بڑی شدت سے اصرار کیا، میں ٹھیرنے پر رضامند نہ تھا اب وہ اصرار سے تشدد پر آتر آئے اور

فرمانے لگے آپ اس طرح نہ مانیں گے تو میں نواب صاحب سے کہہ کے آپ کے نام وارنٹ جاری کراکر گرفتار کرادوں گا۔ آخر یہ طے پایا کہ چند روز بھوپال میں قیام کر کے انتظار کروں ۔ اگر وہاں کے حالات قابل اطمینان پائے جائیں تو شوق سے چلا جاؤں ، ورنہ اس خیال کو ترک کردوں ۔ تین چار روز ہی کے بعد جو خبریں آئیں وہ بہت ہی پریشان کن تھیں۔ جس ریل سے میں بھوپال آیا اسی میں حیدرآباد کے چند نوجوان طالب علم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جارہے تھے ۔ ان میں سے جو دلی کے رستے گئے وہ رستے ہی میں قتل کردیے گئے۔ شعیب صاحب کا فرمانا صحیح نکلا ۔

بھوپال میں پڑے پڑے بارہ روز ہوگئے تھے ۔ ارادہ ہوا کہ دلی چلا جاؤں مگر شعیب صاحب کا اصرار تھا کہ ہرگز ادھر کا قصد نہ کیا جائے ، حالات بہت خطرناک ہوگئے ہیں۔ ۱۸ ستمبر کو انجمن کے کارکنوں رحم علی الہاشمی صاحب اور حکیم رشید احمد صاحب کے خط پہنچے کہ بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا تمام سامان اور مال و اسباب لوٹ لیا اور غارت کردیا ۔ سب ملازم وغیرہ جان سلامت لے کر بھاگ گئے ہیں۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے۔ یہ خط پڑھ کر مجھے بیحد پریشانی ہوئی اور سخت رنج و افسوس ہوا ۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے ۔ سید علی شبر ہاشمی فوراً ہوائی جہاز سے دلی جانے کے لیے آمادہ ہوگئے ۔ شعیب صاحب نے آنریبل مسٹر رفیع احمد قدوائی کے نام اور میں نے زاہد حسین صاحب ، نواب زادہ لیاقت علی خاں ، کرنل عبید ملک اور سر کلاڈ آکنلک کمانڈر ان چیف کے نام خط دیئے ۔ شعیب صاحب نے قدوائی صاحب کو ٹرنک کال سے علی شبر کے دلی پہنچنے پر مدد دینے کے لیے کہا ۔ یہ زمانہ بڑا خطرناک تھا ۔ ۷ ستمبر کا دن جب میں دلی پہنچنے والا تھا مسلمانوں کے قتل عام کا دن تھا۔ اور اور اس وقت سے برابر مسلمانوں پر قیامت برپا تھی ۔ قتل و غارت ، لوٹ ، عورتوں کی بے حرمتی ، بے کس بڈھوں عورتوں اور معصوم بچوں کا بیدردانہ قتل اور ظلم و جبر کی کوئی وحشیانہ حرکت ایسی نہ تھی جو مجبور اور بے پناہ مسلمانوں کے ساتھ نہ کی گئی ہو ۔ ایسے وقت میں وہاں جانا انتہائی جرأت اور ہمت کا کام تھا ۔ دوسرا کوئی شخص ایسی ہمت نہ کرتا ۔ یہ علی شبر کا دل گردہ تھا کہ وہ جان پر کھیل

کر بلا پس و پیش ۱۹ ستمبر کو دلی روانہ ہوگئے۔ ہوائی جہاز میں سوار ہوتے وقت ایک صاحب آئے اور انہیں ایک بقچیا دی کہ مہربانی کر کے میرے فلاں عزیز کو جو فلاں محلے میں رہتے ہیں پہنچادیجیے گا۔ انہوں نے مروت کے مارے لے لی۔ جب ولنگٹن ہوائی خانہ پر پہنچے اور وہاں کے ملازمین نے حسب دستور سامان کی تلاشی لی تو اس بقچیہ پر خون کے دھبے نظر آئے۔ اس سے کچھ شبہ ہوا۔ بقچیہ کھول کے دیکھی تو معلوم ہوا کہ کہ اس عقلمند شخص نے اور سامان کے ساتھ ایک مرغی بھی حلال کر کے رکھ دی تھی۔ ایسے وقت ایک عزیز کے لیے اس سے نادر تحفہ اور کیا ہوسکتا تھا!

ہوا خانے کی گاڑی مسافروں کو امپیریل ہوٹل تک پہنچا دیتی ہے۔ علی شبر جب یہاں پہنچے تو انہوں نے کوشش کی کہ ہوٹل میں ٹھیرنے کے لیے کوئی کمرہ مل جائے۔ ہوٹل کے منیجر نے کہا کہ کمرہ تو کوئی خالی نہیں البتہ بستر رات بھر آرام کرنے کے لیے مل سکتا ہے۔ ایک انگریز پاس کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے اشارے سے انہیں بلایا اور کہا یہاں ہرگز نہ ٹھیرنا۔ ہوٹل پر سکھوں کا قبضہ ہے اگر ٹھیرے تو قتل کیے جاؤ گے۔ اگر تمہیں کہیں اور جگہ نہ ملے تو میڈن ہوٹل چلے آؤ۔ میں نے ایک کمرہ لے رکھا ہے تم کو وہیں ٹھیرا لوں گا۔ انہوں نے اس نیک دل انگریز کا شکریہ ادا کیا اور کہا اگر اور ٹھکانا نہ ملا تو آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ اب انہوں نے آنریبل مسٹر رفیع احمد قدوائی کو فون کیا اور اپنے آنے کی اطلاع کی۔ قدوائی صاحب نے جواب دیا ٹھیرے رہو، ابھی تھوڑی دیر میں سواری بھیجتا ہوں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد قدوائی صاحب کی جیپ آئی جس میں دو مسلح سپاہی بھی حفاظت کے لیے موجود تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ان دنوں شہر کی کیا حالت تھی۔

اس دن تو رات ہوگئی تھی کہیں جا نہ سکتے تھے۔ دوسرے دن اسی جیپ میں مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں نکلے اور سیدھے انجمن کے مکان میں پہنچے۔ یہاں کی بربادی کا سماں دیکھ کر بہت تاسف ہوا۔ ۲۲ ستمبر کو واپس آئے تو دلی کے کے قتل و غارت گری، سفاکی اور بربریت کا حال بیان کیا۔ سڑکوں اور گلیوں میں جابجا لاشیں پڑی ہیں۔ سینکڑوں، ہزاروں مسلمان مرد، عورت اور بچے اپنا اپنا

سامان سروں پر اٹھائے یا چھکڑوں میں لدے پرانے قلعے یا ھمایوں کے کے مقبرے کی طرف جارہے تھے - ان میں سے بہت سے رستے ہی میں ختم ہوگئے شبر صاحب پرانے قلعہ بھی پہنچے - وہاں کی درد ناک کیفیت یان کی آسے سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے - انجمن کے دفتر کا سامان رجسٹر کاغذات اور میرا تمام ذاتی سامان لوٹ لیا گیا - صرف بھاری فرنیچر جو اٹھا نہ سکے باقی رہ گیا مولوی سید ہاشمی کی موٹر توڑ پھوڑ ڈالی - کتب خانے کا ایک حصہ محفوظ تھا لیکن وہاں بڑی لٹیرے گھسے اور کتابوں کو تہ و بالا کیا - آسے یہ تفصیل سے نہ دیکھ سکے - مکان میں سب سے بڑا کمرہ وہ تھا جس میں میں کام کرتا تھا - اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں - دو مقفل فولادی الماریاں تھیں جن میں نادر قلمی نسخے اور کاغذات محفوظ تھے ان کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا کیوں کہ مکان پر بھارت اشیورنس کمپنی کا قبضہ تھا اور سب کمروں میں ان کے کارکن کام کر رہے تھے - سب سے زیادہ المناک سانحہ یہ تھا کہ جب لٹیروں نے انجمن پر حملہ کیا تو جو ملازم اس وقت مکان میں رہ گئے تھے وہ ادھر ادھر بھاگ کر جان سلامت لے گئے - لیکن ہمارا ایک بڈھا کاتب اپنی جگہ سے نہ ہلا - ہر چند دوسرے ملازموں نے اسے ساتھ لے چلنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانا - اس کی بیوی عایل تھی اس لیے وہ وہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا - ظالموں نے اسے اور اس کے بیوی بچوں کو بڑی بیدردی سے قتل کر ڈالا - یہ بہت قابل اور فرض شناس کاتب تھا اور اپنا کام خاموشی سے بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ کرتا رہتا تھا - اس واقعے سے میرے دل کو سخت رنج اور تکلیف ہوئی - گاندھی جی اس زمانے میں دلی آگئے تھے اور قتل و غارت اور خونریزی اور باہمی منافرت کے جو شعلے بھڑک رہے تھے ان پر پانی چھڑکنے کی کوشش کر رہے تھے سید علی شبر نے ان سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر ان کے حواریوں نے ان تک نہ پہنچنے دیا۔

اس وقت مجھے سب سے بڑی فکر ان کتابوں کی تھی جو میرے کمرے میں تھیں اور کتاب خانے کی جان تھیں - ان کی کیفیت معلوم نہ ہونے سے دل بے چین تھا میں چاہتا تھا کہ خود جاؤں اور دیکھوں کہ کیا گیا اور کیا رہا - کیا کھویا اور کیا بچا - لیکن شعیب صاحب اور دوسرے احباب سب مانع آئے کہ یہ وقت دلی جانے

کا نہیں - دھلی سے چودھری رحم علی الہاشمی اور حکیم رشید کے خط بھی اسی مضمون کے آئے - کہ وھاں جانا اپنے اپ کو ھلاکت میں ڈالنا ھے ناچار دل مسوس کے رہ گیا۔

بھوپال میں خالی پڑے رھنا مناسب خیال نہ کیا - اتنے دن بھی جو وھاں لگ گئے تو وجہ یہ تھی کہ ملیریا نے آ دبوچا تھا - اچھے ھوتے ھی ۲۰ ستمبر کو حیدرآباد چل دیا - وھاں جو کام باقی رہ گیا تھا اسے سمیٹنا تھا - وھاں پہنچ کر کام شروع کیا - دو چار روز بعد جو ایک دن ڈاکٹر مظفرالدین قریشی سے ملنے گیا تو انہوں نے بڑی وحشت ناک خبر سنائی کہ خلیفہ عبدالحکیم کہتے تھے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط مولانا مناظر احسن کے نام آیا ھے جس میں لکھا ھے کہ شہدائے دھلی میں مولوی سید ھاشمی کا بھی نام ھے - مجھے اس سے بڑی پریشانی ھوی - اس سے پہلے بھی فریدآباد خط اور تار بھیج چکا تھا مگر کوئی جواب نہ آیا - اب پھر میں نے جگہ جگہ خط اور تار بھیجنے شروع کیے - آل انڈیا ریڈیو دھلی کو بھی خط لکھا کہ شاید اس کے ذریعہ سے کوی اطلاع ملے لیکن کہیں سے کوی خبر نہ ملی - اس زمانے میں خطوں اور تاروں کی قدر اتنی تھی جتنی ردی کاغذ کی - بہت دنوں بعد ان کے ایک عزیز نے جو بھوپال میں ھیں اطلاع دی کہ سید ھاشمی زندہ و سلامت فریدآباد میں ھیں -

دلی ان دنوں مصائب و آلام کی آماجگاہ بنی ھوی تھی - قتل و غارت اور خونریزی کا بازار گرم تھا - جس کے سامنے نادر شاہ کا قتل عام اور غدر کے مظالم ھیچ تھے - ھندو اور سکھ خونخوار درندوں کی طرح مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے - مسلمانوں نے اپنی بچاؤ کے لیے مقابلہ کیا اور خوب مقابلہ کیا - لیکن جب پولیس اور فوج بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئی تو مسلمان بے بس ھو گئے اور ان کی ھمت ٹوٹ گئی - پھر جو وحشیانہ ظلم و ستم اور بربریت کا مظاھرہ ھوا اور معصوم اور شیر خوار بچوں اور عورتوں سے جس بےدردی اور سفاکی کا برتاؤ کیا گیا اس کی نظیر ھندستان کیا کسی ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی - یہ سب کچھ کسی اشتعال کی بنا پر نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا جس کا اعتراف خود پنڈت جواھر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کیا اور کانگریسی اخبار نیشنل ھیرالڈ نے اس کی شہادت دی - اس اخبار کے دھلی کے نامہ نگار نے لکھا ھے کہ ھمیں بہت

پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے لیکن یقین نہ آتا تھا اور جس کسی سے میں کہتا تھا وہ بھی یقین نہیں کرتا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ حملے سے ایک دن پہلے مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں پر نشان بنا دیے گئے تھے تا کہ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کسی ہندو کے مکان یا دکان کو نقصان پہنچ جائے۔ گاندھی جی کے عبادتی جلسے ان دنوں بھی جاری تھے ۔ مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ اپنے ہتھار لا کر دے دیں ۔ مظلوموں کے ساتھ تو یہ سلوک تھا لیکن ظالموں سے کوئی باز پرس نہ تھی ۔ وہ اسی طرح مسلح تھے ۔ اگر اس کا یہ مطلب تھا کہ مسلمان جب بالکل نہتہ ہو جائیں گے تو اُن پر پر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے گا تو معصوم بچوں اور عورتوں پر جو ظلم کیا گیا وہ کس بنا پر تھا اُن کے پاس کونسے ہتیار تھے ۔ گاندھی جی کے عبادتی جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہا تھا اور نہ روحانیت کی روشنی ۔ اب وہ جلسے کانگریس کا ادنیٰ درجہ کا سیاسی پروپیگنڈہ ہو کے رہ گئے ۔ جونا گڑھ کے حملے کو انہوں نے جائز قرار دیا اور کشمیر کی حملہ آور فوجوں کو اپنی دعاؤں ساتھ روانہ کیا ۔ وہ اہمسا جس کا غلغلہ سارے عالم میں مچا ہوا تھا اور جس کی بنا پر گاندھی مہاتما ، مثل مسیح اور بدھ سمجھے جاتے تھے اُس کا خاتمہ جمنا کے کنارے پر ہوا ۔ معلوم ہوا کہ یہ اصول نہ تھا بلکہ وقت کی مصلحت تھی جس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی ۔ ۵ اکتوبر کو میں نے گاندھی جی کی خدمت میں اسی بارے میں ایک طویل خط لکھا اور اس کا انہوں نے جواب دیا۔ اس کا ذکر یہاں مناسب نہ ہوگا یہ کسی دوسرے وقت کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں ۔

میں حیدرآباد میں پڑے پڑے گھبرا گیا تھا اور دلی جانے کے لئے بے چین تھا ۔ آخر ۲۴ اکتوبر کو بھوپال روانہ ہو گیا ۔ وہاں سے میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری اجمل خاں صاحب کی خدمت میں خط لکھا کہ میں آنا چاہتا ہوں لیکن وہاں ٹھیرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا اگر مولانا اجازت دیں تو چند روز اُن کے دولت کدہ پر قیام کروں بعد میں کوی اور انتظام کر لوں گا ۔ ان کا جواب آیا کہ مولانا نے بخوشی میرے قیام کی اجازت دیدی ہے ۸ نومبر کو سید علی شبر حیدرآباد سے دہلی روانہ ہوگئے اور میں ۹ نومبر کو ۔ ہم مولانا کے مہمان رہے دوسرے دن یعنی ۱۰ نومبر کو نمبر ۱ دریا گنج یعنی انجمن کا مکان دیکھنے گیا ۔

جا کے دیکھا تو مکان کا نقشہ ہی کچھ دوسرا نظر آیا کہ بھارت انشیورنس کمپنی لاہور نے قبضہ کر رکھا ہے ۔ اُن کے کارکن اور ملازم کمروں میں کھچا کھچ بھرے ہوے ہیں ۔ وہاں بھی سمای نہ ہوی تو برآمدوں کو گھیر کر یا دیواریں چن کر کمرے بنالیے ہیں ۔ اس سے بھی پوری نہ پڑی تو صحن میں ، سیڑھیوں پر ، لان پر ، سڑکوں پر پھیلے پڑے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نئے قسم کے پکھیرو خاص موسم میں نقل مکان کر کے یہاں آ پہنچے ہیں ۔

میرا جی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری اُن کتابوں کا کیا حشر ہوا ۔ جو میرے کمرے میں تھیں ۔ جس کمرے میں کام کرتا تھا وہ بہت بڑا اور وسیع تھا ۔ کوٹھی بھر میں اس سے بڑا کوی ہال نہ تھا ۔ اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں ۔ کھلی الماریوں کے سوا دو بڑی فولادی الماریاں جن میں خاص‌خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسخ، غالب، سر سید ، حالی ، محسن الملک، اقبال سر تیج بہادر وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیا تھیں ۔ ان کے علاوہ کئی بڑے بڑے صندوق تھے جن میں میرے نوٹ اور یادداشتیں مختلف قسم کی اور خاص کر اردو لغات کے متعلق بہت سامان ، الفاظ کی اصل کا تحقیقی سرمایہ ، اردو زبان کی تاریخ کی یادداشتیں اور مضمون ، اور اردو ہندی تنازع کے متعلق بہت سے قدیم کاغذات (میرا ارادہ اس تنازع کی تاریخ لکھنے کا تھا) اور بہت بڑا حصہ اردو لغات کے صاف کیے ہوے مسودوں کا تھا ۔ اس سے ملا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں میرے کپڑوں کی الماری اور صندوق تھے ۔ کپڑے اور دوسری چیزیں جو اس کمرے میں تھیں وہ تو لٹیروں نے سب لوٹ لیں ۔ جو صندوق بڑے نئے اور اچھے تھے وہ بھی لے گئے باقی وہیں چھوڑ گئے ۔ بڑے کمرے میں کاغذات کے جو صندوق تھے وہ انھیں بہت پسند آے ۔ کاغذات تو اُنھوں نے وہیں پھینک دئے اور صندوق لے کر چلتے بنے ۔ فولادی مقفل الماریوں پر اُن کی لالچای ہوی نظریں پڑیں اور سمجھے کہ ان میں ضرور مال و زر ہوگا ۔ پتھر مار مار کر انھیں توڑا ۔ جب ان میں کتابوں اور کاغذوں کے سوا کچھ نہ ملا تو بڑی مایوسی ہوی اور غصے کی جھانجھ میں وہ سب

کتابیں اور کاغذ نکال نکال کر باہر پھینک دیے ۔ کتاب خانے کے کمروں میں زیادہ گنجایش نہ رہی تھی ۔ اس لیے دو فولادی مقفل الماریاں کھانے کے کمرے میں رکھوادی تھیں ۔ ان میں اردو لغات کے پرچوں (کارڈوں) کے بنڈل بھرے ہوے تھے ۔ انھیں پرچوں پر سے کاتب نقل کر کے لغات کا مسودہ تیار کرتا تھا جو نظرثانی اور ترمیم و اصلاح کے بعد مبیّضے کے لیے کاتب کو دے دیا جاتا تھا ۔ میرے کھانے پینے کا سامان اور ظروف وغیرہ تو لوٹ ہی لیے گئے تھے لیکن ان مقفل فولادی الماریوں کو دیکھ کر قیاس کیا کہ ان میں ضرور قیمتی اشیا ہوں گی ۔ انھیں توڑا تو یہاں بھی وہی ناکارہ کاغذ نکلے جو انھیں دوسرے کمروں میں ملے تھے ۔ ان میں کچھ قلمی بیاضیں بھی تھیں ۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا ۔ اٹھا اٹھا کر فرش پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے ۔

بھارت کمپنی کو کمروں کی ضرورت تھی اور مالک مکان کو کرایہ کا لالچ ۔ لہذا کمرے خالی کرنے کے لیے انھوں نے یہ سب چیزیں جو میرے کتاب خانے کی جان تھیں بڑی بےدردی سے صحن میں کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیں ۔ جہاں وہ کئی روز تک پڑی رہیں ۔ بہت سے کاغذ ہوا میں اڑ گئے اور کچھ آنے جانے والوں کی روندن میں آگئے ۔ اور جو کتاب یا کوی چیز کسی کو پسند آی وہ مال غنیمت سمجھ کر لے لی ۔ ان میں بعض نہایت خوش‌خط قدیم قرآن شریف تھے وہ پھاڑ ڈالے ۔ قدیم اردو کتابیں خط نسخ میں لکھی ہوتی ہیں انھیں بھی وہ قرآن سمجھے اور پھاڑ ڈالا ۔ نیچے کے کمرے رسالوں اور اخباروں سے بھرے پڑے تھے ۔ مالک مکان نے اپنی مہربانی سے وہ سب اخبار اور رسالے اور بہت سی ردی اور صحن میں باقی ماندہ پڑی ہوی کتابیں اور کاغذات ڈھوکر باورچی خانے ، غسل خانوں گدام ، برآمدوں اور کتاب خانے کے بغلی کمرے میں پھنکوادیے ۔ ردی کے یہ بڑے بڑے انبار جگہ جگہ پڑے تھے . کتاب خانے کو کھول کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی لٹیروں کے قدم آے تھے ۔ الماریوں کی کتابیں درہم برہم کردی تھیں اور کچھ نیچے پڑی تھیں ۔ اور جو الماریاں مقفل تھیں ان کے تالے بھی توڑ کر معائنہ کیا اور کتابیں الٹ پلٹ کردیں اور جو پسند آئیں وہ نکال کر لے گئے ۔ اب ہم نے ردیوں کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا ۔ کسی کتاب کا کوی کاغذ

ایک جگہ اور کوی کہیں دوسری جگہ ملا - اس تلاش اور چھٹای میں کئی مہینے لگ گئے - اس کام میں چودھری رحم علی الہاشمی ، رفیق الدین احمد ، محمد یعقوب میں اور بعد میں حامد علی صاحب برابر مصروف رہے - بعض نسخوں کے کاغذات جو مختلف ردیوں میں ملے جوڑ جوڑ کر الگ کیے جو پھر بھی ناقص رہے بعض کے بعض حصے پھٹے ہوے ملے - صرف چند درست حالت میں تھے مگر اکثر تلف ہوگئے - یہ کام ہمارے لیے بہت اجیرن ہوگیا تھا - شام کو جب ہم اس سے فارغ ہوتے تو ہماری صورتیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں - بعض تو بالکل بھوت نظر آتے تھے - چودھری رحم علی الہاشمی نے بیزار ہو کر مجھے لکھا کہ آپ ہم سے قلیوں کا کام لیتے ہیں - اس وقت مجھے بچپن کا یہ قول یاد آیا جو میں نے بزرگوں کی زبانی اکثر سنا تھا - کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے فرمایا کہ اگر میں دنیا میں رہتا تو کشمیر میں رہتا - کھاتا دودھ چاول - اور کام کیا کرتا ؟ کاغذ چنتا - چناںچہ اکثر بڑے بوڑھے جب کسی کاغذ کو زمین پر پڑا دیکھتے تو اٹھاکر طاق میں یا کسی محفوظ جگہ رکھ دیتے - چودھری صاحب نے ایسے مقدس کام کو قلیوں کا کام سمجھا جسے اللہ میاں نے خود اپنے لیے پسند فرمایا تھا - چودھری صاحب کو کیا معلوم کہ ان ردی کاغذوں کے پرزوں میں ہمارے جگر کے ٹکڑے ملے ہوے ہیں - غرض ہماری کتابوں اور کاغذوں کی یہ درگت بنی - اس سے جو رنج اور کوفت ہوی اسے کیوں کر بیان کیا جاے - الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں - ایسے مقام پر ان چیزوں کا کیا رنج کیا جاے جہاں ہزاروں لاکھوں عزیز جانیں ایسے ظلم و جبر کا شکار ہوگئی ہوں جو دید ہیں نہ شنید ، جہاں بے حرمتی اور بےعزتی کی انتہا ہوگئی ہو ، جہاں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں ، جہاں خون پانی کی طرح بہایا گیا ہو -

میں اور علی شبر تو مولانا کے ہاں پہلے ہی سے مہمان تھے دو روز کے بعد رفیق الدین احمد بھی آگئے - اب ہم تین ہوگئے - میں نے وہاں زیادہ قیام مناسب نہ سمجھا - ایک ہفتے کے بعد ہم نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس (مہمان‌خانہ) میں اٹھ گئے - وہاں گئے ہمیں چار روز ہوے تھے کہ معلوم ہوا حیدرآبادی وفد آرہا ہے اور اس کے ساتھ بڑی جماعت ہوگی - ہمارے لیے کوی جگہ نہ رہے گی

ہم نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھیرنے کی نکل آئے مگر کامیابی نہ ہوئی لہذا مجبوراً کراچی روانہ ہوگئے۔ جہاں ہم نے اپنے قدیم کرم فرما اور شفیق آنریبل پیر الہی بخش کے ہاں قیام کیا۔ پیر صاحب نہایت نیک دل، مخلص اور مہمان نواز ہیں۔ ان کا گھر مستقل مہمان خانہ ہے۔

دلی کے اس پندرہ روزہ قیام میں ہم شہر کو زیادہ نہ دیکھ سکے۔ ہماری قسمت میں تو ردیوں کی چھانٹن لکھی تھی۔ گو بظاہر امن تھا مگر لوگ غیر مطمئن تھے۔ ہر شخص یہی کہتا تھا نہیں معلوم کل کیا ہوتا ہے خاص کر مسلمان بہت شکستہ دل اور افسردہ تھے انجمن کا مکان دارالسلام یعنی ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی دریا گنج میں تھی جو پورا ہندوؤں کا محلہ ہے۔ مسلمانوں کے دو ایک ہی مکان تھے اور اب تو وہ بھی نہیں رہے تھے۔ ہمارے تعلقات محلے والوں سے بہت اچھے تھے ان کے تیوہار اور شادی بیاہ کے جلسے انجمن ہی کے مکان میں ہوتے تھے۔ اب کے جو ہم آئے تو مالک مکان کے سوا کوئی ہم سے ملا تک نہیں۔ ہم صبح مولانا آزاد یا نظام پیلس سے انجمن میں آتے اور شام کو واپس جاتے۔ پہلے روز جب ہم تانگے میں واپس جارہے تھے تو ہندو لڑکے ہاتھ اٹھا اٹھاکر ہماری طرف اشارے کررہے تھے اور کچھ کہتے بھی جاتے تھے جو ہم نہ سن سکے۔ شاید ان کو حیرت تھی کہ ہم ابھی تک زندہ و سلامت ہیں اور اس بےباکی سے اس محلے میں آتے جاتے ہیں۔ میری یہ پرانی عادت ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے ٹہلنے کو نکل جاتا ہوں۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا ایسے وقت میں باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے سید علی شبر مجھے کہیں تنہا نہ جانے دیتے تھے۔ جب میں ٹہلنے کے لیے جاتا تو یہ چوٹ میرے ساتھ ہو لیتے اور جہاں کہیں بھی جاتا یہ سایے کی طرح میرے ساتھ رہتے یہ شخص خلوص و مہر و محبت اور ایثار کا پتلا ہے اس زمانے میں اور اس سے پہلے بھی اس نے انجمن کے لیے بہت سے سفر کیے لیکن تمام مصارف اپنی ذات سے ادا کیے۔ ہرچند میں نے کہا کہ جب تم انجمن کے کام کے لیے سفر کرتے ہو تو اس کا خرچ انجمن سے لے لینا چاہیے مگر اس نے ہرگز قبول نہ کیا۔ بلکہ انجمن کے لیے بہت سا روپیہ جمع کر کے لاکر دیا۔ اس نے میری اور انجمن کی جو خدمت کی ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

انجمن کی شاخیں سارے ملک میں تھیں ۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندستان کے مرکز سے قایم نہیں رہ سکتا تھا ۔ اس لیے ضرور ہوا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قایم کیا جاے ۔ اس معاملے میں بڑی بحث رہی کہ یہ مرکز لاہور میں ہو یا کراچی میں ۔ آخر یہ طے پایا کہ کراچی ہی میں رکھا جاے جو مرکزی حکومت کا بھی دارالحکومت ہے اور اس سے امداد ملنے کی بھی توقع ہے ۔ اور سندھ کی حکومت بھی ضرور کچھ نہ کچھ مدد دے گی ۔ لاہور میں تو کام کرنے والے بہت ہیں ۔ زیادہ ضرورت سندھ بلوچستان اور سرحد میں کام کرنے کی ہے ۔ اب ہمیں ایسے مکان کی تلاش ہوئی جو انجمن کی ضروریات کے لیے مناسب ہو ۔ اس کام کو علی شبر نے اپنے ذمے لیا ۔ وہ دن بھر اس دھن میں سارے شہر کا چکر لگاتے رہتے تھے ۔ اس کام میں ہمیں سب سے بڑی مدد اپنے ہمدرد اور مخلص دوست پیر سید حسام الدین راشدی صاحب سے ملی ۔ مہینے بھر کی تگ و دو کے بعد کئی مکانوں پر نظر پڑی ۔ اب سید علی شبر ، سید حسام الدین اور میں نے جاکر یہ سب دیکھے اور ان میں سے ایک عالی شان سہ منزلہ عمارت کا انتخاب کیا ۔ یہ گجراتی ایجوکیشن سوسائٹی کی عمارت تھی جس میں پہلے لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا ۔ اس میں تقریباً پینتیس بڑے بڑے کمرے تھے ۔ صحن بھی تھا اور صحن سے ملحق بھی چند کمرے تھے ۔ چناں چہ اس کے لیے ہم نے ایک درخواست آنریبل پیر الہی بخش صاحب وزیر تعلیم کی خدمت میں پیش کی ۔ پیر صاحب نے ہماری درخواست پر سید ہاشم رضا صاحب کلکٹر کراچی کے نام سفارش فرمادی

سید ہاشم رضا صاحب بہت منتظم اور قابل شخص ہیں اور اردو زبان و ادب سے خاص ذوق رکھتے ہیں ۔ سید علی شبر نے یہ درخواست اُن کی خدمت میں پیش کی ۔ انہوں نے اپنی مہربانی سے اس کی منظوری دیدی ۔ اس ساری عمارت میں مہاجر بھرے ہوے تھے اُن سے مکان خالی کرانا ہمارے بس کی بات نہ تھی ۔ ہم تو کیا حکومت بھی اس معاملہ میں عاجز تھی ۔ جب اس کا ذکر ہم نے حکیم محمد احسن صاحب سے کیا جو اس وقت کراچی کارپوریشن کے میئر تھے تو انہوں نے فرمایا کہ میں آپ کو اس سے بہتر مکان کی نشاندھی کرتا ہوں جو باغوں کا نمونہ ہے آپ کل میرے ساتھ چل کر دیکھئے ۔ دوسرے دن ہم اُن کے ساتھ گئے اور وہ

ہمیں شاردا مندر میں لے گئے ۔ اسے تفصیل سے دیکھنے کے بعد ہم حکیم صاحب کے انتخاب کے قائل ہو گئے ۔ اس کے لیے ہم حکیم صاحب کے شکر گذار ہیں ۔ چناں‌چہ اب ہم نے دوسری درخواست پیش کی کہ پہلی عمارت کی منظوری خارج کر کے شاردا مندر کی منظوری عنایت فرمای جاے ۔ اس غرض کے لئے ۲۰ دسمبر کو حکیم محمد احسن صاحب، پیر سید علی محمد راشدی صاحب ، پیر سید حسام الدین راشدی صاحب ، سید علی شبر حاتمی اور میں کلکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے اور ان سے درخواست کی کہ گجراتی ایجوکیشن سوسائٹی کی عمارت کی بجاے شاردا مندر کی عمارت انجمن کے لیے نامزد فرمای جاے۔ وجوہ سننے کے بعد انہوں نے اپنی عنایت سے اس کی منظوری لکھ دی ۔ شاردامندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا اور اس میں تخمیناً ۱۲ سو طالب علم تعلیم پاتے تھے ۔ انجمن کے لئے اس سے بہتر عمارت کراچی شہر میں نہیں مل سکتی تھی ۔ ہم سید ہاشم رضا صاحب کے تہ دل سے شکر گزار ہیں ۔ لیکن اس میں بھی وہی مشکل تھی یعنے یہاں بھی مہاجر آباد تھے ۔ یہ سید علی شبر ھی کا کام تھا کہ انہوں ایک مہینے کے اندر بڑی خوبی اور سلیقے سے خالی کرا لیا ۔ میں اس سے پہلے ھی وھاں سے چلا آیا تھا ۔ سید علی شبر صاحب اس کام مین مصروف رہے۔

میں دلی جانے کے لئے تڑپ رہا تھا ۔ میرے سب دوست احباب سمجھاتے تھے کہ اب اس ملک میں اردو کے کام کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ حکومت مخالف ، اکثریت مخالف ، کوی کیا کام کرسکتا ھے ۔ خصوصاً تمہارا وھاں جا کر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں ۔ اور تو اور ہمارے مخدوم علامہ کیفی صاحب بھی دلی میں رہ کر کام کرنے کے مخالف تھے ۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ہندستان میں تو اردو کا خاتمہ ہو گیا اب یہ پنپے گی تو پاکستان ھی میں پنپے گی ۔ سب سے قوی دلیل یہ تھی کہ آزادی ملتے ھی یوپی کی حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے صوبے کے دفتروں عدالتوں اور مدارس سے اردو کو یک قلم خارج کیا ۔ حالانکہ یوپی وہ صوبہ ھے جہاں اردو نے وہ ترقی اور عروج حاصل کیا جو ہندستان کی دوسری زبانوں کے لیے قابل رشک ھے ۔ اور جو اپنی شیرینی ، فصاحت ، وسعت اور قوت کے اعتبار سے ہندستان کی زبانوں میں خاص امتیاز رکھتی ھے اور جس کے لکھنے پڑھنے ' بولنے اور سمجھنے والے ہر قوم و ملت کے لوگ ہیں ۔ اور بھی

ایک ایسی زبان ہے جو بر عظیم پاک ہند میں ہر جگہ بولی یا سمجھی جاتی ہے ۔ یوپی کی حکومت نے اس کار خیر میں انتہائی عجلت سے کام لیا گویا اگر اردو کو ملک سے خارج نہ کیا گیا تو دنیا کے امن و آسائش میں بڑا خلل واقع ہو جائے گا ۔ اور عجیب لطیفہ یہ ہے کہ اس کی بجائے جو زبان رائج کی جا رہی ہے وہ آکاش باقی (یعنے آسمانی زبان) ہو تو ہو، لیکن بیچارے زمین والے تو اس کے سمجھنے اور بولنے سے قاصر ہیں ۔ یہ راز پہلی بار معلوم ہوا کہ قانون کی طرح حکومت زبان بھی بناتی ہے اور زبردستی رائج کرتی ہے ۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں اور دلیلیں پیش کرتے تھے ۔ میں ان سے بحث نہیں کرتا تھا ۔ میرا ایک ہی جواب تھا کہ ہندستان میں ہمارے لاکھوں کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں ان کی خدمت کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے ۔“

آخر میں نے ۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو پھر ایک بار دلی جانے کا قصد کیا ۔ لیکن ایک عجیب واقعہ پیش آیا ۔ ۶ جنوری کو محمودہ رضویہ نے جو اردو زبان کی بڑی دلدادہ اور مشہور مصنفہ ہیں میری دعوت کی ۔ جس میں آنریبل پیر الہی بخش صاحب پیر سید حسام الدین راشدی صاحب ، سید علی شبر حاتمی ، حامد علی صاحب بھی شریک تھے ۔ کھانے کے بعد محمودہ نے انجمن کو دوسو روپیہ عنایت کیے ۔ یہ پہلے بھی کئی بار انجمن کو عطیے دے چکی ہیں ۔ قریب دو بجے کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد واپس ہو رہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سکھوں کے گردوارے کے پاس لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا اور آس پاس دو تین لاشیں بھی سڑک پر پڑی ملیں ۔ معلوم ہوا کہ فساد ہو گیا ہے ۔ دیکھتے ہیں موٹر کار سے اتر پڑے ۔ پیر الہی بخش صاحب کی حالت قابل دید تھی ۔ وہ لکڑی لیے دیوانہ وار ادھر ادھر دوڑ رہے تھے ۔ لوٹنے والوں سے مار مار کے سامان واپس لیا ۔ ہندو بیچارے جو بہت سراسیمہ اور پریشان تھے ان کو تسلی دی اور بچوں اور عورتوں کو حفاظت کی جگہ پہنچایا ۔ ان کی اس مستعدی اور بے تابانہ کارگزاری کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی ۔ وہ ان سب کوچوں گلیوں میں پہنچے جہاں فساد ہو گیا تھا اور اس کے فرو کرنے میں اس قدر سعی اور تگ ودو کی کہ بڑے عہدہ دار اور وزیر تو درکنار ایک پولس والا بھی اس دل سوزی اور ہمدردی سے اپنا فرض ادا نہیں کرتا ۔ اتنے میں

پولس بھی آگئی لوٹنے والوں کو گرفتار کیا اور بعض کو گولی ماردی - چند ھی گھنٹوں میں فساد فرو ھوگیا - پیر صاحب شام تک اس میں مصروف رہے اور واپسی میں اپنے ساتھ بہت سے ھندو مردوں عورتوں اور بچوں کو لیتے آے اور اپنے مکان میں پناہ دی - وہ لوگ بڑے اطمینان سے وھاں کھاتے پکاتے اور نہاتے دھوتے رہے - ایک شب علی شبر نے ان میں سے ایک صاحب سے باتیں کیں اور اُن کے حالات دریافت کیے تو اس نے کہا کہ ۱۵ اگست سے پہلے ھی کانگرس والوں نے ھندوؤں میں یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ لیگ والوں کا یہ منصوبہ ہے کہ ۱۵ اگست کے بعد تمام ھندوؤں کا مال اسباب لوٹ لیا جائے اور ان کو قتل کر دیا جاے - اس پروپیگنڈے سے سندھ کے تمام ھندو ھراساں اور پریشان ھو گئے اور انھوں نے گھر بار چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا - ھم بھی خوف کے مارے بمبئی چلے گئے - وھاں ھندوؤں نے ھمارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا اور ھمیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں جب ھم کوئی چھوٹا موٹا کاربار شروع کرتے تو مدد دینا تو ایک طرف وہ ھمارے کام میں روڑے اٹکاتے تھے - ھم یہاں مسلمانوں سے بہت خوش تھے اور بڑے امن و صلح کے ساتھ رھتے تھے - ھمارا ان کا کھانا پینا ، رھنا سہنا ، آداب و اطوار یکساں تھے - بمبئی کے ھندوؤں کی ھر بات ھم سے مختلف تھی - یہاں تک کہ ان کا کھانا پینا بھی ھم سے الگ تھا اور ھمیں پسند نہ تھا - کانگرس والوں نے ھمیں خواہ مخواہ اس مصیبت میں پھنسا دیا - جب اذیت اور تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی تو ھم ناچار پھر واپس آگئے - اور اطمینان سے اپنا کاروبار کر رہے تھے کہ اب سکھوں کے آجانے سے یہ فساد برپا ھوگیا -

دریافت کرنے سے یہ معلوم ھو کہ سکھوں کی ایک جماعت سندھ کے بعض اضلاع سے ھندستان جا رھی تھی - جب یہ لوگ کراچی کے اسٹیشن پر پہنچے تو معلوم ھوا کہ جو جہاز انھیں بمبئی لے جانے والا ہے اس کے جانے میں ابھی بہت دیر ہے - وہ اپنے گردوارے کی زیارت کے لیے شہر میں گئے - جب مشرقی پنجاب کے مظلوم اور ستم رسیدہ مہاجرین نے جن پر سکھوں نے طرح طرح کے ظلم و ستم کیے تھے اور جن کے ھاتھوں اُن کے عزیز اقارب ، بیوی بچے نہایت بیدردی سے ھلاک ھوے تھے ، اُن کو گردوارے میں جاتے دیکھا تو انھیں اشتعال پیدا ھوا اور آپے سے باھر ھوگئے - متعدد سکھ مارے گئے اور ان کی لپیٹ میں چند ھندو بھی آگئے - اگر یہ سکھ اپنے ارادے سے حکومت کو اطلاع

کردیتے تو پولیس ان کو اپنی حفاظت میں گردوارے لے جاتی اور یہ افسوسناک حادثہ وقوع میں نہ آتا ۔

اس فساد میں چند باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں ۔ ایک تو یہ کہ کسی عورت کی بےحرمتی نہیں کی گئی اور نہ کسی عورت اور بچے پر ہاتھ اٹھایا ۔ دوسرے تین چار گھنٹے میں فساد فرو ہوگیا ۔ تیسرے شہر کا کوی مسلمان اس میں شریک نہ ہوا ۔ جو کچھ کیا مہاجرین نے کیا ۔ انھوں نے بھی ہندووں کو ہلاک نہیں کیا ۔ چوں کہ بےسرو سامان تھے ، سامان لوٹنے میں لگ گئے ۔ کوی بستر اٹھائے دوڑا جارہا تھا ، کسی کے ہاتھ میں برتن تھے ۔ غرض جو جس کے ہاتھ لگا لے بھاگا ۔ ایک قابل تعریف بات یہ ہوی کہ جب دوسرے روز پاکستان کے نامور وزیر فنانس مہاجرین کے کیمپ دیکھنے گئے تو انھوں نے ہر کیمپ کے مہاجرین کو ایک جگہ جمع کیا ۔ اور ان سے کہا تم مسلمان ہو کلمہ پڑھو ۔ سب نے باآواز کلمہ پڑھا ۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو کہ تم نے کیا کیا لوٹا ہے اور جو کچھ لوٹا ہے وہ سب یہاں لا کے رکھ دو ۔ اس کا مہاجرین پر بہت اثر ہوا اور انھوں نے ایک ایک چیز لاکر رکھ دی ۔ لوٹے ہوے مال کا ڈھیر لگ گیا ۔ تب ہندووں کو بلاکر کہا کہ جو جو جس کی چیز ہے وہ اس میں سے لے لے ۔ بعض جگہ تو یہ بھی ہوا کہ کسی ہندو نے مہاجر کی کسی چیز کو کہا کہ یہ میری ہے تو وہ بھی اسے دے دی گئی ۔ مہاجر کی یہ مجال نہ ہوی کہ کہتا اس کی نہیں میری ہے ۔ اس فساد کا اگر ہندستان کے فسادوں سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا ۔

دوسرے دن یعنی ۷ جنوری کو ۸ بجے رات سے ۸ بجے صبح تک کرفیو لگ گیا ۔ بیچ میں دو گھنٹے کے لیے ۲ سے ۴ بجے تک کے لیے اٹھا دیا گیا ۔ میں اس وقفے میں بازار کی سیر کو نکلا تو دیکھا ہندو مسلمان سب اعلے کھلے پھر رہے ہیں اور یہ خیال میں بھی نہیں آتا کہ یہاں کوی فساد ہوا ہے ۔ ۸ جنوری کو بھی ایسا ہی کرفیو رہا ۔ تیسرے دن بھی کرفیو تھا لیکن ۱۲ بجے دن سے ۴ بجے تک اٹھا دیا گیا ۔ دو دن اور بیچ میں چند گھنٹوں کے وقفے سے کرفیو جاری رہا ۔

۱۲ جنوری کو کرفیو صرف شام کے ۶ بجے سے صبح کے ۹ بجے تک رہا ۔

اس فساد کی وجہ سے میرا دلی جانا رک گیا ۔ آخر ۱۳ جنوری کو علی شبر نے مجھے اور حامد علی صاحب کو زاہد حسین صاحب کے ہمراہ ہوای جہاز میں سوار کردیا ۔ میں زاہد حسین صاحب کے ہاں مہمان رہا ۔

زاہد حسین صاحب بڑے فرض شناس ، سنجیدہ مزاج اور اپنے کام کے ماہر ہیں ۔ انہوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی ۔ جس کے لیے میں ان کا بہت ممنون ہوں ۔ حامد علی اور رفیق الدین احمد کو انہوں نے اپنی عنایت سے شیرشاہ میس میں جہاں ہای کمشنر کا دفتر ہے قیام کی اجازت عنایت فرمای ۔ انجمن کے مکان میں گیا ۔ وہاں ردیوں کی چھٹای کا کام جاری تھا جس کا ذکر پہلے کرچکا ہوں ۔ ان ردیوں کی چھٹای اور کتب خانے کے معائنے کے بعد بہت سی کتابوں اور مسودوں کے تلف ہونے کا ٹھیک ٹھیک علم ہوا ۔ جب کوی عزیز کتاب یا مسودہ نہیں ملتا تھا تو اس کے ضایع ہونے پر دل کو چوٹ سی لگتی تھی ۔

دلی پہنچنے کے بعد میں دوسرے روز گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا لیکن اسی روز انہوں نے فاقہ شروع کردیا ۔ پانچ روز بعد انہوں نے فاقہ توڑ دیا ۔ لیکن فوراً ملنا مناسب خیال نہ کیا کیوں کہ ان پر نقاہت کا اثر تھا ۔ اس لیے میں رفیق صاحب کے ساتھ علی گڑھ چلا گیا ۔ اور سفر سے واپسی پر ملاقات کو منحصر رکھا ۔ ۲۳ جنوری کو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی کان وو کے شن میں شریک ہوا ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے خطبہ پڑھا ۔ لکھے ہوے خطبے سے پہلے انہوں نے چند کلمات زبانی ارشاد فرماے ۔ جس میں انہوں نے کہا کہ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے مسلم کا لفظ خارج کر دیا جاے ۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ میں نے اس کان وو کے شن میں انگریزی اور عربی کا استعمال دیکھا لیکن اپنی زبان کسی نے بھی استعمال نہ کی ۔

۲۵ جنوری ۴۸ء کو ۶ بجے شام کے میری درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردان اردو کا اجتماع ہوا ۔ اس میں تقریباً پچیس حضرات تشریف لاے ۔ ان میں نواب اسمعیل خاں صاحب وائس چانسلر بیگم اعزاز رسول ، شیخ عبداللہ ، پروفیسر محمد شریف ، پروفیسر منظور حسین ، آل احمد سرور صاحب ، پروفیسر رشید احمد صدیقی

سید الطاف علی صاحب ، محمد بشیر الدین صاحب لائبریرین ، ڈاکٹر ابواللیث ، امیرالدین قدوائی صاحب وغیرہ شریک تھے اس کا مقصد ان دو امور پر غور کرنا تھا ۔ اول: یہ کہ انجمن ترقی اردو کا صدر مقام اب کہاں رکھا جائے ۔ دوسرے موجودہ حالات میں اس کا پروگرام کیا ہو ۔ میں نے اپنی مختصر تقریر میں ان صاحبوں کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ بعض اصحاب کی جنھیں اردو اور انجمن سے خاص ہمدردی ہے ۔ یہ رائے ہے کہ انجمن کا صدر مقام دلی سے علی گڑھ میں منتقل کر دیا جائے ۔ کیوں کہ یونیورسٹی کے اہل علم اور طلبہ سے اس کام میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے ۔ علی گڑھ سر سید کے زمانے سے اردو کا مرکز رہا ہے اور اس وقت بھی یہی مقام اردو کی مرکزیت کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا ۔ لیکن میں نے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا کہ اگر انجمن کے یہاں لانے سے یونیورسٹی پر حرف آنے یا آسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو مجھے ہرگز یہ منظور نہیں کہ علی گڑھ کو انجمن کا صدر مقام بنایا جائے ۔ اس پر کچھ دیر تک گفتگو رہی ۔ بعض صاحبوں کی رائے تھی کہ تبلیغ و اشاعت کا کام بالکل ترک کردیا جائے ۔ بیگم اعزاز رسول اور پروفیسر محمد شریف نے فرمایا کہ انجمن کا نام بدل دیا جائے ۔ اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ اردو کا نام خارج کردیا جائے ۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ رائے دینے سے پہلے وہ اپنے نام بدل دیتے تو اس کہنے کا کچھ اثر بھی ہوتا ۔ غرض اس مشورے سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ صرف سید الطاف علی صاحب اور امیرالدین قدوائی صاحب کا یہ اصرار تھا کہ علی گڑھ میں آکر کام کیا جائے ۔ اس اجتماع میں جو صاحب شریک تھے ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ سے کچھ سہمے ہوئے سے ہیں اور کوئی قطعی رائے قایم نہیں کر سکتے یا صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے ۔

۲۸ جنوری کو میں الہ آباد روانہ ہوگیا ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے ہاں قیام تھا ۔ دوسرے دن سر تیج بہادر سپرو کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ ان کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ ہاتھ پانو کام نہیں دیتے ۔ آواز بھی بہت دھیمی ہوگئی ہے ۔ ملازم سگرٹ سلگا کر ان کی انگلیوں میں رکھ دیتا تھا ۔ راکھ تک نہیں جھاڑ سکتے تھے ۔ ملازم لے کر جھاڑتا ۔ کہنے لگے میں نے انجمن کی

صدارت سے استعفا لکھ بھیجا تھا، میں اب کام کے قابل نہیں رہا ۔ میں نے کہا مجھے کوئی ایسا خط نہیں ملا ۔ آپ جب تک زندہ ہیں (خدا آپ کو صحت کے ساتھ زندہ و سلامت رکھے) انجمن کی صدارت آپ ہی کے نام رہے گی ۔ ۳۰ جنوری کو مغرب کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میاں زبیر (فرزند ڈاکٹر صدیقی) گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کردیا ۔

میں نے کہا کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں امرت بازار پترکا کے دفتر سے آ رہا ہوں ۔ ابھی ابھی خبر آئی ہے۔ یہ سن کر میں بھی بہت پریشان ہوا ۔ یہ خبر ریڈیو سے سنائی گئی تھی ۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مارنے والا کون ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مارنے والا ضرور کوئی مسلمان ہوگا ۔ چنانچہ بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس خبر کے سنتے ہی بمبئی اور بعض دوسرے مقامات پر مسلمانوں پر حملے کیے گئے اور متعدد مسلمان ہلاک اور زخمی ہوئے ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یہ اطلاع آئی کہ قاتل ایک ہندو نوجوان تھا ۔ یہ مرہٹہ تھا اور سنگھی جماعت سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس وقت مسلمانوں کی جان میں جان آئی ۔ میں دوسرے دن دلی جانے والا تھا اور ارادہ تھا کہ یکم فروری کو گاندھی جی سے ملاقات کروں گا ۔ افسوس دل کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

۳۱ جنوری کی روانگی ملتوی کی اور ۲ فروری کو اٹاوہ روانہ ہوا ۔ مولوی بشیرالدین صاحب سے مفصل گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ ہندستان میں اب جو حالات پیدا ہوگئے ہیں اور یہاں کی حکومتوں نے اردو کے نیست و نابود کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے تو اس کے پیش نظر اردو کو قائم رکھنے اور اس کی اشاعت کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے ۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ اسی روز صبح کی گاڑی سے علی گڑھ چلے گئے ۔ وہاں ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم کی نعش آنے والی تھی اور وہ ڈاکٹر صاحب کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونے کے لیے گئے ہیں ۔ میں ناچار دوسرے روز دلی واپس آگیا ۔

دلی کے اس دوران قیام میں مکان کی تلاش میں حامدعلی صاحب اور میں دلی کے کوچوں کی خاک چھانتے پھرے۔ کوئی مکان ایسا نظر نہ آیا جہاں ہم اپنا دفتر اور کتب خانہ منتقل کرسکیں، ایک دو مکان ایسے ملے بھی جہاں بری بھلی طرح

بسر ہوسکتی تھی تو وہ نہایت خستہ حالت میں تھے اور ایسی تنگ اور غلیظ گلیوں میں واقع تھے کہ وہاں بڑی بڑی الماریاں اور دوسرے سامان کا پہنچانا دشوار تھا اب بڑی مجبوری پیش آئی۔ آنریبل محمد رفیع قدوائی نے اس بارے میں بڑا اچھا مشورہ دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اینگلو عربک کالج کا ایک حصہ بالکل خالی پڑا ہے اور اس کالج کے پوری طرح آباد ہونے میں سال دو سال کا عرصہ لگے گا۔ آپ انجمن کو وہاں منتقل کردیجیے۔ ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب کالج کی کمیٹی کے صدر ہیں۔ اس کے متعلق میں نے اُن سے گفتگو کی۔ اُنھوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ اس کا انتظام ہوجائے گا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۸ء کو میں رام پور مولوی سید ہاشمی سے ملنے گیا۔ فریدآباد کے مسلمانوں کو باوجود مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال کے وعدوں اور اطمینان دلانے کے اپنا عزیز وطن مجبور ہوکر ترک کرنا پڑا۔ ہاشمی صاحب نے عارضی طور پر رام پور میں آکر پناہ لی۔ وہ کراچی جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے میرے کہنے کی دیر تھی۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ وہ اپنا انتظام کر کے چند روز کے بعد دلی آجائیں اور میرے ساتھ کراچی چلیں۔ مجھے کراچی اس لیے واپس جانا پڑا کہ زاہد حسین صاحب کا دلی سے تبادلہ ہوگیا اور میرے قیام کی کوئی صورت نہ رہی زاہد حسین صاحب ۳ مارچ کو کراچی روانہ ہوگئے۔ ہاشمی صاحب رام پور سے آگئے۔ اب ہم بھی ۵ مارچ ۴۸ء کو ہوائی جہاز سے لاہور پہنچ گئے اور اپنے مخلص دوست مرحوم پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کے ہاں قیام کیا۔ پروفیسر اقبال اپنے اعلیٰ اخلاق اور علم و فضل کی بنا پر خاص لوگوں میں سے تھے مجھ سے وہ جس خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے تھے اُسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ لاہور میں سر شیخ عبدالقادر، میاں بشیر احمد شیخ کرامت علی وزیر تعلیم، صلاح الدین احمد صاحب اڈیٹر ادبی دنیا، حمید احمد خاں پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، عبدالقیوم ملک اور دیگر حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ۹ مارچ ۴۸ء کو ہم کراچی روانہ ہوگئے۔

اسٹیشن سے ہم سیدھے شاردا مندر پہنچے۔ جب میں کراچی سے چلا تھا تو وہاں پناہ گزیں آباد تھے۔ اس عرصے میں شبر حاتمی صاحب نے حکمت عملی سے

مکان خالی کرا لیا تھا ۔ اس وقت مکان کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی ۔ اب جو آکر دیکھا تو کچھ اور ہی نقشہ تھا ۔ شبر صاحب نے ضروری مرمت اور صفائی کے بعد چمن کو آراستہ کر کے سارے مکان کو آئینہ بنادیا تھا ۔

یہاں آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کردیا ۔ ایک کام اس اثنا میں یہ کیا کہ قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو لکھا کہ انجمن اب کراچی میں منتقل ہوگئی ہے اور اسے ایک مناسب مکان بھی مل گیا ہے ۔ ہماری یہ تمنا ہے کہ اس کا افتتاح اپنے دست مبارک سے فرمائیں ۔ قائد اعظم نے جواب میں بڑی مسرت کا اظہار کیا (۱۶ مارچ ۴۸ء) اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں ، سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۰ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمن ترقی اردو پاکستان کا افتتاح کروں گا ۔

۲۶ مارچ ۴۸ء کو (بروز جمعہ) لاہور میں پنجاب یونی ورسٹی اردو کانفرنس تھی ۔ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے اس کی صدارت کا وعدہ مجھ سے اسی وقت لے لیا تھا جب میں دلی میں تھا ۔ اس لیے میں اور سید ہاشمی صاحب ۲۴ کی صبح کو پاکستان اکسپریس سے لاہور روانہ ہوگئے ۔ دوسرے دن لاہور پہنچ گئے ۔ میرا قیام خان عبدالمجید خاں صاحب (علیگ) کے ہاں تھا ۔ ۲۶ کو ۱۰ بجے صبح کے کانفرنس شروع ہوئی ۔ اس کا افتتاح سر شیخ عبدالقادر صاحب نے فرمایا ۔ سردار عبدالرب نشتر صاحب گورنر پنجاب نے ایک تقریر کی ۔ اس کے بعد ڈاکٹر عمر حیات ملک صاحب وائس چانسلر نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھ کر سنایا ۔ یہ خطبہ ختم ہوا تو میں نے خطبۂ صدارت پڑھا ۔ تقسیم کے بعد یہ پہلی اردو کانفرنس تھی جو لاہور میں منعقد ہوئی ۔ اس لیے اسے بڑی اہمیت دی گئی ۔ یہ پنجاب کے اہل فکر اور اہل علم کا بڑا اچھا اور ستھرا مجمع تھا ۔ اسی سلسلے میں ایک علمی و ادبی نمائش بھی رکھی تھی جس کا انتظام یونی ورسٹی لائبریری میں کیا گیا تھا ۔ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد دو روز تک ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ لاہور کے بعض احباب کا اصرار تھا کہ انجمن کا صدر مقام لاہور ہونا چاہیے اس پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی جس کا اعادہ اس موقع پر نا مناسب ہوگا ۔ ۲۹ مارچ کو روانہ ہوکر ۳۰ مارچ کو کراچی آ گیا ۔

۳ اپریل کو احمد آباد میں اردو کانفرنس قرار پائی تھی اور ڈاکٹر ظہیرالدین اس بارے میں مجھ سے پہلے ہی سے خط و کتابت کر رہے تھے اور ان کا اصرار تھا کہ اس کی صدارت میں ہی کروں۔ چنانچہ یکم اپریل کو میں، مولوی سید ہاشمی اور سید علی شبر میل سے احمد آباد روانہ ہوئے اور ۲ کی شب کو احمد آباد پہنچے۔ قیام ڈاکٹر ظہیرالدین صاحب کے ہاں ہوا۔ ۳ کی صبح کو جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب بھی بمبئی سے آ گئے۔ احمد آباد سے ایک صاحب خاص طور پر انہیں لانے کے لیے گئے تھے۔ شب کو کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ مست بدایونی صاحب نے نظم پڑھی۔ جناب کیفی صاحب نے افتتاحی تقریر فرمائی اور ایک مضمون پڑھا۔ خطبۂ استقبالیہ کے بعد میں نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ احمد آباد میں اردو کا عام رواج ہے اور اب بھی وہاں اردو کے انشا پرداز اور ادیب موجود ہیں۔ یہ کانفرنس بہت پررونق تھی اور وہاں کے شرفا نے بڑے شوق سے اس میں شرکت کی دوسرے روز مجلس موضوعات کا اجلاس ہوا اور سہ پہر کو قرار دادیں پیش ہوئیں۔ شب کو مشاعرہ ہوا۔

احمد آباد سے میں اور کیفی صاحب ۷ اپریل کو کراچی پہنچے۔ سید علی شبر اور سید ہاشمی ہم سے ایک روز پہلے آ گئے تھے۔ ۱۴ اپریل کو آنریبل فضل الرحمن صاحب وزیر تعلیم و داخلہ نے اپنے مددگار کو بھیجا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ۱۷ کو فضل الرحمن صاحب سے ملا۔ وہ انجمن کے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق دریافت فرماتے رہے۔ انہوں نے انجمن کے مقاصد کی تائید اور امداد کا وعدہ کیا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا مگر میرے دل میں دلی کی لو لگی ہوئی تھی اور سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتا تھا۔ خاص کر اپنے کتب خانے کی بربادی کا خیال بہت ستاتا تھا۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ دلی مجھے مجبوراً چھوڑنی پڑی کیونکہ زاہد حسین صاحب کے چلے آنے کے بعد کوئی ٹھکانہ ٹھہرنے کا نہ رہا۔ اب چوں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے (جیسا کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا) کتب خانے کو اینگلو عربک کالج دھلی کی عمارت میں جو خالی پڑی تھی منتقل کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ اور وہاں میرے قیام کا بھی انتظام ہوگیا تھا تو اب میں جانے کے لیے بےقرار تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اسی زمانے میں میری طبیعت سخت ناساز ہوگئی۔ لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بڑی توجہ سے علاج کرتے رہے لیکن علالت کا

سلسلہ کم نہ ہوا ۔ اسہال کی وجہ سے نقاہت بہت بڑھ گئی تھی ۔ اس کے ساتھ ہی ملیریا کا بھی حملہ ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب نے انجکشن تجویز کیے ۔ اسی زمانے میں اقبال اکیڈیمی قائم ہوئی ۔ اس کی فونڈیشن کمیٹی کے صرف تین ممبر تھے آنریبل فضل الرحمن صاحب (صدر) اور فیروزخان نون صاحب اور میں ۔ ان جیکشنوں کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا ۔ اس سے فائدہ بھی ہوا ۔ مگر کچھ دنوں بعد بخار نے پھر آدبوچا ۔ آخر سب کی یہ رائے قرار پائی کہ میں تبدیل آب و ہوا کے لیے کوئٹہ چلا جاؤں جہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے ۔ چنانچہ میں ۲۲ جولائی کو کوئٹے روانہ ہوگیا ۔ ڈائرکٹر صاحب تعلیم صوبہ' بلوچستان کے قیام گاہ میں اصل عمارت کے ساتھ بہت وسیع میدان ہے اور اس میدان میں ایک نہایت عظیم الشان چنار کا درخت ہے جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے ۔ مقبول الرحیم صاحب نے ڈائرکٹر صاحب (امتیاز محمد خاں صاحب) سے کہہ کر میرے لیے اس درخت کے متصل ایک بڑا ڈیرا لگا دیا تھا ۔ میں دن بھر اس درخت کے زیر سایہ بیٹھا کام کرتا رہتا تھا ۔ اور اس شاندار درخت کی شوکت و عظمت اور گھنے سایہ کا لطف اٹھاتا رہتا ۔

۲۵ جولائی کو شام کے ساڑھے پانچ بجے گورمنٹ کالج کے لان پر میری صدارت میں یوم اردو منایا گیا ۔ ۲۷ کو میری صدارت میں بلوچستان ٹیچرز ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ ہوا ۔ ابھی مجھے کوئٹہ آئے سولہ سترہ دن ہی ہوئے تھے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبریں پہنچیں کہ اگر میں جلد دلی نہ پہنچا تو حکومت انجمن کو امداد بھی نہیں دے گی (جس کی منظوری ہوچکی تھی) ، زمین بھی ضبط کرلے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا ۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلی سے لائے تھے ۔ اس روز میں زیارت جانے والا تھا ، سامان گاڑی میں رکھا جاچکا تھا ، میرے بیٹھنے کی دیر تھی کہ یہ خبر پہنچی ۔ اس سے مجھے بے حد پریشانی ہوئی سفر کا ارادہ فسخ کر دیا اور دوسرے روز یعنی ۱۰ اگست کو کراچی

روانہ ہو گیا ۔ دو تین روز کے بعد خان عبداللطیف خان صاحب (مالک لطیفی پریس) دلی سے آئے انہوں نے اُن تمام باتوں کی تصدیق کی جو اب تک ہمیں پہنچی تھیں ۔ ہمدرد احباب نے جو اُس وقت کے حالات سے زیادہ با خبر تھے یہ مشورہ دیا کہ پہلے جناب کیفی صاحب کو دلی بھیجا جائے اور ان کو مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام خط دیے جائیں وہ دلی پہنچ کر ان صاحبوں سے ملیں اور وہاں کا رنگ دیکھیں ۔ اور تمام حالات معلوم کر کے لکھیں ۔ اس کے بعد مجھے دلی کا قصد کرنا چاہیے ۔

۱۶ اگست کو میں اور جناب کیفی صاحب سری پرکاش صاحب ھای' کمشنر بھارت متعینہ' پاکستان سے ملے وہ بڑی عنایت اور اخلاق سے پیش آئے ۔ انہوں نے میرا پرمٹ خود اپنے قلم سے بنایا اور اس کی پشت پر یہ بھی لکھ دیا کہ وہ انجمن کی ضرورت کے لحاظ سے اسی پرمٹ کے ذریعہ کراچی سے دلی اور دلی سے کراچی آجا سکتے ہیں ۔ کیفی صاحب اور حامد علی صاحب کے لیے بھی پرمٹ حاصل کیے ۔

حامدعلی صاحب تین چار روز کے بعد دلی روانہ ہوگئے میں بھی جانے کے لیے تیار تھا لیکن دلی سے خط آئے کہ ابھی ادھر کا رخ ہرگز نہ کرنا ۔ بات یہ ہے کہ ریاست حیدرآباد اور بھارت یونین کے معاملات بہت نازک حد تک پہنچ گئے تھے۔ جن اشخاص کا تعلق حیدرآباد سے تھا وہ بد گمانی کا شکار تھے اور اُن پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی ۔ اور یہ اندیشہ تھا کہ اگر حالات زیادہ خراب ہوے تو حراست میں لے لیے جائیں گے ۔ کیفی صاحب ۲۰ اگست کو لایل پور تشریف لے گئے۔ وہاں سے لاھور ہوتے ہوے دلی فایز ہوے ۔ اور چند روز کے بعد (۳ ستمبر کو) اطلاع دی کہ ابھی وہیں ٹھیرے رہیے ادھر آنے کا قصد نہ کرنا ۔

۱۰ ستمبر کی شب کو قائداعظم رحلت‌فرما گئے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ پاکستان پر اندھیرا چھا گیا ۔ لوگ اس خبر کو سن کر مبہوت ہوکر رہ گئے ۔ دوسرے دن یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدرآباد پر چڑھ آئی ہے۔ ۱۸ کو معلوم ہوا کہ ہندی فوجیں حیدرآباد میں داخل ہو گئیں ۔ رو سیاھی کا وہ داغ جو کبھی بنگال اور دکن

کے چہروں پر نمایاں ہوا تھا اس تاریخ کو حیدرآباد کی پیشانی پر چمکا -

اس کے بعد ظلم و ستم ، جبر و استبداد ، قتل و غارت گری ، تباہی و بربادی اور فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا - جسے دیکھ کر گاندھی جی کی اہمسا منہ چھپاتی پھرتی تھی - حیدرآباد کیا مٹا سات سو سال کی تہذیب اور روایات مٹ گئیں - بھارت کا قبضہ ہوتے ہی سب سے پہلے اردو پر آفت آئی - تعلیم گاہوں ، دفتروں ، عدالتوں ، اسٹیشنوں ، سڑکوں تک سے خارج کردی گئی - یوں تو بھارت راج نے ہر جگہ آردو دشمنی کا اظہار کیا لیکن حیدرآباد میں جس بے دردی سے اسے مٹایا ہے اس کی نظیر نہیں -

حیدرآباد کے قبضے کے بعد اُن لوگوں پر سختی نہ رہی جن کا تعلق حیدرآباد سے تھا - اس لیے میں ۳ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے دلی روانہ ہوا - میرے ہم سفر میرے مہربان خان عبد اللطیف خاں تھے - جہاز سات بجے شام کو دلی پہنچا اور شہر پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہوگئی - میں نے خان صاحب سے کہا کہ مجھے مطبع مجتبائی کے مکان تک پہنچا دیجیے - جہاں میرے ملازم ٹھیرے ہوے تھے - وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ قیام کے لیے کوئی جگہ نہیں - خان صاحب اپنی مہربانی سے مجھے اپنے ساتھ میر بدرالاسلام صاحب کے ہاں لے گئے جہاں وہ خود بھی ٹھہرنے والے تھے - ہم رات کو دیر سے پہنچے مگر میر صاحب بڑی مروت اور عنایت سے پیش آئے - دوسرے دن بھی وہیں قیام کیا۔

اس سے قبل میں لکھ چکا ہوں کہ قدوای صاحب نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اینگلو عربک کالج جو خالی پڑا ہے انجمن کو اس میں منتقل کرلیا جائے چناںچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے جب میں نے ذکر کیا تو اُنھوں نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا - میں تو کراچی اس لیے واپس چلا آیا تھا کہ مجھے دلی میں ٹھیرنے کا کوی ٹھکانا نہ ملا مگر حامد علی صاحب اور یعقوب صاحب اور دوسرے ملازم وہیں تھے - اُنھوں نے کتاب خانہ عربک کالج میں منتقل کر دیا - اور اس کی اطلاع مجھے دی اور یہ بھی لکھا کہ وہاں میرے ٹھیرنے کے لیے بھی کمرے ہیں - اس سے مجھے اطمینان ہوگیا - خیال یہ تھا کہ عربک کالج کو از سر نو

چلانے میں دو سال سے کم نہ لگیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ پنجاب کے ہندو اور سکھ شرنارتھی جو دہلی میں آکر پناہ گزیں ہوئے وہ اور ان کے بال بچے ہندی نہیں جانتے تھے اردو جانتے تھے ۔ اردو سوا عربک کالج اور اس کے ماتحت مدرسوں کے اور کہیں نہیں پڑھائی جاتی تھی ۔ اس لئے ان شرنارتھیوں کے لڑکے لڑکیاں کثرت سے عربک کالج میں داخل ہوگئیں اور ان کی بدولت کالج پھر چل نکلا ۔ اس لیے ہم انجمن کا سامان اور کتب خانہ پھر نمبر ۱ دریا گنج میں منتقل کرنے پر مجبور ہوگئے ۔ اس آر جار میں کتابوں کی ترتیب میں ابتری پیدا ہوگئی اور شکست و ریخت سے نقصان پہنچا ۔

مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم کے فرزند خلیق الرحمن صاحب نے اپنی مہربانی سے مطبع مجتبائی کے مکان کے اوپر کا ایک حصہ میرے قیام کے لیے معین کر دیا ۔ دلی پہنچنے کے دو دن بعد یعنی ۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور حقیقت حال بیان کی کہ انجمن کے لیے کوی مکان نہیں ملتا ۔ انجمن کے نام سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں ۔ انھوں نے فرمایا کہ بہت بدگمانیاں ہیں ۔ آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے ۔ یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں ۔ میں نے کہا میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان ، ایران ، چین ، عرب ، انڈونیشیا وغیرہ میں ۔ رہی بدگمانیاں تو ان کے دفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے اس کے لیے پوری آزادی ہو ۔ خصوصاً اردو کے لیے جو یہاں کے کروروں انسانوں کی زبان ہے ۔ کہا یہ ٹھیک ہے لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں ۔ میں نے کہا آپ تعزیرات ہند میں ایک دفعہ کا اضافہ کیوں نہیں کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہی ختم ہوجائے ۔ جناب کیفی صاحب سے ملا وہ اس سے قبل ڈاکٹر تارا چند سے ملے تھے انھوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں ۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ہم سے بدگمان ہے ۔

اب ہمارا کام فی الحال یہ رہ گیا تھا کہ صبح نکلتے کے بعد کتب خانے جاتے ، کتابوں کی ترتیب درست کرتے اور جو خراب اور شکستہ ہوگئی تھیں یا بارش

کی وجہ سے جن کی حالت بہت ابتر ہوگئی تھی ان کو الگ رکھتے جاتے ۔ شام کو قیام گہ پر واپس آتے ۔ ایک ہفتے کے بعد میں (۱۲ اکتوبر کو) پھر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا اور کہا کہ میں نے آپ کی تجویز پر غور کیا اور بعض دوستوں سے بھی مشورہ کیا ۔ یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کو ہم کراچی لے جائیں ۔ اس صورت میں ہمیں کتب خانہ لے جانے کی سہولت ملنی چاہیے اور جو رقم انجمن نے حکومت ہند کو زمین کی قیمت میں ادا کی تھی وہ واپس ہونی چاہیے ۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ مجھے لکھیے ، یہ دونوں باتیں آسانی سے ہوجائیں گی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے بھی مجھ سے یہی فرمایا کہ ظاہر ہے آپ اپنا اصول نہیں بدلیں گے ، اس لیے یہاں رہ کر کام کرنا آپ کے حق میں مناسب نہ ہوگا ۔

غور کرنے کے بعد میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ اس معاملے کو انجمن کی مجلس نظما میں پیش کر دیا جائے ۔ چناں‌چہ ارکان مجلس نظما کو اطلاع کردی گئی کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۸ع کو مجلس کا ضروری جلسہ حبیب منزل علی گڑھ میں ۴ بجے ہوگا ۔

حامد علی صاحب کی پرمٹ کی مدت ختم ہو رہی تھی میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھا کہ وہ مہربانی فرماکر حامد علی صاحب کو اپنے ساتھ ڈپٹی کمشنر صاحب کی خدمت میں لے جائیں اور ان کے پرمٹ میں توسیع کرادیں ۔ اس وقت یہاں میرے پاس کوئی آدمی نہیں چند روز ان کا میرے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے ۔ ڈاکٹر صاحب حامد علی صاحب کو لے گئے لیکن ڈپٹی کمشنر بری طرح پیش آیا ڈاکٹر صاحب کا بھی کچھ خیال نہ کیا بلکہ کہنے لگا کہ اس قسم کے معاملات میرے پاس نہ لایا کریں ۔ توسیع کا کوی وعدہ نہ کیا اور کہا پولیس سے دریافت کروں گا حامد علی صاحب عجیب شش و پنج میں تھے ۔ صرف ایک دن کی مہلت باقی تھی ۔ اگر وہ نہیں جاتے اور یہیں ٹھیرے رہتے ہیں تو پولیس گرفتار کرلے گی ۔ ڈپٹی کمشنر کا کوئی اعتبار نہیں توسیع دے یا نہ دے ۔ اس کے تیور اچھے نہیں معلوم ہوتے ۔ حامد علی صاحب نے آخر مجھسے پوچھا کہ کیا کروں ۔ میں نے کہا کہ قانون کی پابندی کرنی چاہیے آپ فوراً کراچی چلے جایے ۔ اگر ڈپٹی کمشنر توسیع کا وعدہ

کرتا تو ٹھیرنے میں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ غرض حامد علی صاحب روانہ ہوگئے۔ یہ ۱۷ اکتوبر کا واقعہ ہے۔ اسی تاریخ کو یہ معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے نمبر۱ دریاگنج میں انجمن کے کتب خانے کو مقفل کرکے سر بہ مہر کردیا ہے۔ اس اطلاع سے مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ دوسرے دن مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا اور اُن سے حقیقت حال بیان کی۔ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کچھ اندیشے کی بات نہیں۔ میں چیف کمشنر سے فون کرکے دریافت کروں گا۔ دو روز بعد میں پھر مولانا سے ملا تو اُنھوں نے معذرت کی اور کہا میں بھول گیا اب دریافت کروں گا۔ میں نے اُن کو مجلس نظما کے اجلاس کا دعوت نامہ دیا اور اس لفافے میں اپنا نجی خط بھی رکھ دیا جس میں ان کے اطیمنان کے لیے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ کی تجویز سے مجھے اتفاق ہے اور یہ معاملہ مجلس نظما میں پیش کرکے قطعی فیصلہ کرلیا جائے گا۔

۲۰ اکتوبر کو آنریبل مسٹر رفیع قدوائی سے ملا۔ اور اُن سے تمام کیفیت بیان کی۔ اُنھوں نے کہا ڈپٹی کمشنر سے ملیے۔ میں نے کہا وہ بہت بدتمیز ہے میں اس سے نہیں ملوں گا اور اُن سے ڈاکٹر ذاکر حسین اور حامد علی کی ملاقات کا حال بیان کیا۔ کہا کہ میں چیف کمشنر سے دریافت کروں گا، آپ اُن سے ملیے۔ میں چوں کہ الہٰ باد جانے والا تھا نہ مل سکا۔ البتہ خط لکھ کر اصل کیفیت سے اطلاع کردی اور کتب خانے پر سے بندش اُٹھانے کی درخواست کی۔

میں نے مولانا کی خدمت میں جو مجلس نظما کے جلسے کے اطلاع نامہ کے ساتھ اپنا نجی خط دیا تھا اس کے جواب میں مولانا کا خط وصول ہوا۔ مولانا کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں میں مجلس نظما میں وہ سب باتیں نہ کہدوں جو اُنھوں نے مجھ سے اس بارے میں فرمائی تھیں اور اس غلط گمان پر اُنھوں نے خود ہی اپنے بیان کی تردید کرنے کی تکلیف فرمائی۔ ان کا قیاس در حقیقت ان کے دل کا چور تھا۔ میں دونوں خط یہاں نقل کرتا ہوں۔ اُن کو پڑھنے کے بعد آپ کو مولانا کی غلط بیانیوں پر اسی قدر افسوس ہوگا جس قدر مجھے ہوا۔ لیکن جس بات سے مجھے سخت تکلیف اور رنج ہوا وہ مولانا کا یہ فقرہ تھا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ گرانٹ کی درخواست انٹرم گورنمنٹ کے زمانے میں کی گئی تھی۔ اُس وقت مالیات کا صیغہ مسٹر لیاقت کے ہاتھ میں تھا۔ اُنھوں نے گرانٹ دینے سے انکار کردیا تھا"

اسی کے معنی ہیں دروغ گویم بر روئے تو۔ امداد کی درخواست دینے والا میں تھا اور میری موجودگی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اس کی منظوری دی اور میں نے اس کے بعد بار بار مولانا سے اجرائے امداد کا تقاضا کیا اور وہ ٹالتے رہے میرے جواب میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ میں مولانا کی ایمانی لچک سے تو واقف تھا لیکن یہ بات میرے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ ایسی صریح خلاف واقعہ بات کہیں گے۔

نقل خط جناب مولانا ابوالکلام آزاد

دھلی ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء

جناب من! آپ اپنے خط مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں ”آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ دیا تھا، اس سے مجھے اتفاق ہے،، ”مشورہ،، سے مقصود غالباً یہ معاملہ ہے کہ اب انجمن ترقی اردو کو پاکستان منتقل کردیا جائے اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے صورت حال کی جو تعبیر کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ براہ عنایت اپنے فیصلہ کو میرے مشورہ کا جامہ نہ پہنائیے۔

اس سلسلہ میں جو حالات پیش آئے وہ حسب ذیل ہیں: دھلی کے فساد کے بعد جب آپ آئے تو آپ نے مجھے یقین دلایا کہ انجمن بدستور اپنے کاموں کو یہاں جاری رکھنا چاہتی ہے اور آپ ایک نیا مکان دفتر کے لیے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کراچی چلے گئے اور ایک عرصہ تک کوئی خبر آپ کی نہیں ملی اب آپ آئے تو آپ کے پرمٹ سے معلوم ہوا کہ آپ نے انڈین یونین کی سکونت ترک کردی ہے اور پاکستان کے باشندہ ہونے کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ساتھ ہی معلوم ہوا کہ کراچی میں آپ نے ایک مکان حاصل کرلیا ہے اور انجمن کو وہاں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب آپ مجھ سے ملے تو میں نے یہ رائے ظاہر کی کہ تعطل و تعلیق کی موجودہ صورت حال جلد سے جلد ختم کر دینی چاہیے آپ نے ایک قدم پاکستان میں جمایا ہے، دوسرا یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طرز عمل انجمن کے لیے سود مند نہ ہوگا۔ اس پر آپ نے کہا کہ آپ کو کراچی میں ایک بہت اچھا مکان مل گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں انجمن کو وہاں منتقل کر دیں۔ پس

اس بارے میں آپ نے جو رائے بھی قائم کی ہے آپ کی رائے ہے۔ اسے میرے مشورے سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار بار یہ خیال ظاہر کرچکا ہوں کہ انجمن ہندستان میں قائم ہوئی تھی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں وہ اپنا کام یہاں جاری نہ رکھے؟ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی خواہش مند نہیں ہے کہ انجمن اپنے کاموں کو یہاں بند کردے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال ایجوکیشن منسٹری نے انجمن کے لیے ایک گرانٹ منظور کی ہے اور اسے کام میں نہ لانے کی پوری ذمہ داری ارکان انجمن کے سر ہے۔ چار لاکھ عمارت کے لیے اور چالیس ہزار سالانہ انجمن کے کاموں کے لیے گورنمنٹ منظور کرچکی ہے ظاہر ہے کہ جو گورنمنٹ انجمن کو گرانٹ دے رہی ہے وہ انجمن کے اجراء کار کی مخالف کیسے ہوسکتی ہے؟

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ گرانٹ کی درخواست انٹرم گورنمنٹ کے زمانے میں کی گئی تھی۔ اس وقت مالیات کا صیغہ مسٹر لیاقت علی کے ہاتھ میں تھا انھوں نے گرانٹ دینے سے انکار کردیا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب نئی قومی حکومت بنی تو اس کے عہد میں ازسر نو یہ معاملہ اٹھایا گیا اور گرانٹ منظور کی گئی۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجمن پورے سکون اور جمعیت کے ساتھ اپنے کاموں کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ بشرطیکہ کام کرنے کا ارادہ ہو۔ میں چاہتا ہوں اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو اس لیے مہربانی کرکے یہ خط ۲۶ اکتوبر کے مجوزہ جلسہ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

والسلام

(شرح دستخط) ابوالکلام

اس کے جواب میں حسب ذیل خط میں نے مولانا کو تحریر کیا :۔

دہلی۔ مطبع مجتبائی، چوڑی والان۔ دہلی

مورخہ ۲۰ اکتوبر ۴۸ء۔

جناب والا۔ گرامی نامہ پہنچا۔ میں نے اپنے خط میں جو پرایویٹ تھا۔ جس میں صرف آپ کے مشورہ کا لفظ تھا اور اس کی کوئی تصریح نہیں کی تھی کیونکہ وہ گفتگو پرایوٹ تھی اور میرا مطلق ارادہ نہ تھا کہ مجلس نظما میں اس کا حوالہ

دیا جاتا - لیکن اب چونکہ آپ نے خود یہ خواہش ظاہر فرمائی ہے کہ آپ کا خط جلسے میں پیش کر دیا جائے لہذا مجھے مجبوراً اس گفتگو کا حوالہ دینا پڑے گا -

اس میں مطلق شبہ نہیں کہ میں بدستور یہاں کام کرنا چاہتا تھا اور اب بھی یہاں کام کرنے کے لیے آمادہ ہوں اس سے قبل حیدرآباد بھوپال سے آیا اور اب کراچی سے اسی نیت سے آیا ہوں - لیکن باوجود کامل سعی اور تگ و دو اور آپ کی عنایت کے کوئی مناسب مکان نہیں ملا جس میں انجمن کا دفتر اور اس کا کتب خانہ وغیرہ رکھا جاسکے ، یہاں تک کہ مجھے اپنے ٹھہرنے کے لیے بھی کوئی جگہ نہ ملی - پہلی بار آپ کے یہاں چند روز قیام کیا اور پھر نظام پیلس گیسٹ ہاؤس میں جاکر رہا - دوسری مرتبہ زاہد حسین صاحب کے یہاں مہمان رہا - اور جب مکان کی دستیابی میں مطلق کامیابی نہ ہوئی اور زاہد حسین صاحب کا تبادلہ بھی کراچی ہوگیا اور میرے قیام کی بھی دلی میں کوئی جگہ نہ رہی تو مجبوراً کراچی چلا گیا - وہاں میں نے پاکستان کے لیے ایک الگ مرکز قائم کیا - کیونکہ تقسیم کے بعد انجمن کی ان شاخوں کا الحاق دہلی کے مرکز سے نہیں ہوسکتا تھا جو پاکستان میں تھیں -

جن حالات کا آپ نے اپنے خط میں ذکر فرمایا ہے وہ اکثر غلط اطلاع پر مبنی معلوم ہوتے ہیں - آپ نے میرا پرمٹ ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ آپ یہ تحریر نہ فرماتے کہ میں نے انڈین یونین کی سکونت ترک کر دی ہے اور پاکستان کے باشندہ ہونے کی حیثیت حاصل کرلی ہے - میرے پرمٹ میں مجھے ہندستانی لکھا ہے ، پاکستانی نہیں لکھا - میں نے بے شک کراچی میں انجمن کے لیے ایک مکان حاصل کیا ہے لیکن میں نے اس انجمن کو وہاں منتقل نہیں کیا - انجمن کا تمام سامان دفتر اور کتب خانہ یہاں دہلی میں موجود ہے - کراچی میں پاکستان کے لیے بالکل الگ مرکز قائم ہے جس کا کوئی تعلق دہلی کے مرکز سے نہیں ہے اور اس کی وجہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں - تعطل و تعلیق کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ جس مکان میں انجمن تھی فساد کے زمانے میں اس پر بھارت انشورنس کمپنی کا قبضہ ہوگیا اور انجمن کا دفتر اور سامان اور میرا ذاتی اسباب لوٹ لیا گیا - باقی جو کچھ بچ رہا اب تک یہیں پڑا ہے - صرف انجمن کا کتب خانہ اس مکان کے ایک حصے میں اب تک موجود ہے - اگرچہ بار بار کوشش

کرنے پر بھی مکان نہیں ملا ۔ تاہم انجمن کا کام برا بھلا جاری رہا اور اب تک جاری ہے ۔ جب مجھے باہر جانا پڑا تو میرے دفتر کے منیجر اور منشی وغیرہ برابر یہاں رہے اور کام کرتے رہے ۔

حال میں جب میں دلی آیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بلاشبہ آپ نے یہ فرمایا کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے ایک وہاں ، یہ ٹھیک نہیں ۔ آپ نے اب جہاں مرکز بنایا ہے وہیں رکھیے ۔ لاہور اس کے لیے زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ کام کرنے والے وہیں ہیں ۔ کراچی اس لحاظ سے زیادہ مناسب نہیں ۔ میں نے عرض کیا کہ " ہم دونوں جگہ کام کرنا چاہتے ہیں ۔ زبان اور کلچر کے لیے کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے ۔ بلکہ ہم تو ہندستان اور پاکستان کے باہر بھی اس کام کو کرنا چاہتے ہیں "۔ آپ نے فرمایا ۔ " بدگمانیاں بہت ہیں اور حالات ناسازگار ہیں "۔ میں نے عرض کیا کہ بدگمانیاں رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر کی اشاعت پر کوئی پابندی نہ ہو اور اردو تو باہمی اتحاد اور یک جہتی کی پیداوار ہے ۔ اس پہلی ملاقات کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ دلی کے بعض احباب سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا ان کی بھی وہی رائے ہے جو آپ نے ظاہر فرمائی ہے اور مجھے بھی اتفاق ہے ۔ آپ نے اس پر مسرت کا اظہار فرمایا ۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اگر ایسی صورت ہوئی تو ہمیں انجمن کے سامان اور کتب خانے وغیرہ کے منتقل کرنے میں پوری سہولت ملنی چاہیے اور جو رقم انجمن نے نئی دھلی میں زمین خریدنے کے لیے حکومت ہند کو ادا کی ہے وہ بھی واپس ملنی چاہیے ۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے لکھ بھیجیے ۔ دونوں کام بہت آسانی سے ہوسکتے ہیں ۔ لیکن میں نے اس بارے میں آپ کو نہیں لکھا ۔ کیونکہ جب تک مجلس نظما میں معاملے کو پیش کرکے منظوری حاصل نہ کی جائے مجھے ایسا کرنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا ۔ چنانچہ اسی بنا پر اب یہ معاملہ مجلس نظما میں پیش کیا جارہا ہے ۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ مسٹر لیاقت علی خاں نے گرانٹ دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ مجھے اس کا ذاتی علم ہے اور یہ منظوری انہوں نے خاص طور پر دی اور میں نے بذات خود اس تحریر کو دیکھا ہے ۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سین سے کہا کہ جب گرانٹ منظور ہوچکی ہے تو اسے جاری کیوں نہیں کیا جاتا ۔ انہوں نے کہا

کیبنٹ میں یہ معاملہ پیش کیا جائے گا ۔ میں نے کہا کہ جب فنانس منسٹر کو کوئی اعتراض نہیں اور نہ کسی اور کو تو پھر کیبنٹ میں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ میں نے دہلی نیز شملے حاضر ہو کر بار بار آپ کی خدمت میں گزارش کی کہ گرانٹ منظور ہوچکی ہے اجراء کے احکام ہو جانے چاہئیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر جن کا علم مجھے نہیں ، اس معاملے میں ڈپارٹمنٹ کی طرف سے برابر تساہل ہوتا رہا اور سرکاری طور پر انجمن کو اب تک یہ اطلاع نہیں دی گئی کہ کس قدر رقم منظور کی گئی ہے ۔ حال میں جب میں نے سکرٹری صاحب تعلیمات کو اس کے متعلق لکھا تو انہوں نے ایک مبہم سا جواب دیا جس سے کچھ معلوم نہ ہوسکا ۔ جب اس کی تصریح طلب کی گئی تو کوئی جواب نہ ملا ۔ انجمن پر یہ الزام غلط ہے کہ اس نے گرانٹ حاصل نہیں کی اور اسے کام میں نہیں لائی ۔

مجھے یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ گورنمنٹ انجمن کے اجرائے کار کی مخالف نہیں ۔ لیکن جو برتاؤ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے وہ بہت قابل افسوس ہے ۔ سی آئی ڈی ہمارے درپے ہے اور ہماری آمد و رفت اور ہمارے ہر کام کی نگرانی کی جاتی ہے ۔ پولیس نے ہمارے کتب خانے پر مہر کردی ہے اور ہمیں اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ۔ اور دو مسلح سپاہی شب و روز وہاں پہرا دیتے ہیں تاکہ ہم وہاں نہ جاسکیں ۔ اس سے انجمن کے وقار اور کام کو بڑا نقصان پہنچا ۔ اس برتاؤ کے بعد ہمیں کام کرنے میں کیا مسرت ہوسکتی ہے اور ہمیں کیونکر یقین ہوسکتا ہے کہ گورنمنٹ ہماری حامی و مددگار ہے۔

خادم

(شرح دستخط) عبدالحق

دوسرے دن یعنی ۲۱ اکتوبر کو میں الہ‌آباد روانہ ہوگیا ۲۲ اکتوبر کو سر تیج بہادر سپرو سے ملا ۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے بہت قلق ہوا ۔ ہاتھ پاؤں کام نہیں دیتے تھے آواز بھی بہت دھیمی ہوگئی تھی ۔ ملازم سگرٹ سلگا کر ان کی انگلیوں میں رکھ دیتا تھا ۔ وہ اس کی راکھ تک نہیں جھاڑ سکتے تھے ۔ ملازم ان کے ہاتھ سے لے کر اور راکھ جھاڑ کر پھر ان کی انگلیوں میں لگا دیتا ۔ لیکن دماغ اور حافظہ بدستور تھا ۔ انجمن پر جو کچھ گزری تھی وہ سب کیفیت میں نے ان سے بیان کی تو سن

کر بہت افسوس کیا اور بڑے درد بھرے الفاظ میں فرمایا ''اب اردو کا نام لینا جرم ہے،، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب جو میرے ساتھ تھے اُن سے فرمایا کہ جب جواھر لال واپس آجائیں تو مجھ سے اُن کے نام خط لکھوالینا تاکہ میں یعنی عبدالحق اس کے ذریعہ پنڈت جواھر لال سے مل سکیں۔

۲۴ اکتوبر کو ھندستانی اکیڈیمی کی کونسل کا جلسہ تھا اس میں شریک ھوا۔ اس میں اردو کے ختم کرنے اور اکیڈیمی کو حسب منشائے حکومت ھندی اکیڈیمی بنانے کا مسئلہ پیش تھا۔ اکیڈیمی میں آج اردو کا قل تھا اور میں فاتحہ پڑھ کر واپس آگیا۔ شب کی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ھوا۔

۲۶ کو ۳ بجے حبیب منزل (دولت کدہ مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی) میں انجمن کی مجلس نظما کا جلسہ قرار پایا تھا یہ تاریخ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مشورے سے مقرر کی گئی تھی مگر باوجود وعدے کے وہ کسی ضروری کام کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ ان کا خط ھمیں مل گیا تھا۔ بعد معذرت کے تحریر فرمایا کہ ''معاملہ زیر غور کے متعلق میری جو رائے ہے وہ لکھتا ھوں:—

میری رائے ہے کہ اردو کی ترقی و ترویج کا کام ھندستان میں اب پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے اس کام کا کوئی نہ کوئی انتظام ھونا چاھیے۔ لیکن ساتھ ھی میری یہ رائے بھی ہے کہ انجمن ترقیٔ اردو کے کام کی جو نوعیت گزشتہ چند سال میں رھی اس کے پیش نظر موجودہ کارکنوں کا یہاں کام کرنا بہت دشوار ھوگا۔ انھیں پاکستان میں اردو کی خدمت میں زیادہ سہولت ھوگی اور وھاں وہ مفید کام انجام دے سکیں گے۔ اس لئے انھیں وھاں کام کرنا چاھئے اور یہاں خدمت اردو کے لئے کوئی دوسرا انتظام ھونا چاھئے۔ انجمن ترقیٔ اردو (ھند) کے لئے دوسرے کارکن مقرر کر کے اسے یہاں قائم رکھا جائے۔ اور موجودہ کارکن پاکستان میں دوسری انجمن قائم کرلیں۔ میری رائے ہے کہ پاکستان اور ھند کے سیاسی تعلقات کی موجودہ حالت میں یہ غیر مناسب ھوگا کہ پاکستان اور ھندستان کے اس کام میں کوئی انتظامی یا شخصی تعلق رہے۔ والسلام،، نصاب پورا نہ ھونے کی وجہ سے جلسہ ملتوی کیا گیا اور ۲۷ اکتوبر کو قرار پایا۔ ایک آدمی خاص طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تاکہ وہ اس روز ضرور شرکت فرمائیں۔ مگر

وہ اُس روز بھی نہ آسکے ۔ جلسے میں ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جناب کیفی صاحب شریک رہے ۔ جس میں چند قراردادیں منظور ہوئیں ۔

۲۸ اکتوبر کو میں اور کیفی صاحب دھلی روانہ ہوگئے مولوی بشیرالدین صاحب (اٹاوہ) بھی میرے ساتھ آئے اور میرے پاس قیام کیا ۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ سر تیج بہادر سپرو نے باوجود شدت مرض میری ملاقات کے دوسرے ہی دن ۲۳ اکتوبر کو ایک خط ڈاکٹر تارا چند کو اور دوسرا مسٹر شنکر پرشاد چیف کمشنر کو لکھا اور انجمن کے معاملے کی طرف توجہ دلائی ۔ چیف کمشنر کے خط میں انہوں نے انجمن سے اپنے تعلق کا اظہار کیا اور میرے نسبت چند کلمات لکھے ۔ ان دونوں خطوں میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ انجمن نے کبھی سیاسی امور میں دخل نہیں دیا ۔ یہ سچ ہے کہ اس کا مقصد اردو کی ترقی و اشاعت ہے ۔ لیکن قانون کی رو سے یہ کوئی جرم نہیں ۔ اگرچہ صوبجات متحدہ کی حکومت ھندی کے حق میں بڑا جوش خروش دکھا رہی ہے اور بعض دوسری حکومتوں نے بھی ھندی کو لنگوا فرینکا قرار دیا ہے ۔ چیف کمشنر کے خط میں سر تیج بہادر نے یہاں تک لکھا کہ میں بذاتہ خود دلی آکر آپ سے اس معاملے پر گفتگو کرتا لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں فالج کی وجہ سے صاحب فراش ہوں اور کہیں آنے جانے کے قابل نہیں ۔ میں نہایت ممنون ہوں گا اگر آپ انجمن کا معاملہ ٹھیک ٹھاک کردیں گے ۔ چیف کمشنر نے سر تیج بہادر کے خط کا جو جواب لکھا اُس کی نقل سر تیج نے مجھے بھیج دی ۔ اُسے پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا ۔ اُس میں بھی طرح طرح کی غلط بیانیاں ہیں ۔ جو پولیس نے کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہے ۔ یہی انگریزی حکومت میں ہوتا تھا ۔ اور یہی اب ہورہا ہے ۔ میں نے سر تیج بہادر کو سچے حالات لکھ بھیجے اور ان بدگمانیوں اور غلط بیانیوں کی تردید کی جو چیف کمشنر نے اپنے خط میں بیان کی تھیں ۔ اس کی نقل یہاں درج کرتا ہوں ۔ اس سے سارا معاملہ آئینہ ہوجائے گا ۔

نقل خط موسومہ جناب سر تیج بہادر

دھلی ۔ خلیق منزل محلہ چوڑی والان ۔

۱۶ - نومبر ۴۸ ع

جناب مخدوم و محترم مد ظلہ ، تسلیم

ڈاکٹر صدیقی صاحب نے مجھے مسٹر شنکر پرشاد چیف کمشنر دھلی کے خط

موسومہ آنجناب کے اس حصے کی نقل بھیجی جو انجمن کے متعلق تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ یہ خط پولیس کی غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ میں دلی میں موجود تھا۔ اگر مجھے طلب کر کے دریافت حال فرما لیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ غالباً انھیں پولیس پر زیادہ اعتماد ہے اور پولیس کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے۔

یہ سچ ہے کہ انجمن کے مکان پر جب حملہ ہوا اور اس کا سامان اور اسباب لوٹ لیا گیا تو اس کے بعد انجمن کے بعض ملازمین کی تگ و دَو اور کوشش سے پولیس کا پہرہ مقرر کر دیا گیا تھا جو کچھ دنوں کے بعد ہٹالیا گیا۔ میں اور انجمن کے دو اور کارکن شروع نومبر ۱۹۴۷ء میں دلی پہنچے تو دیکھا کہ انجمن کا دفتر تباہ کر دیا گیا ہے اور اس کے رجسٹر، مسایل اور دوسرے کاغذات تلف کر دیئے گئے ہیں۔ میرا ذاتی سامان سب کا سب لوٹ لیا گیا ہے۔ موٹر توڑ پھوڑ دی گئی ہے غسل خانوں باورچی خانوں، گدام، ورانڈوں اور ایک دو کمروں میں ردیوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ہم نومبر ۱۹۴۷ء سے اب تک بچے کھچے سامان کی درستی اور تلاش اور معمولی دفتر کے کام میں لگے رہے۔ ردیوں کے انباروں کی چھٹائی میں کئی مہینے لگ گئے۔ ان ردیوں کا ایک ایک کاغذ دیکھا گیا۔ ان میں کچھ پھٹے پھٹائے کاغذ، بعض قلمی نسخوں کے کچھ متفرق ورق ایک انبار میں کچھ دوسرے میں اور کوئی ورق کہیں ایک جگہ اور کوئی دوسری جگہ ملا۔ ان کو ہم جوڑ کر درست کرتے رہے۔ تو بھی ادھورے اور ناقص رہے۔ بعض پھٹ پھٹا کر گل گلا کر بالکل بیکار ہوگئے اور بعض کا پتہ نہ لگا۔

علاوہ کتب خانے کے مکان کی کتابوں کا ایک خاصا حصہ اس بڑے کمرے میں تھا جس میں میں لغت وغیرہ کا کام کیا کرتا تھا۔ اس میں کچھ کتابیں کھلی الماریوں میں تھیں اور کچھ دو فولادی الماریوں میں مقفل تھیں۔ لٹیروں نے یہ سمجھ کر کہ ان میں زر و مال ہوگا ان کو توڑا اور جب ان میں ان کے کام کی کوئی چیز نہ ملی تو غصے کی جھانجھ میں کتابیں اور کاغذات اٹھا اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ ان میں بہت سے نادر قلمی نسخے اور کاغذات، اردو لغت اور نئی طبع ہونے والی کتابوں کے مسودے بھی تھے۔ چونکہ مکان پر بھارت انشورنس کمپنی کا قبضہ ہوگیا تھا اور اس کو کمرے خالی کرانے کی ضرورت تھی اس لیے لوٹ سے جو چیزیں بچیں وہ باہر

صحن میں پھینک دی گئیں ۔ اور کچھ دنوں تک وہیں پڑی رہیں ۔ اس کے بعد مالک مکان نے مزدوروں سے آٹھوا کر غسل خانوں ، باورچی خانوں اور برآمدوں وغیرہ میں پھٹے پرانے کاغذوں اور اخباروں کی ردیوں کے ساتھ ڈلوادیں ۔ ان ردیوں میں سے کچھ چیزیں مسخ اور شکستہ حالت میں ملیں اور باقی تلف ہوگئیں ۔

مولوی حامد علی صاحب کا ذکر اس خط میں اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا وہ ایک غیر اور مشتبہ شخص ہیں ۔ یہ بات نہیں ہے ۔ وہ دفتر انجمن کے منیجر ہیں جو کئی سال سے کام کر رہے ہیں گزشتہ فسادات کے زمانے میں بھی دلی میں تھے ۔ جب حملہ آوروں کا زور ہوا تو وہ بعض دوسرے ملازمین کی طرح پریشانی کے عالم میں جان سلامت لے کر نکل گئے ۔ جو رہ گئے ۔ وہ قتل کر دے گئے حامد علی صاحب کے بیوی بچے کسی ہم درد کے توسط سے ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی جاپہنچے آن کی خبرگیری کے لیے یہ بھی وہاں چلے گئے ۔ آن کے عزیزوں کے رہنے سہنے کا انتظام ہوگیا تو وہ میرے ساتھ جنوری ۱۹۴۸ء میں دلی آ گئے ۔ اس عرصے میں برابر کتابوں اور سامان کی درستی اور ردیوں کی چھٹائی اور دفتر کا انتظام ہوتا رہا ۔ اور اس کے ساتھ برابر یہ کوشش ہوتی رہی کہ کوئی مناسب مکان مل جائے تو انجمن کو آس میں منتقل کر دیا جائے ۔ . . . .

چیف کمشنر صاحب نے اپنے خط میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ پاکستان سے کسی شخص کو بلانے کی کیا ضرورت تھی ۔ کیا یہاں کوئی آدمی اس کام کے لیے نہیں مل سکتا تھا ۔ بلاشبہ یہاں ہمارے کام کے لیے ایسا کوئی آدمی نہیں مل سکتا تھا کیونکہ حامد علی صاحب انجمن کے منیجر کی حیثیت سے تمام کاروبار اور حسابات اور مراسلت وغیرہ سے پورے طور پر واقف تھے ۔ اور فسادات کے بعد بچے کھچے کاغذات اور سامان سمیٹ کر آنھیں نے رکھا تھا اس لیے وہی ان چیزوں کی نشان دہی اور پڑتال کر سکتے تھے ۔ نیز انجمن کے حسابات وغیرہ کی کیفیت بھی آنہیں سے معلوم ہوسکتی تھی ۔ کوئی غیر شخص یہ کام نہیں کر سکتا تھا ۔

چیف کمشنر صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نودس قلمی کتابیں لائبریری سے غائب ہوگئی ہیں ۔ یہ آنہیں کیونکر معلوم ہوا ؟ ۔ اس میں شک نہیں کہ قتل و غارت گری کے زمانے میں بعض قلمی نسخے ، قیمتی کاغذات

مثلاً ناسخ ، غالب ، سرسید احمد خاں ، مولانا حالی ، نواب محسن الملک ، نواب عمادالملک ، ڈاکٹر اقبال وغیرہ کے خطوط اور بعض قدیم فرامین اور خاص کر میری اردو لغت کے مسودے جو میری عمر بھر کی تحقیق اور محنت کا نتیجہ تھے تلف ہو گئے۔جس کامجھے سخت صدمہ ہے۔ حامد علی کبھی تنہا کتب خانے میں نہیں گئے ۔ میں اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا اور کتب خانےکی کنجی میرے پاس رہتی تھی۔ وہ وہاں سے کوئی کتاب نکال کر نہیں لائے البتہ میں وہاں سے کچھ بچے کھچے کاغذات اور پرچے (زیر تالیف اردو لغت کے) اور بعض کتابیں اپنی قیام گاہ پر لے آیا کیونکہ میں یہاں بیکار نہیں رہنا چاہتا تھا ادبی کام جو کر رہا تھا یہاں بھی کرتا رہتا ہوں ۔ کچھ کتابیں ایسی بھی لایا جوسیل گئی تھیں ۔ انہیں صاف کر کے دھوپ دکھانے کی ضرورت تھی ۔ اس میں کوئی ناجائز بات نہیں ہے۔ یوں بھی جب کبھی موسم گرما میں یا کسی دوسری ضرورت سے کسی دوسرے مقام پر چلاجاتا تو بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لے جاتا تھا ۔ چوں کہ موجودہ کتب خانے کے مکان میں کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں اس لیے وہاں سے اپنی قیام گاہ پر کتابیں لانا کوئی جرم نہیں۔ یہ میں ہمیشہ کرتا رہا ہوں ۔ بلکہ بعض یونی ورسٹیوں کو بھی ان کی درخواست پر بعض کتابیں مستعار بھیجتا رہا ہوں ۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ہم کتابیں پاکستان لے جانا چاہتے ہیں ۔ اگر ہمارا یہ منشا ہوتا تو اس زمانے میں جب کہ نہ پرمٹ کا جھگڑاتھا نہ کسٹم کا ہم آسانی سے لے جاسکتے تھے ۔ لیکن ہم نے کبھی اس کا خیال تک نہیں کیا ۔

ایک بات یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کتاب خانے میں بہت بڑا حصہ میری ذاتی کتابوں کا ہے ۔ انجمن کی کتابیں کم ہیں ۔ کیوں کہ ابتدا میں برسوں تک انجمن کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ کتابوں کے خریدنے پر کثیر رقم صرف کرتی اس لیے سارا علمی ادبی کام میرے ذاتی کتاب خانے پر چلتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا روپیہ پیسہ باقاعدہ اعلان کر کے انجمن کے نذر کر دیا ۔ لیکن میں نے اپنا کتب خانہ ابھی تک انجمن کو نہیں دیا ہے ۔ انجمن میں اماناً رکھ دیا ہے۔ تاکہ میرے علاوہ دوسرے علم و ادب کے شایقین بھی اس سے مستفید ہوسکیں ۔ چنانچہ اکثر اہل علم اور بعض یونی ورسٹیوں کے ری سرچ اسکالر

اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا کتب خانہ اس انجمن یا کسی دوسرے ادارے کو اس لیے نہیں دیا کہ اگر حالات میں کبھی انقلاب ہوا یا میں انجمن کی خدمت سے سبکدوش ہوگیا تو میں اپنے علمی و ادبی کاموں میں حسب منشا اس سے پوری آزادی کے ساتھ کام نہ لے سکوں گا۔ آج جب میں یہ دیکھ رہاہوں کہ خود مجھے اپنی کتابوں سے استفادہ کرنے سے محروم کیا جا رہا ہے تو میری یہ دور بینی اور احتیاط اس وقت میرے کام آئی چنانچہ علی گڑھ کے اجلاس نظما میں یہ فیصلہ کردیا گیا ہے کہ میں اپنی ذاتی کتابیں جہاں چاہے لیجاسکتا ہوں انجمن کےکتب خانے میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب کی بھی بہت سی کتابیں امانتاً رکھی ہیں۔ کیوں کہ وہ انجمن ہی میں علمی کام کرتے تھے اُن کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنی کتابیں وہاں سے الگ کرلیں۔

میں ۲۶ سال سے انجمن ترقی اُردو کا آنریری سکرٹری ہوں اور اس کا تمام حساب کتاب، مال و زر، کتابیں اور انتظامات میرے ہاتھ میں رہے۔ آج تک کسی نے میری دیانت اور راست کرداری پر شبہ نہیں کیا اور مجھ پر کامل اعتماد کیا۔ لیکن آج اس نئے دور میں میں مشتبہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خطاوار سمجھا جاتاہوں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ حکومت میں اوپر کے خاص ارکان بہت نیک خیال اور نیک نیت ہیں اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ملک میں انصاف ہو اور خدمت کرنے والوں سے ہم دردی کی جائے۔ لیکن نیچے کے عمّال جن کے ہاتھ میں اصل اقتدار ہے اُن کا حال بالکل دوسرا ہے۔ خود حکومت کو بھی اس کی شکایت ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پہلے غیرحکومت میں ہم نہایت آزادی اور اطمینان سے کام کرسکتے تھے اور اب نہیں کر سکتے۔ جب میں ان حالات پر غور کرتا ہوں تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے اور اس مایوسی کے عالم میں کبھی کبھی دل میں یہ فاسد خیال گزرتا ہے کہ شاید ابھی ہم اس آزادی کے اہل نہ تھے۔

میں نہایت ادب سے اس طویل خط لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ آپ کا مزاج ناساز ہے اس قسم کی جرات نازیبا ہے۔ لیکن چوں کہ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر بے جا بدگمانیاں کی گئی ہیں اس لیے میرا فرض تھا کہ آپ

کو اپنے سرپرست اور رہنما کی حیثیت سے اصل واقعات سے آگاہ کردوں اگر کوئی امر خاطر عالی پر گراں گزرے تو امید ہے کہ آپ ازراہ کرم معاف فرمادیں گے۔ آخر میں میری خلوص دل سے یہ دعا ہے کہ خدائے تعالا آپ کو کامل شفاعطا فرمائے اور تادیر زندہ و سلامت رکھے کہ ہم آپ کے شریفانہ خیالات ، آپ کی صحبت اور آپ کے اخلاق و کردار سے مستفید ہوتے رہیں''۔

خادم

(شرح دستخط) عبدالحق

اس خط کے جواب میں سرتیج بہادر نے مجھے لکھوایا کہ افسوس کہ میں خود خط نہیں لکھ سکتا اور یہ ھدایت فرمائی کہ میں چیف کمشنر صاحب سے مل کر تمام حالات بیان کردوں ۔ وہ بہت منصف مزاج اور شریف النفس انسان ہیں اور اس ملاقات کے نتیجے سے ان کو اطلاع دوں ۔

حسب ھدایت سرتیج بہادر نون کے ذریعہ چیف کمشنر صاحب سے ملنے کی درخواست کی ۔ فرمایا آج فرصت نہیں۔ کل ؟ کہا کل بھی بہت مصروفیت ہے ۔ پرسوں ؟ فرمایا پرسوں بھی بہت مصروف رہوں گا ۔ بار بار دریافت کرنے پر بہت تامل کے بعد فرمایا '' پیر کی صبح ،، یہ بھی اُن کے گوش گزار کیا گیا کہ میرے ساتھ کیفی صاحب بھی ہوں گے ۔ پوچھا کیفی صاحب کون ہیں ۔ اُن کا پورا نام بتایا اور کہا کہ یہ انجمن کے ڈائرکٹروں میں سے ہیں انجمن کے بڑے موید و حامی اور اردو کے بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں ۔ (۸ نومبر) کی صبح وقت مقررہ پر چیف کمشنر صاحب کی کوٹھی پر میں اور کیفی صاحب حاضر ہوئے ۔ تقریباً ایک گھنٹہ برآمدے میں بیٹھے انتظار کرتے رہے ۔ ملاقاتیوں کی فہرست میں میرا نام نہ تھا پنڈت جی کا نام تھا گھنٹے بھر کے بعد چپراسی نے آکر پنڈت جی سے کہا ۔ آپ کل ملنے کو آیئے اور ملاقات کا وقت دریافت کرلیجیے گا ۔ ۱۲ نومبر کو کیفی صاحب تشریف لائے ۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے دوسرے روز فون سے ملاقات کا وقت دریافت کیا تو جواب ملا کہ اڑھائی بجے فون کرکے دریافت کیجئے۔ اڑھائی بجے فون کیا تو کوئی جواب نہ ملا ۔ خط لکھ کر دریافت کیا اب تک کوئی جواب نہیں دیا ۔ ۱۵ نومبر کو کیفی صاحب سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک بھی کوئی جواب نہیں آیا اس کے

بعد ۲۲ نومبر کو کیفی صاحب تشریف لائے اور چیف کمشنر صاحب کی ملاقات کا حال بیان کیا اور کہا کہ اب وہ کچھ دھیمے پڑ گئے ہیں۔ اور چیف کمشنر صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ ڈاکٹر ذکر حسین صاحب سے کہیے کہ وہ اُن سے ملیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو پیغام پہنچا دیا غالباً وہ نہیں ملے اور ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ یہ ہیں وہ چیف کمشنر جن کی انصاف پسندی اور شرافت کی تعریف سرتیج بہادر نے مجھے لکھی تھی۔ ہمارے آئی سی ایس کی گردن اب تک ویسی ہی اکڑی ہوئی ہے پہلے وہ سوائے انگریز آقا کے کسی کے سامنے نہیں جھکتا تھا۔ اب و انگریز آقا کا قائم مقام ہے سب اُس کے سامنے جھکتے ہیں اور وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا انصاف اور شرافت پرانی باتیں ہیں یہ سنت بورژوا ہے۔ آزادی کے بعد اُن کی ضرورت نہیں رہی۔

میں نے کلکتہ عبدالرحمن صدیقی کو خط لکھا اور انجمن پر جو گزر رہی تھی اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ آپ یہاں آکر ہماری مدد کیجیے۔ چنانچہ وہ ۱٦ دسمبر کو دھلی پہنچ گئے۔ اور انجمن سے متعلق تمام حالات دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد دوسرے ہی روز سے اپنی مہم شروع کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملے اور اُن سے ڈپٹی کمشنر کو خط لکھوایا کہ مجلس نظما کے فیصلے کے مطابق انجمن کا کتب خانہ عبدالحق کے حوالہ کردیا جائے۔ ۲۰ دسمبر کو میں اور عبدالرحمن صدیقی کیفی صاحب سے ملنے گئے اور کیفیت سے اطلاع دی۔ ہم جس وقت تانگے میں جارہے تھے تو بازار میں بعض ھندو ہمیں دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو مسلمان جا رہے ہیں۔ گویا مسلمان کوئی عجیب الخلقت ہیں اور پہلی بار دلی میں آئے ہیں۔ جب ہم واپس خلیق منزل میں آئے اور تانگے سے اُتر رہے تھے تو تانگے والے نے کہا کہ جب سے گاندھی جی مارے گئے دلی میں امن ہوگیا۔ یہ سن کر میں حیرت سے تانگے والے کا منہ دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ اس نے کیا بات کہی۔ اس کے بعد عبدالرحمن صدیقی صاحب، رفیع احمد قدوائی صاحب۔ ڈاکٹر تاراچند اور مولانا آزاد سے ملے اور انجمن کے معاملے میں گفتگو کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر بیزار ہوکر ۲۸ دسمبر کو ہوائی جہاز سے بھوپال چلے گئے۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان کے ھائی کمشنر اور اُن

کے عملے سے کسی قسم کی مدد نہ ملی - صرف جھوٹے وعدے کرتے رہے - یہ ان کے متعلق عام شکایت تھی- لوگ حیران تھے کہ اس شخص کو ھائی کمشنر کیوں مقرر کیا گیا جو پاکستان سے زیادہ بھارت کا خیرخواہ ہے -

یہ لکھنا بھول گیا کہ جب تک دلی میں رہے سی آئی ڈی کی ہم پر نگرانی رہی بعض اوقات میرے ملازموں کو ستاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ آج کل کیا کر رہے ہیں اور کون کون ملنے آتا ہے- اکثر ایک مرد معقول باریش مقطّع ملنے آیا کرتے تھے اور اردو سے اور ہمارے کام سے بہت ہمدردی ظاہر کیا کرتے تھے- بڑے چرب زبان تھے - بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے -

دلی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی آخر تنگ آ کر اسی میں خیریت دیکھی کہ دلی کو خیر باد کہیں - چنانچہ ۶ جنوری ۱۹۴۹ع کو میں گرانڈٹرنک سے بھوپال روانہ ہو گیا - بھوپال پہنچ کر چند روز آرام کیا اور دلی کی کثافت اور کوفت سے نجات پائی - ۱۸ جنوری کو دلی سے رفیق الدین احمد صاحب کا خط آیا کہ میرے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۸ع کے خط کا جواب چیف کمشنر صاحب نے ۷ جنوری ۱۹۴۹ع کو عنایت فرمایا - شاباش بہت جلد خبر لی - اپنی حکومت ہے جب چاہیں جواب دیں یا نہ بھی دیں - کسی کے غلام نہیں آزاد ہیں -

۲۳ جنوری کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۲۵ کی صبح کو بمبئی پہنچا - دو تین روز قیام کر کے بعض احباب سے ملا اور دو ایک کام تھے وہ کئے - آخر ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ع کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ہوا جہاز میں سوار ہوا :-

رخصت اے ہندوستاں اے بوستان بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

یہ جو کہتے ہیں ''شاعری جزویست از پیغمبری،، کبھی کبھی یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے - حالی نے یہ شعر ۷۵ سال پہلے لکھا تھا اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا !

جہاز ساڑھے بارہ بجے کراچی پہنچا - ہوا خانے پر شعیب قریشی صاحب ، سید ہاشمی صاحب ، خان عبداللطیف خاں صاحب اور پیر حسام الدین صاحب ملے - خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ خیروعافیت سے پاکستان پہنچ گیا - اب یہاں نئی مہم کا آغاز ہوگا -

باب ہفتم

انجمن کا نیا دور پاکستان میں

۱۹۴۸ تا ۱۹۵۳ع

کراچی آنے اور ایک وسیع مکان مل جانے کے باوجود جناب مولوی صاحب بھارت کا مرکز اور سابقہ وطنیت چھوڑنا نہ چاہتے تھے ۔ سال بھر سے زیادہ وہ اسی رائے پر قائم رہے حتیٰ کہ بعض اوقات کراچی کے احباب مایوس و مکدر ہو جاتے تھے ۔ لیکن بالاخر انھیں بھارت کو چھوڑنا پڑا ۔ اس جبری ہجرت یا جلاوطن کرانے میں چند مسلمان دوستوں نے کافر دشمنوں سے بڑھ کر حصہ لیا جس کی روداد خود مولوی صاحب نے گذشتہ اوراق میں تحریر فرمائی ہے ۔ غرض انجمن کا یہ ایک سال تعطل اور تذبذب میں گزرا اور اگرچہ مئی ۱۹۴۸ع سے انجمن کا اخبار ''قومی زبان،، کراچی سے جاری کردیا گیا اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا نیا دستور بھی مرتب ہوگیا تھا ، تاہم صحیح معنی میں مستقل طور پر انجمن ۱۹۴۹ع سے پاکستانی ادارہ بنی ۔ اسی سال انجمن کے سابقہ صدر ، سر تیج بہادر سپرو کا طویل علالت کے بعد الہ آباد میں انتقال ہوا جسے قدرت کی طرف سے بھی ایک اعلان خیال کرنا چاہئے کہ انجمن کا ہندستان کا دور ختم ، اور نئی مملکت پاکستان میں عہد جدید کا آغاز ہوتا ہے ۔ بے سروسامانی کے اعتبار سے یہ بھی کچھ اسی قسم کا آغاز تھا ، جیسا کہ علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہونے کے وقت ہوا تھا البتہ ایک بڑا فرق ضرور تھا کہ انجمن کا اصلی معمار بلکہ اردو کی روح و رواں بھارت سے نکل کر پاکستان میں آگیا اور انجمن کی بھارت میں تباہی اور اپنی پیرانہ سالی میں شدید صدمہ

جھیلنے کے باوجود، تازہ جوش اور جواں ہمت کے ساتھ اردو کی نئی اور بلند تر عمارت بنانے میں جُٹ گیا۔ ۴۸ میں پنجاب یونیورسٹی اور احمدآباد کی ''کل گجرات،، کی دونوں اردو کانفرنسوں میں جناب مولوی صاحب نے صدارت کی۔ دونوں جگہ نہایت پر مغز و پر اثر خطبے پڑھے۔ اہل بھارت کی اردو زبان سے دشمنی اور ایسے دیوانہ وار مٹانے کی کوششوں کا ذکر کیا۔ مگر دونوں خطبوں کے آخر میں قوی امید ظاہر کی کہ دشمن اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، انجام کار فتح اردو کی ہوگی۔ پہلے خطبے کو ختم کرتے وقت فرماتے ہیں کہ ''ہندستان اردو کو شوق سے اپنی حدود سے خارج کردے لیکن وہ اس کے خارج کئے خارج نہیں ہو سکتی۔ اس کے قدرداں اب بھی دنیا میں بہت ہیں۔ وہ زندہ رہے گی، ترقی کرے گی اور اوج کمال پر پہنچے گی اور براعظم پاکستان و ہند ہی کی نہیں ساری ایشیا کی عام زبان ہو کے رہے گی۔ البتہ ہندستان کی فرد جرم میں ایک جرم کا اور اضافہ ہوگیا جسے وہ ہزار پردے ڈال کر بھی نہیں چھپا سکتا۔ یہ معمولی جرم نہیں۔ یہ قتل عمد ہے۔ تاریخ کے اوراق پکار پکار کر اس کے قاتلوں پر نفرین کریں گے،،۔

احمدآباد کے خطبے کا آغاز اس غم‌انگیز شعر سے کیا ہے:

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک!

اور خاتمہ ان حوصلہ افزا کلمات پر:

''مصیبت بعض وقت رحمت ثابت ہوتی ہے۔ دنیا میں اکثر بڑے بڑے کام مصیبت کے وقت انجام پاتے ہیں یہ تازیانے کا کام دیتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور اٹی ہوئی سوتیں کھل جاتی ہیں۔ بجھے ہوئے دلوں میں ایک تازہ توانائی اور دماغوں میں ایک نئی جلا پیدا ہوجاتی ہے۔ اختلاف اور نفاق مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ یک جہتی اور اتحاد کی برکت آجاتی ہے۔ جو کام پہلے انہونے معلوم ہوتے تھے وہ آسان نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ہم پر بھی ایسا ہی آیا ہے۔ یہ در حقیقت ہمارے امتحان کا وقت ہے۔ اگر ہم ہمت نہ ہارے اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا تو انشاءاللہ ہم اس امتحان میں ضرور پورے اتریں گے۔

مدد اے ہمت دشوار پسند ۔ کام آسان ہوا جاتا ہے!،،

ان الفاظ میں تاثیر کا جادو بھرا ہے کیونکہ خود کہنے والا پیکر عمل ، ہمت و استقلال کی بے مثال مثال ہے ۔ انہی پانچ سال میں کراچی میں جو کرشمہ آنکھوں نے دیکھا وہ ثبوت ہے کہ ہمت کا خدا مددگار ہے ، مقصد پاک اور دھن سچی ہو تو ریگستان میں چشمہ اُبل سکتا ہے ۔ جنگل میں باغ تیار ہو سکتا ہے ۔

پاکستان میں انجمن کی نئی تنظیم

ہم اوپر (باب پنجم میں) بیان کر چکے ہیں کہ دہلی چھوڑنے سے کچھ پہلے ، یعنی ختم سال ۱۹۴۶ میں انجمن ترقی اردو کے پاس تقریباً دو لاکھ روپیہ نقد اور مطبوعات ، کاغذ وغیرہ کوئی تین لاکھ روپے کا مصدقہ اثاثہ تھا ۔ فروخت کتب و رسائل سے اس کی آمدنی کم و بیش پینسٹھ ہزار اور حیدرآباد کی امداد ملا کر ایک لاکھ روپیہ سالانہ سے بڑھ جاتی تھی ۔ نقد و جنس کا سارا اثاثہ بھارت کی حکومت نے غصب کر لیا ۔ جناب مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ تک اسی کی حرص و ہوس کا لقمہ بنا ۔ بلوائی گنڈوں نے اُن کے کپڑے ، برتن ، اثاث البیت اور ایک موٹر لوٹ لی ۔ کتب خانہ کچھ زیادہ ہی بیش بہا ہوگا ۔ اسے وہاں کے معزز حکام اور متوسلین نے دبالیا ۔ صرف وہ کتابیں اور مسودات جنہیں مرتب کرنے کے لیے دریاگنج سے عربک کالج اور پھر محلہ چوڑی والاں کے مکان میں لے آئے تھے ، بچ گئیں اور بہ مشکل تمام جناب مولوی صاحب کے بچے کچھے سامان کے ساتھ کراچی پہنچ گئیں ورنہ عمر بھر کے علمی شوق کا سرمایہ آزادیٔ ہند کے سر صدقے ہوا ۔ ۱۹۴۸ع میں حیدرآبادی امداد کی یکسالہ رقم کسی نہ کسی طرح کراچی میں مل گئی تھی آخر میں بیس ہزار روپیہ حکومت پاکستان کی جانب سے وصول ہوا ۔ توقع یہ تھی کہ خود لیاقت علی خاں صاحب عمارت کے لیے چار لاکھ یکمشت اور سالانہ چالیس ہزار کی جو منظوری مخلوط حکومت کے زمانے میں دے آئے تھے ، وہ اب پاکستان کے خزانے سے اجرا فرمائیں گے ۔ اور یہ نہیں تو کم سے کم ریاست حیدرآباد ہی کی سالانہ امداد بطور تلافی انجمن کو ملنے لگے گی لیکن ایسا نہیں ہوا ۔ انجمن کے علمی کام اور اپنی قومی زبان کی ترقی کے لیے سرکار پاکستان پچیس ہزار سالانہ سے زیادہ روپیہ نہ دے سکی ۔ بایں ہمہ قائد اعظم کی وفات کے بعد ملکی حالات نے جو رخ اختیار کیا اُسے دیکھ کر یہ پچیس ہزار سالانہ کی امداد بھی بہت غنیمت

اور قابل شکر گزاری ہے۔ اس میں وہ امداد جو ترقی اردو کالج کراچی کے لیے ۵۰ء سے ملی، شامل نہیں ہے۔ انجمن کو بلدیہ کراچی سے دو ہزار پھر پانچ ہزار سالانہ کی مدد ملتی رہی اور ۵۱ء سے ریاست خیرپور نے یکمشت پانچ ہزار عطئے کے علاوہ دو ہزار چار سو روپیہ سالانہ کی امداد جاری فرمائی۔ صوبہ پنجاب کی بیش قرار اعانت کا بھی یہاں ذکر کردینا بے محل نہ ہوگا جس نے سنہ ۵۳-۵۲ء کے میزانئے سے مالی دشواریوں کے باوجود پچاس ہزار روپے انجمن کو عطا کیے اور اس کے کاموں کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔

اس مدت میں انجمن جو علمی اور تعلیمی کام انجام دیتی رہی، اس کا حال آگے آئے گا، سردست اس کی پاکستانی تنظیم اور نئے دستور کی مختصر کیفیت بیان کرنی مقصود ہے: انجمن ترقی اردو پاکستان کا جدید آئین مرتب کرکے ۴۸ء ہی میں اس کی از سر نو رجسٹری کرالی گئی تھی۔ پاکستان میں اس کے پہلے صدر سر شیخ عبدالقادر منتخب ہوے لیکن سال بھر کے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور ۵۰ء میں مجلس نظما نے جناب مولوی عبدالحق صاحب کو صدر انجمن منتخب کیا۔ خود ممدوح اس تجویز کے خلاف تھے مگر بعض وقتی مصلحتوں سے مجبور کردئے گئے اور اب تک آنریری سکرٹری کے علاوہ منصب صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ متعنااللہ بطول بقائہ۔ نئے دستور میں مجلس نظما کے ارکان کی تعداد ۳۰ کردی گئی ہے جس میں ۵ سرکاری اور ہر صوبے کے نمائندوں کے علاوہ خاص اہل سائنس، خواتین، اور مشاہیر کے لیے دس نشستیں رکھی ہیں۔ بعض ممتاز حضرات کے نام یہ ہیں:

(۱) آنریبل مسٹر شعیب قریشی	(۲) جناب چودھری خلیق الزماں صاحب
(۳) مولانا ظفرعلی خاں صاحب	(۴) جناب پیر الٰہی بخش صاحب
(۵) جناب ممتاز حسین صاحب قزلباش	(۶) مخدوم زادہ حسن محمود صاحب
(۷) خان بہادر بدرالدین صاحب	(۸) خلیفہ شجاع الدین صاحب
(۹) جناب میاں ممتاز دولتانہ صاحب	(۱۰) جناب حاتم علوی صاحب
(۱۱) پروفیسر عبدالحلیم صاحب	(۱۲) مولوی محمد شفیع صاحب
(۱۳) پروفیسر افضال حسین صاحب	(۱۴) بیگم صاحبہ محمد شریف صاحب وغیرہم

حسب سابق آمد و خرچ کے باضابطہ حسابات صدر دفتر کراچی میں رکھے جاتے

ہیں۔ مسلمہ تنقیح سازوں (= آڈیٹرز) سے ہر سال تصدیق کرائی جاتی ہے اور مجلس نظما میں پیش کرکے سالانہ مصارف کی منظوری لی جاتی ہے۔ کتابوں کے انتخاب معاوضہ، تالیف و تراجم کے لیے ماہرین کی ذیلی مجلس سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ انجمن کا سالانہ موازنہ، تنقیح حسابات کی کیفیت، سالانہ روداد کے ساتھ اطلاع عام کی غرض سے اخبار قومی زبان میں شائع کردئے جاتے ہیں۔ مصارف کا اوسط چالیس ہزار سالانہ سے اوپر ہے۔ کالج کے حسابات آمد و خرچ علاحدہ کردئے گئے ہیں اور اس کے حالات میں آگے بیان ہوں گے۔

انجمن کے دستور کے سلسلے میں یہ صراحت کردینی بے محل نہ ہوگی کہ آئین کی ترتیب و ترمیم اور اپنے ارکان کا انتخاب مجلس نظما ہی کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ اکثر علمی اداروں کا دستور ہوتا ہے۔

تبلیغی کام

تقسیم ہند نے جس طرح سیاسی انقلاب برپا کیا، لسانی مسائل کی بھی صورت بالکل بدل دی۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۳۶ع سے زبان کی حفاظت کے لیے ہندستان میں جو تگ و دو کی، اس کا حال ہم پچھلے اوراق میں سن چکے ہیں اور یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح گاندھی جی کے اقدام نے اس مسئلے کو سیاسیات کے خارزار میں الجھادیا کہ آج تک اکثر کانگرسی ہندو اردو سے مذہبی قسم کا تعصب رکھتے ہیں۔ جب ہندو مسلمانوں کی جنگ، تقسیم ممالک پر منتج ہوئی تو کم سے کم اردو کے طرفداروں کو یقین تھا کہ پاکستان کی نئی مسلم مملکت میں وہی قومی اور سرکاری زبان بنائی جائے گی۔ یہ منصب وہ حیدرآباد دکن اور کچھ پہلے تک بڑی بڑی ہندو ریاستوں میں انجام دے چکی تھی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ع سے بھی پیشتر انگریزوں نے اسے اعلیٰ تعلیم (دھلی کالج) کی زبان بنایا اور گذشتہ تیس برس میں جامعۂ عثمانیہ میں وہی ذریعۂ تعلیم رہی تھی۔ برعظیم کے مسلمان عام طور پر اسی کو اپنی مشترکہ ملّی زبان مانتے تھے۔ پنجاب و دوآب کا تو ذکر ہی کیا ہے، مدراس و ملیبار، آسام و بنگال، سندھ و سرحد کے بعید اقطاع تک میں اردو کی حفظ و بقا کی جد و جہد مسلمانوں کی سیاست کا لازمی جز اور قومی زندگی کا ضروری شعبہ بن گئی تھی۔ خود کانگریسی ہندوؤں کی اندھی مخالفت کا سبب یہی تھا کہ وہ

اسے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نشان سمجھتے تھے ۔ ہرچند وہ یہیں پیدا ہوئی اور اپنی ساخت اور کثیر الفاظ کی بنا پر صریحاً ہندستان کی زبان ہے لیکن یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے فاتحانہ آنے اور بس جانے کے بعد اس کی تشکیل ہوئی اور انھی کے اقتدار کے ساتھ وہ مشرق اور جنوب میں دور دور تک پھیلی تھی۔ شہری اور متمدن ہندوؤں نے بھی اسے اپنا لیا تھا اور انگریزی ملوکیت کے آغاز تک سبھی قوموں کی کاروباری اور ادبی زبان وہی ہوگئی تھی۔ شروع میں مسلمان حکام و رؤسا کو فارسی پر اصرار تھا، بعد میں انگریزی، مدارس اور عدالت میں داخل کردی گئی ورنہ اردو (یا ہندستانی) کے سوا کسی اور زبان کے سرکاری بنائے جانے کا کوئی مدّعی نہ تھا۔ واضح رہے کہ غیر مسلم اقوام کی طرح مسلمان بھی، خصوصاً دیہات میں، مختلف مقامی اور عُلاقائی بولیاں استعمال کرتے تھے لیکن انیسویں صدی کے خاتمے سے قبل ہی ان کی عام ادبی اور تحریری زبان اردو بن چکی تھی۔ فارسی کا رواج تحریر میں بہت کم اور تقریر میں بالکل معدوم ہوگیا تھا۔

مذکورۂ بالا وجوہ سے عام یقین یہی تھا کہ پاکستان کی قومی زبان کا مسئلہ طےشدہ بات ہے۔ چنانچہ قیام مملکت کے چندماہ بعد مشرقی بنگالے میں ایک انگریزی خواں جماعت نے بنگلا کا سوال اٹھایا تو خود قائداعظم مرحوم نہایت ناراض ہوئے۔ پیرانہ سالی اور مختلف موانع کے باوجود ڈھاکے پہنچے اور صاف لفظوں میں اہل بنگال کو جتایا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اردو ہوگی، جو لوگ اختلاف لسانی کی آگ سلگا رہے ہیں وہ قومی وحدت کے دشمن ہیں۔ خود غرضی سے ہو یا ناسمجھی سے، ایسی تحریک پاکستان کے اتحاد کو برباد کردے گی! دوسرے سال (سنہ ۱۹۴۹ع میں) انجمن کے سکریٹری جناب مولوی صاحب مشرقی بنگالے گئے۔ سلہٹ میں انجمن کی ایک ممتاز شاخ پہلے سے قائم ہے۔ اسی کی طرف سے ۱۲ مارچ ۴۹ع کو ایک بڑی اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ جناب مولوی صاحب نے اس کا افتتاح کیا۔ عبدالرحمن صدیقی مرحوم کلکتہ سے صدارت کے لیے تشریف لائے۔ مشرقی پاکستان کے ہر حصے سے اہل شوق اور معزز نمائندے جمع ہوئے۔ اردو کی حمایت میں اہل سلہٹ کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ جناب مولوی صاحب سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ دوسرے روز شب کو دھوم کا مشاعرہ ہوا جس میں بیسیوں مقامی

حضرات نے بہت اچھی معیاری زبان میں آردو غزلیں اور نظمیں پڑھکر سنائیں : " سلہٹ میں عام طور پر آردو کا اچھا خاصا چرچا ہے اور اہل سلہٹ آردو کے بڑے حامی ھیں - یہاں کی انجمن ترقی آردو نے زبان کی ترویج اور اشاعت میں قابل قدر کام کیا ہے - ڈھاکے میں جب ایک جماعت نے آردو کے خلاف کارروائی کی تو اس انجمن نے بڑی شدومد اور کامیابی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا "، اس سلسلے میں انجمن کے صدر مولوی مجدالدین صاحب چودھری ، ان کے نائب مولوی نجم الحسن صاحب اور سکریٹری محمد مصدر علی صاحب کی کوشش کو خاص طور پر سراہا گیا ہے- " معتمد انجمن ترقی آردو پاکستان نے مشرقی پاکستان کے دوران سفر میں چاٹ گام ، سیدپور ، کومیلا اور ڈھاکے میں انجمن کی شاخیں قائم کیں - چاٹ گام اور سیدپور میں ریلوے کی بستیاں بہت آباد ھیں اور آنھوں نے اپنے ھائی اسکول قائم کئے ھیں جن میں طلبہ کی بہت اچھی تعداد ہے ، آردو کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے - ڈھاکے میں ایک آردو مڈل اسکول سرکاری اور ایک "رحمت اللہ ھائی اسکول" ہے جس میں آردو ذریعۂ تعلیم ہے - یہ رحمت اللہ صاحب کلکٹر ڈھاکہ کی سعی سے قائم ھوا ہے اس میں تقریباً پانسو طالب علم ھیں اب یہ کالج بنا دیا گیا ہے-

چاٹ گام کی انجمن کے صدر جلال الدین احمد صاحب ایم ایل اے (سابق وزیر) ھیں - وھاں انجمن کی شاخ پہلے بھی تھی اور یہی اس صدر تھے .... ڈھاکے کی انجمن ترقی آردو سے ھمیں بہت کچھ توقع ہے اس کے صدر مولانا محمد اکرم خاں ، سکریٹری خواجہ نورالدین صاحب ھیں "، دورۂ بنگال کی کیفیت کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں کثرت سے سرکاری عربی مکاتب موجود ھیں ان سب میں ذریعۂ تعلیم آردو ہے - مساجد میں وعظ اور میلاد شریف کی محفلوں میں بھی اکثر اسی اسلامی زبان سے کام لیتے ھیں- نہ صرف شہروں میں بلکہ قصبات کے شریف مسلم گھرانوں میں عام طور سے آردو سمجھتے اور بول سکتے ھیں - اگرچہ لب و لہجہ اور مقامی محاورات یا طرز بیان مغربی پاکستان سے مختلف ہے-

جناب مولوی صاحب افسوس کرتے تھے کہ ۴۹ع کے دورے کے بعد پھر وہ مشرقی بنگال جا کر انجمن کے کام کی حسب دل خواہ توسیع نہ کرسکے اور نہ زبان کی تبلیغ و اشاعت کی مختلف تجاویز پر عمل ھوا جن میں اعانت کرنے کے حکومت بار بار وعدے کرتی رہی مگر ان کے ایفا کی نوبت نہیں آئی - ورنہ بہت ممکن تھا کہ ۱۹۵۱ع

میں بنگلا کے لیے دوبارہ جو شورش ہوی اس میں اتنی گرمی نہ آتی اور بالواسطہ صوبائی عصبیت اور طرح طرح کی غلط فہمیاں نہ پیدا ہوتیں - زیر نظر مدت میں پنجاب ، سندھ ، بلوچستان کے چند دورے کئے گئے ان علاقوں میں بیس شاخیں جدید قواعد کے مطابق کام کر رہی ہیں - انجمن کی سالانہ کیفیت ۱۹۵۲ء میں ان کا نام اور مختصر کارگزاری تحریر ہے (ملاحظہ ہو اخبار قومی زبان - یکم جولائی ۱۹۵۲ء)

کل پاکستان اُردو کانفرنس

انجمن ترقی اردو نے پاکستان آکر پہلی بڑی اور نئی مملکت کی نمائندہ اردو کانفرنس اپریل ۱۹۵۱ء میں بہ مقام کراچی منعقد کی - کتاب کے چوتھے باب میں دارالسلطنت دهلی کی ”کل ہند کانفرنس“ کا حال ہماری نظر سے گزرا جسے انجمن نے ۱۹۳۹ء میں پہلی دفعہ بڑے پیمانے پر مجتمع کیا تھا - ان دنوں کانگرس کی صوبائی حکومتوں کے تعصب و تشدد اور جناب مولوی صاحب کی پرجوش مزاحمت کے طفیل ہندستان کے مسلمانوں میں خصوصیت سے خاصا تلاطم پڑ گیا تھا - وہ اپنی قومی زبان کی حمایت کے لیے دور دور سے دهلی کھنچ آئے تھے - دهلی میں کشش کے اور بھی کئی اسباب تھے لیکن انجمن کی کراچی کانفرنس میں ایک نمایاں فرق تھا کہ وہ انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد آزادی کے زمانے میں منعقد ہوئی - خود گورنر جنرل پاکستان (عالی جناب خواجہ ناظم الدین صاحب) نے اس کا افتتاح فرمایا - اردو کو ہر جگہ ، خصوصاً بنگالے میں مقبول و عام فہم بنانے کی غرض سے مفید مشورے دئے - خطبۂ افتتاحیہ کے آغاز میں جیسے جچے تُلے الفاظ میں اردو کے مشترکہ قومی زبان ہونے کی وضاحت کی وہ دہرانے کے قابل ہیں خواجہ صاحب ممدوح نے فرمایا :

”حضرات میری نظر میں اردو کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہیں ، اور سب کی زبان ہے ! یہ صحیح ہے کہ اردو نہ تو بنگال کے دیہات میں بولی جاتی ہے نہ پنجاب ، سرحد ، سندھ یا بلوچستان کے - لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ آپ بنگال میں پنجابی یا پنجاب میں بنگالی ، سرحد میں سندھی ، یا سندھ میں پشتو بولیں تو آپ کی بات سمجھنے والا کوئی مقامی باشندہ مشکل سے ملے گا - مگر اردو یا کم سے کم ٹوٹی پھوٹی اردو کو بولنے یا سمجھنے والے تھوڑے بہت ، قریب قریب ہر جگہ مل جائیں گے - صرف یہی ایک زبان ہے جو پاکستان

کے مختلف حصوں میں مشترک ہے بلکہ پاکستان کے باہر بھی اس سے کام چلایا جاسکتا ہے ...... قائد اعظم علیہ الرحمۃ کی مادری زبان اردو نہ تھی - انہیں سب سے زیادہ مہارت انگریزی زبان میں حاصل تھی مگر ان کی دور بیں نگاہوں نے دیکھ لیا کہ سوال ذاتی یا صوبائی نہیں بلکہ قومی اور ملّی ہے - اگر پاکستان کی مختلف زبانیں بولنے والوں کو آپس میں شیر و شکر بنانا ہے اور اگر پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے تو اس کی ایک قومی زبان بھی ہونی ضروری ہے اور یہ زبان سوائے اردو کے دوسری نہیں ہوسکتی - لہذا انھوں نے کُھلے الفاظ میں اس بات کا اعلان فرمایا - ان کا اعلان ہمارے لیے حرف آخر کا حکم رکھتا ہے - ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اپنی قومی زبان کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی کوشش کریں "

پاکستان بلکہ سارے ہندستان کے اکثر مسلمانوں کی دلی آرزو یہی تھی - قوم کی آزادی ، خودداری ، وحدت ، پھر سرکاری ، کاروباری ، علمی اور عملی ضرورتوں کا تقاضا یہی تھا - گورنر جنرل کا سرجلسہ ایسا کہنا حکومت کے اعلان کا حکم رکھتا تھا - مگر قسمت کی کوتاہی سے انگریز جاتے وقت تک مرکز میں انگریزی زبان سے کام لیتے رہے - ان کا عذر یہ تھا کہ اہل ہند کسی ایک ملکی زبان پر متفق نہیں ہیں جسے سرکاری قرار دیا جائے - پھر بھی مرکزی مجلس مقننہ میں اردو تقریر کی اجازت تھی اگرچہ احساس کہتری یا مشیخت کے باعث بہت کم لوگ اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے تھے - یہ انگریزوں کے قوم پرست جانشینوں کا کام تھا کہ وہ اپنی قومی زبان کو حکومت کی مسند پر متمکن کریں لیکن اہل اقتدار نے تساہل سے کام لیا اور نااہلی کی تاخیر سے بدخواہان ملّت کو اختلاف کے شوشے چھوڑنے کا موقع مل گیا اردو کانفرنس کراچی کے صدر عالی قدر سردار عبدالرب صاحب نشتر نے اپنے خطبہ صدارت میں پورے مسئلے پر نہایت متین و مدلّل بحث کی ہے - وہ آن دنوں جب کہ پنجاب کی اسمبلی اور وزارت برطرف کر دی گئی تھی ، وہاں کے با اختیار گورنر تھے - جناب مولوی عبدالحق صاحب کی درخواست پر بطور خاص کراچی تشریف لائے اور کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ایک معرکتہ‌آلارا تقریر کی - مطبوعہ روداد (قومی زبان ، یکم مئی ۱۹۵۱ ع) سے اس کے ضروری اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں - بعض

اقوال میں مزید وقت گزرنے سے اور زیادہ قوی اثر آگیا ہے اور وہ اہل پاکستان کے لیے شرم و عبرت کا سرمایہ ہو گئے ہیں۔ جناب سردار صاحب نے تمہیدی کلمات کے بعد فرمایا کہ :

'' حضرات ۔ مجھے تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ قیام پاکستان کے ساڑھے تین سال بعد اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا جائے ۔ دراں حالیکہ گو رسمی طور پر مجلس دستور ساز میں یہ فیصلہ نہ ہوا ہو کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے مگر واقعاتی اور تاریخی نقطہ نگاہ سے یہ حیثیت اردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان ہے ۔ جو لوگ تحریک پاکستان سے واقفیت رکھتے ہیں ، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جن وجوہ نے برِعظیم کے مسلمانوں کو علاحدہ وطن کے مطالبے پر آمادہ کیا ، ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ۱۹۳۷ء میں جب صوبائی خود مختاری کے زمانے میں ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم تہذیب و ثقافت کے مٹا ڈالنے کے منصوبے بنائے گئے اور اس غرض سے اردو کو مختص کیا گیا تو مسلمان چلّا اٹھے اور برداشت نہ کرسکے ۔ جن چیزوں نے یہ احساس ، یہ جذبہ ، یہ ذوق شوق پیدا کیا کہ اپنا علاحدہ وطن بنائیں ، ان میں ایک چیز یہ تھی کہ اردو کو اغیار کی دست بُرد سے محفوظ کریں ۔ اردو ہندی کا جھگڑا تقسیم سے پہلے بھی اٹھایا گیا تھا ۔ مسلمان تو عام طور سے سبھی ، اور بہت سے ہندو بھی کوشاں تھے کہ ملک کی زبان اردو قرار دی جائے مگر بعض متعصب ہندو صرف اس خیال سے مخالف ہو گئے کہ وہ زبان جس کے الفاظ اسلامی تاریخ و عقائد میں رچے ہوئے ہیں . . . . ہندو کی نفسیات پر برا اثر ڈالے گی ۔ مجھے یاد ہے کہ یوپی کے ایک ہندو وزیر نے . . . اردو کی مخالفت میں اس لیے بیان دیا کہ ان کی لڑکی نے ایک موقع پر ان کے سامنے خدا کا نام لیا تھا ۔ انہوں نے کہا '' خدا ،، کی طرح بہت سے الفاظ جو مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں اردو زبان کے ذریعے آہستہ آہستہ ہندوؤں کے دماغوں میں داخل ہو گئے ہیں اور اس سے ان کے مذہبی عقائد کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے ۔ پنڈت ٹنڈن اس لیے اردو کی مخالفت فرماتے ہیں کہ یہ اس دور میں پیدا ہوئی جب کہ ہندو ، مسلمانوں کے غلام تھے ۔ اب سنا ہے کوئی صاحب کراچی میں کہہ گئے ہیں کہ اردو (مسلمانوں کے)

غلامی کے زمانے کی یادگار ہے ! . . . . . الغرض تقسیم سے پہلے ہندستانی مسلمانوں اور کثیر ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ اردو راس کماری سے پشاور تک سارے ہندستان کی زبان ہونی چاہیے۔ آج حیرت ہے کہ اسی ملک کے کسی گوشے سے یہ آواز اٹھے کہ اردو کے بجائے کوئی اور زبان ہو! یہ آواز کم سے کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ انتشار جن افراد نے پھیلانے کی کوشش کی ہے ان کے آلۂ کار دو قسم کے لوگ ہیں: بعض تو وہ سادہ لوح جو نادانستہ ان کے فریب میں آ گئے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے پاکستان کی وحدت پر حملہ کیا اور اس کے قومی اور ملی اتحاد کو مٹانے کی غرض سے یہ ناعاقبت اندیشانہ سوال اٹھایا ہے۔ ایک مقتدر صوبے کے چند ناعاقبت اندیش نوجوان ، دشمنان قوم کے جھانسے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ بنگالی چونکہ اکثریت کی زبان ہے اس لیے پاکستان کی قومی زبان اسے قرار دیا جائے۔ اس وقت حضرت قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے انھوں نے محسوس فرمایا کہ یہ تحریک ملک کی وحدت اور بنیادی تخیل پر ایک کاری ضرب ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے کر بنگال پہنچے یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان نیا نیا عالم وجود میں آیا تھا اور حکومت بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہوئی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا طیارہ موجود نہ تھا جو ایک ہی اڑان میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان پہنچ جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس نازک زمانے میں جب کہ ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا، قائداعظم ہی کا ناقابل شکست اور محکم عزم ہمارا اثاثہ تھا اور انھیں ہم کسی خطرے میں ڈالنا نہ چاہتے تھے۔ مگر قائداعظم نے ایک پرانی مشین میں مزید پٹرول کا انتظام کیا اور ڈھاکے کے سفر کا خطرہ مول لیا۔ ہماری درخواستوں کی پروا نہ کرکے اُنھوں نے اپنی زندگی کو لسانی وحدت و استحکام کی بازی پر لگادیا۔ ایک پرانے (ڈیکوٹہ) جہاز میں ڈھاکے پہنچے اور ان سر پھرے طلبہ کو جنھوں نے دشمنان پاکستان کے کہنے میں آکر اس قسم کا سوال اٹھایا تھا سمجھایا کہ اگر تم پاکستان کو قائم و برقرار رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان صرف اردو ہوسکتی ہے کوئی اور زبان نہیں ہوسکتی اس واقعے سے آپ حضرات اندازہ لگائیں کہ زبان کے سوال کو قائد اعظم کس قدر اہمیت دیتے تھے . . . . . . "۔

پھر صوبائی زبانوں کے اپنے حدود میں ترقی کرنے کی ضرورت اور مشترکہ آردو کی غیر صوبائی، قومی نوعیت کا فرق بتاکر، جناب سردار صاحب نے فرمایا کہ:
"کچھ دن سے ایک سوال عربی کا اٹھایا گیا ہے کہ اسے پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے .... حیرت ہوتی ہے کہ جو حضرات عربی کو قومی زبان قرار دینے کے محرک و مدعی ہیں، اُن میں سے بمشکل ایک آدھ ہی عربی لکھ یا بول سکتے ہیں.. عربی قرآن پاک کی، ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقدس زبان ہے ...... پاکستان اسلامی اساس پر بنا ہے آپ ضرور اس بات کی تبلیغ کیجیے کہ عربی کی تعلیم عام ہو مگر اس معاملے میں خلط مبحث نہ کرنا چاہیے ... ہمارے سامنے مسئلہ بالکل صاف اور واضح یہ ہے کہ **اس وقت انگریزی دفتروں پر مسلط ہے۔ سیاسی طور پر ہم آزاد ہوگئے ہیں مگر ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس وقت تک آزاد نہیں سمجھ سکتے جب تک ہمارے دفتروں پر انگریزی کا تفوق قائم ہے۔** اب اگر ہماری نجات کے لیے کوئی شخص عربی کا نسخہ بتائے تو میں کہوں گا کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود، مارگزیدہ مردہ شود۔ ہمیں عملی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ اس ملک کی تریاق آردو ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے بجائے کہ پاکستان بھر میں ایسے افراد کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ ہوگی جو عربی بول سکتے ہیں۔ پس قومی یا سرکاری زبان کے معاملے میں جب عربی کی تجویز کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم صدیوں تک انگریزی سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے — اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے دفاتر کی زبان ایک غیر ملکی زبان انگریزی ہے جو یہاں نہ بولی جاتی ہے نہ سمجھی جاتی ہے جس کے بولنے والے سات ہزار میل دور ہیں۔ یہ ایک قومی حادثہ تھا کہ وہ یہاں آئے اور کچھ عرصہ رہ کر چلے گئے۔ اب اس زبان کے تسلط سے نکلنے کا علاج کیا ہے؟ میری رائے میں آردو کے سوا کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو انگریزی کی جگہ لے سکے ..."۔

جناب سردار صاحب نے فرمایا کہ وہ انگریزی پڑھنے سیکھنے کے مخالف نہیں،
"مگر میں اس کا سخت مخالف ہوں کہ کوئی زبان وہ مقام حاصل کرے جو اس کا حق نہیں ہے اور آزاد پاکستان میں انگریزی کو سرکاری زبان بنے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں عملی مشکلات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا مگر **اس** معاملے میں

بعض لوگ خواہ مخواہ وہم میں مبتلا ہوگئے کہ اُردو سے (سرکاری) کام چلنا مشکل ہے ۔ جب تک ہم پانی میں قدم نہیں رکھیں گے، تیراک کیسے بنیں گے؟ میں نے گذشتہ ڈیڑھ سال میں پنجاب میں یہ کوشش کی اور بڑی حد تک کام یاب ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ صوبے کا میزانیہ اردو میں پیش کروں۔ سخت مصروفیت کی وجہ سے صرف دو ڈھائی گھنٹے مجھے ملے مگر جب میں نے اردو میں بجٹ لکھا تو میرا دل بہت بڑھا کہ جب مجھ جیسا شخص جو اردو میں برائے نام شُد بُد رکھتا ہے، بجٹ لکھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ذرا سے حوصلے کو کام میں لا کر اردو کو پاکستان کی دفتری زبان نہ بناسکیں،،۔

. . . . جناب صدر نے اردو کی صلاحیت اور پُرمائیگی کی تحسین کی اور زور دے کر فرمایا کہ :

'' مولوی عبدالحق صاحب کو اندیشہ ہے کہ اردو کے بجائے کوئی اور قومی زبان بنادی جائے گی ، میں کہتا ہوں کہ نہ یہ ہوسکتا ہے نہ یہ کسی کی مجال کہ اردو کے سوا کسی دوسری زبان کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنا سکے ۔ اس معاملے میں تو دل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں لانا چاہیے . . . .،،۔

البتہ جناب سردار صاحب نے فرمایا کہ زمانۂ جدید کی آسانیاں ، یعنی اردو میں مختصر نویسی اور ٹائپ نویس مشین کو رواج دینا ہوگا جو اب دفتری کام کا لازمہ بن گئے ہیں۔

جناب صدر کی برجستہ اور دلآویز تقریر نہایت پسند کی گئی ۔ موصوف کے اقوال میں تاثیر و دل نشینی کا بڑا سبب یہ تھا کہ جو کچھ کہتے تھے ، اپنی گورنری کے زمانے میں اس پر بڑی حد تک عمل کر دکھایا تھا ۔

آنریری سکرٹری (جناب مولوی صاحب) نے اسی پہلے اجلاس میں انجمن کی روداد سنائی ۔ پچھلی سرگزشت پر جامع تبصرہ کیا اور پاکستان میں اس کی علمی اور تعلیمی کار گزاریاں بیان کیں جن سے آئندہ فصلوں میں ہم استفادہ کریں گے۔ تقریر کے آخر میں انھوں نے لوگوں کو پھر یاد دلایا کہ '' ہماری ہر قومی تحریک کی اشاعت و کام یابی اردو زبان کی زیربار منت ہے . . . پاکستان کا پیغام گھر گھر

اس نے پہنچایا اور سارے بر عظیم میں آگ سی لگادی۔ اگر یہ تحریک کسی علاقائی زبان کے ذریعے کی جاتی تو کیا اس میں یہ غیر معمولی قوت اور گرمی اور یہ حیرت انگیز جوش پیدا ہوسکتا تھا؟ اسی کی بدولت دو قومی نظریہ وجود میں آیا اور اسی کے طفیل پاکستان کی جدو جہد ساحل کامیابی تک پہنچی۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ قصرِ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اردو نے رکھی تو بالکل بجا ہوگا۔ پاکستان پر اردو کا بہت بڑا حق ہے۔ اور پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اس حق کو ادا کرے ...... لیکن حکومت سے زیادہ ہم اپنے بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر انہیں پاکستان سے محبت ہے اور اس کے اتحاد و استحکام کو ضروری خیال کرتے ہیں تو اپنی قومی زبان کو پھیلائیں، اور بڑھائیں کیوں کہ ہماری تہذیب اور قومی روایات کے زندہ رکھنے کا یہی ذریعہ ہے۔ اسی کی قوت میں قوم کی قوت اور زندگی ہے۔ اب زیادہ سوچنے اور بحث مباحثے کا وقت نہیں۔ جو منصوبہ ہمارے پیش نظر ہے اس پر فوراً عمل ہونا چاہیے۔ بقول ایک انگریز شاعر کے، زندگی کا سرمایہ عمل ہے، اس کا خسارہ؟ خواب دیکھنا اور انتظار کرنا — حضرات، خواب دیکھنے اور انتظار کرنے کا وقت گیا۔ اب کام کرنے کا وقت ہے!،،

کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پہلی اور سب سے اہم قرارداد یہ تھی کہ کل پاکستان اردو کانفرنس حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ رسمی طور پر اردو کے قومی اور سرکاری زبان ہونے کا اعلان کردے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اپنے شگفتہ اور مدلل انداز میں یہ تحریک پیش کی اور ولایات متحدہ امریکہ کی مثال دی جہاں یورپ کی کئی غیر جنس قومیں آباد ہوئیں مگر چونکہ توطن کی شرط رکھی گئی تھی کہ جملہ آبادکار انگریزی زبان کو قبول کریں گے، لہذا اسی مشترک زبان کی برکت سے آج امریکہ میں ذہن و عمل کا اشتراک نظر آتا ہے — خلیفہ صاحب اور بعد کے مقررین نے بھی صاف صاف لفظوں میں قومی زبان کا اعلان کرنے میں حکومت کی تاخیر کو سخت نامناسب و مضر قرار دیا کہ جسکی وجہ سے ملک میں اختلاف اور ذہنی انتشار کا دروازہ کھل گیاہے۔ صوبۂ سرحد کے وزیر تعلیم میاں جعفر شاہ صاحب نے اپنی فصیح تقریر میں پوری قوت سے تائید و حمایت

کی اور قاضی عیسیٰ صاحب نے اپنے صوبے (بلوچستان) کی طرف سے قرارداد کی وکالت کا حق ادا کیا ۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ نہ صرف قائد اعظم اس کے حصے میں آئے بلکہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کو بھی خدا نے یہاں بھیج دیا۔ قاضی صاحب کی اخلاص بھری کھڑی بولی میں یہ دعویٰ سن کر حاضرین بہت خوش ہوئے کہ "اردو ہمارے ہاں پیدا ہوئی اور یہیں سے دہلی و لکھنو گئی تھی ۔ اب وہ پھر ہمارے پاس واپس آئی ہے اور ہم اسے دنیا کی سب سے زیادہ پُرمایہ زبان بنا کر دم لیں گے !"

کانفرنس کا 'جلسئہ خواتین' (سہ پہر ۱۴ اپریل) شریک ہونے والیوں کی تعداد اور گرم جوشی میں کسی طرح مردانہ جلسوں سے کم نہ تھا ۔ اس کی صدارت بیگم شائستہ اکرام اللہ نے کی ۔ بالفاظ دیگر کانفرنس کو کامیاب بنانے میں اہل بنگال کسی سے کم نہیں رہے ۔

اسی رات دوسرے اجلاس کے آخر میں سید محمد جعفری اور مجید صاحب لاہوری کے ظریفانہ کلام سے حاضرین محظوظ ہوئے ۔ حُسن اتفاق سے جناب جگر مرادآبادی کراچی آئے ہوئے تھے ۔ یہ ممکن نہ تھا کہ انجمن ترقی اردو کی دعوت قبول نہ کرتے ۔ اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے اپنا دلنواز کلام سنایا اور اہل انجمن کو ممنون کیا ۔

کانفرنس کی یہ مختصر کیفیت بھی چند خصوصیات کا ذکر کئے بغیر تشنہ رہ جائے گی :— (۱) علمی نمائش جس کا افتتاح ہزہائی‌نس امیر بھاولپور نے اپنے دست مبارک سے کیا اور ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات کا حوصلہ افزا الفاظ میں اعتراف فرمایا ۔ ممدوح نے بیس ہزار روپے جیب خاص سے انجمن ترقی اردو کو عطا کئے اگرچہ انجمن کی دہلی کی نمائش بڑے پیمانے پر سجائی گئی تھی اور وہ سازوسامان کراچی میں میسر نہ آسکتا تھا لیکن جناب مولوی صاحب کے حسن نیت کی برکت سے یہاں بھی مخطوطات، کتبات ، مکاتیب، تصاویر اور قدیم مطبوعات کا لاجواب ذخیرہ فراہم ہوگیا ۔ ایرانی شعرا کے دواوین اور خوش نویسی کے نمونوں کے علاوہ دکنی اساتذہ کے مجموعے جو اور کہیں مشکل سے مل سکتے ہین اور بعض نادر روزگار ہیں، پیش کیے گئے تھے ۔ قرآن مجید کے بے بہا قلمی نسخوں میں، قدیم ترین خطّ

بہار میں دیکھنے کے قابل تھا۔ آردو کتبات کے چربوں میں، ایک مسجد کی تاریخ کا قطعہ ۹۶۱ھ میں کندہ ہوا جس سے قدیم تر غالباً کوئی آردو کتبہ نہیں ملے گا۔ قدیم جرائد میں ۱۸۳۶ء کے دو اخبار تھے ۔ غالب سے اقبال تک چند مشاہیر کے قلمی خط دکھائے گئے تھے ۔ کئی اعلی درجہ کے طغرے اور مرقع سجائے گئے تھے ۔ جناب مولوی صاحب کے ذاتی کتب‌خانے کے علاوہ، نادرات کا بڑا مجموعہ پنجاب کے اہل علم اور پنجاب یونی‌ورسٹی نے مستعار ارسال فرمایا ۔ نمائش کو آراستہ کرنے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی سعی کا بڑا حصہ تھا ۔

(۲) "تعلیمی اجلاس" کا افتتاح جناب فضل الرحمن صاحب وزیر تعلیم نے اور صدارت مولانا محمد اکرم خاں صاحب (صدر مسلم لیگ، مشرقی بنگال) نے کی۔ اسی ضمن میں سائنس کے چند فاضل اساتذہ نے علوم جدید کے مختلف مضامین پر تقریریں کیں۔ یہ اس بات کا عملی مظاہرہ تھا کہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم آردو میں کس طرح دی جاتی ہے۔ جلسے میں توقع سے کہیں زیادہ تعداد میں حاضرین شریک ہوئے اور آخر میں جناب صدر نے کمال مسرت کے ساتھ اعتراف کیا کہ میں خاص طور سے آردو میں مغربی علوم کی اعلیٰ فنی تعلیم کا نمونہ دیکھنا چاہتا تھا اور نہایت ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں غیر زبان کی دریوزہ گری کی قطعی ضرورت نہیں۔ آردو بڑی خوبی سے یہ کام انجام دے سکتی ہے ۔ اس میں جو اصطلاحات وضع کی گئی ہیں ان سے وضع کرنے والوں کی خوش مذاقی اور زبان آردو کی بے پایاں وسعت و صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔

ترقی اُردو کالج کراچی

پاکستان کے اس مختصر پنج سالہ دور میں انجمن کا ایک بڑا کارنامہ "ترقی آردو کالج" کی تاسیس ہے۔ دھلی میں انجمن کی زیر سرپرستی جو "آردو کالج" قائم ہوا، پچھلے ابواب میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ مگر وہ صرف پنجاب کے مشرقی علوم کی درس گاہ تھی۔ ان علوم کے جامعی امتحانات ہوتے تھے۔ لیکن سرکاری مدارس میں تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاتا تھا، لوگ بہ طور خود تیاری کرکے شریک ہوجاتے تھے۔ اسی قسم کی نجی تیاری میں مدد دینے کے لیے دھلی میں وہ "آردو کالج" بنایا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے کوئی باضابطہ حیثیت حاصل نہ تھی اور نہ آردو

فارسی درسیات کے سوا وہاں کسی دوسرے مضمون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بخلاف اس کے کراچی میں جو کالج قائم کیا گیا وہ دوسرے سرکاری کلیات کی طرح ایف اے سے ایم اے کے مدارج تک جملہ جدید فنون کی تعلیم کے لیے تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی کی بجائے اردو زبان تھی۔ درسی مضامین کالج کے مدارج، علی ہذا اساتذہ کی قابلیت کے معیار وہی تھے جو سندھ یونی ورسٹی میں معمول بہا تھے۔ زبان انگریزی کی اسی درجے کی تعلیم لازمی اور اس کا ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی رہنے دیا تھا۔

اس حوصلہ مندانہ اقدام کا سب سے قوی محرک یہ تھا کہ اردو زبان کی اعلیٰ تعلیمی صلاحیت کا ثبوت آنکھوں سے دکھا دیا جائے (۱)۔ دوسرے بہت سے اعلیٰ قابلیت کے مسلمان اساتذہ دکن اور بھارت کے صوبوں سے جان بچا کر پاکستان آئے اور کراچی میں بے روزگار پھر رہے تھے۔ اسی طرح ہزاروں مہاجر طلبہ تعلیم جاری رکھنے کے خواہاں تھے اور کراچی کے معدودے چند مدارس میں انہیں جگہ نہ ملتی تھی۔ ایک بڑی تعداد ایسے خانہ بربادوں کی تھی جو محنت، ملازمت کر کے پیٹ پالتے تھے اور صرف صبح یا رات کے خالی اوقات میں تعلیم حاصل کرسکتے تھے۔ انہی کی خاطر نئے کالج میں رات کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ مگر انجمن کی دل سوزی اور قومی خدمت کی ارباب جامعہ نے کچھ قدر نہ کی۔ بلکہ کالج کے الحاق کی درخواست کو شروع میں مسترد کر دیا (مئی ۱۹۵۰ع) قریب تھا کہ یہ منصوبہ درہم برہم ہو جائے لیکن جناب مولوی صاحب کی نیک نیتی اور استقامت کام کر گئی۔ اس وقت حکومت پاکستان کے وزیر تعلیم (مسٹر فضل الرحمن) اور وزیر فنانس (مسٹر غلام محمد بالقابہم) سے بڑی مدد ملی۔ سندھ یونی ورسٹی نے جانچنے پرکھنے کے بعد بالآخر ”اردو کالج“ کا الحاق منظور کرلیا

(۱) اگرچہ پاکستان میں بعض ایسے لائق لوگ بھی پائے گئے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کی مدارات سے استفادہ کیا مگر اب آسے یاد کرنا بھی نہ چاہتے تھے۔ ایک گروہ کو اپنے تازہ اقتدار کی خیر اسی میں نظر آتی تھی کہ انگریزی کی جھول گلے میں پڑی رہے جس کے اترنے سے اندیشہ تھا کہ لیاقت کے اصلی جوہر کھل جائیں گے۔

(جولائی ۱۹۵۰ع) اس کی ضرورت اور ہردل عزیزی کا اندازہ ان اعداد سے ہوگا کہ پہلے سال کالج کے صرف ۱۲۵ طلبہ امتحان میں شریک ہوسکے تھے، دوسرے ہی سال یہ تعداد آٹھ سو کے قریب پہنچ گئی اور گذشتہ سال (۵۳-۵۲ع) کی روداد (مطبوعہ قومی زبان، ۱۶ مارچ ۵۳) میں ۱۴۲۹ تحریر ہے۔ سال رواں میں سائنس (ایف اے) کی جماعت بھی کھول دی گئی ہے۔ مکان کی تنگی مانع نہ ہو تو مذکورہ بالا تعداد میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ پھر بھی کراچی یا سندھ میں اتنی تعداد پرانے کالجوں میں شاید کہیں نہیں ہوئی جتنی تین سال کے اندر ہماری مہاجر انجمن کی درس گاہ میں زیر تعلیم ہے۔ لامحالہ درس کے دو وقت رکھے ہیں۔ ملازمت پیشہ طلبہ کی سہولت بھی اسی میں ہے۔ کالج کی حیرت انگیز ترقی کا ایک اور ثبوت اس کے سالانہ مداخل و مصارف دکھاتے ہیں کہ پہلے سال ۳۷ ہزار کا خرچ تھا جسے انجمن بہ مشکل پورا کرسکی اور اب پانچویں سال تقریباً دس گنا، یعنی تین لاکھ باون ہزار سے بڑھ گیا ہے(۱)۔ حال آنکہ شروع سے کالج کی فیسیں دوسروں سے کم اور طلبہ کے ساتھ مراعات زیادہ رہی ہیں۔ اساتذہ کی تعداد اب ۴۷ اور ان کی قابلیت کی طرح مشاہرے بھی انگریزی کالجوں کے مماثل ہیں کتب خانے کی تیاری میں مقدور سے زیادہ ہی روپیہ لگایا جاتا ہے۔ مگر وہ کام یابی جس نے انگریزی پرستوں کو عرق عرق کردیا ہوگا، امتحانات کے نتائج سے عیاں ہوئی کہ کام یاب طلبہ کا اوسط عموماً سب جگہ سے بہتر نکلا اور فنون کے اکثر امتحانات میں اسی کالج کے لڑکے جنہوں نے اردو میں تاریخ، معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، اسلامیات وغیرہ کی تعلیم پائی تھی، ان سے فائق نکلے جنہیں "بادشاہ کی انگریزی" میں مذکورہ بالا مضامین پڑھائے گئے تھے۔ بے شبہ اس بازی کے جیتنے میں طلبہ کی محنت اور اساتذہ کے اخلاص و کارکردگی کا بڑا دخل ہے لیکن حقیقت میں یہ اس بدیہی اصول کی کارسازی ہے کہ اعلیٰ تعلیم غیر زبان میں اتنی سہل و دل نشیں نہیں ہوسکتی جس قدر اپنی دیسی زبان میں۔ واضح رہے کہ اردو کالج میں ایم اے تک جملہ مضامین کی انہی کتابوں کے تراجم یا اسی معیار کی اردو تالیفات بہم

(۱) کالج کی آمدنی میں سرکاری امداد شامل ہے جو گذشتہ سال سے پچاس ہزار ملنے لگی ہے۔

پہنچائی گئی ہیں جیسی انگریزی درسیات پڑھائی جاتی ہیں ۔ امسال جدید سائنس کی تعلیم کا آغاز کر دیا ہے اسی مصلحت سے سائنس کے ایک فاضل (میجر آفتاب حسن صاحب) صدر کلیہ مقرر کئے گئے ہیں ۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے انٹر کالج (اورنگ آباد دکن) میں یہی خدمت انجام دے چکے ہیں ۔ اُن کے تجربے اور مستعدی سے یقین ہے کہ ان مغربی علوم کی بذریعہ اردو تحصیل بھی ایسی ہی کام یاب ہوگی جیسی فنون کی رہی ہے اور اس طرح انجمن ترقی اردو ایک بڑی جامعہ بنانے کا راستہ تیار کرلے گی جس میں ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم اردو کے ذریعہ دی جائے ۔ کالج کے انتظامات ایک جداگانہ جماعت کے سپرد کر دئے گئے ہیں جس کے صدر ڈاکٹر عبدالحق صاحب مد ظلہم ہیں ۔ سب سے پہلے سکریٹری مولوی تقی الدین صاحب تھے اور انہوں نے ایسی تن دہی اور محنت سے کالج کی تاسیس میں حصہ لیا کہ وہ اس کی تاریخ میں مدتوں یاد رہے گا ۔ ان کے دست کش ہونے کے بعد مرحوم عبدالرحمن صدیقی جیسے نامور شخص سکریٹری منتخب ہوئے ۔ اور انہوں نے کالج کے مالی انتظامات کو درست کیا ۔ حال میں حکیم محمد احسن صاحب سابق میر بلدیہ ، کراچی کا انتخاب عمل میں آیا ہے ۔ موصوف انتظامی کاموں اور اداروں کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں اور سندھ میں شروع سے اردو زبان اور انجمن ترقی اردو کی حمایت میں سرگرم رہے ہیں ۔

پاکستان میں علمی کام

فسادات ہند اور بھارت کی قومی حکومت کے ہاتھوں جناب مولوی صاحب کے اثاث البیت ، قیمتی کتب خانے اور انجمن کے سرمائے کی بربادی میں بڑا نقصان یہ پہنچا کہ مطبوعات کا تقریباً سارا ذخیرہ وہیں رہ گیا ۔ کراچی میں کوشش کے باوجود پورے سلسلے کا ایک ایک مطبوعہ نسخہ بھی فراہم نہ ہوسکا جیسا کہ گذشتہ ابواب میں بیان ہوا ہے کتابوں کی فروخت سے انجمن کو ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ آمدنی ہونے لگی تھی ۔ جملہ مطبوعات جن میں بعض کی آٹھ آٹھ جلدیں تھیں ، ڈھائی سو کے قریب شمار میں آگئی تھیں ۔ پاکستان میں اسی سلسلۂ شمار کو قائم رکھا گیا ، اگرچہ صدر دفتر کراچی میں صرف وہی کتابیں مل سکتی ہیں جنہیں ضرورت کی بنا پر دوبارہ چھاپا ہے یا جو پاکستان آکر لکھوای اور طبع کرای گئی ہیں ۔ ان کی مجموعی تعداد چالیس سے زیادہ ہے ۔ ہجرت کی پریشانی ، انجمن کی بے سرو سامانی اور کاغذ و

طباعت کی موجودہ مشکلات کو دیکھئے تو چار پانچ سال میں انجمن کا یہ علمی کام کچھ کم قابل تحسین نہیں ہے۔

نوعیت کے اعتبار سے لغت و فرہنگ اصطلاحات کی مد میں، سراج الدین علی خاں آرزو کی کتاب نوادر الالفاظ سب سے پہلے آنی چاہئے کہ جہاں تک معلوم ہے اردو کی پہلی لغت یعنی ملاؔ عبدالواسع کے رسالۂ غرائب اللغات کی عالمانہ تکمیل و توسیع کرتی ہے۔ کتاب کی تصحیح میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب (پروفیسر اوری انٹل کالج، لاہور) نے کئی سال محنت کی۔ مگر کام کی تکمیل اور طباعت انجمن کے پاکستان آنے کے بعد ہوئی۔ مغربی علوم کی الگ الگ فرہنگ اصطلاحات چھاپنے کا سلسلہ ہندوستان میں شروع کیا گیا تھا۔ پاکستان آکر جغرافیہ، فلکیات، کیمیا اور "بینکاری" کی فرہنگیں شایع کی گئیں۔ آخر الذکر اسٹیٹ بنک پاکستان نے جناب مولوی صاحب کی زیر ہدایت مرتب کرائی اور انجمن کے اہتمام سے چھپوائی ہے۔ اس ضمن میں "اصول وضع اصطلاحات" (تصنیف مولانا سلیم مرحوم) کو دوبارہ چھاپنے کے علاوہ، جناب مولوی صاحب کے دو رسالے قابل ذکر ہیں جن میں علمی اصطلاحات اور سائنس کی بذریعۂ اردو تعلیم پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہم اگلے باب میں مطبوعات انجمن کے مجموعی تبصرے میں پھر ان مفید مقالات سے استفادہ کریں گے۔

مغربی سائنس پر ہماری پاکستانی کتابوں میں:

۱ - جدید معلومات سائنس

۲ - نباتی دباغت

۳ - طبیعیات کی داستان اور

۴ - سیر افلاک

اونچے معیار کی ضخیم کتابیں ہیں۔ جدید بینکاری کے موضوع پر انجمن کے لیے احمد سبزواری صاحب نے "ہمارے بینک" نامی کتاب لکھی ہے کہ اردو میں اس موضوع پر نہایت جامع اور مفصل معلومات فراہم کرتی ہے۔ تاریخ میں انجمن کی دو نئی تالیفات خاص طور پر مقبول ہوئیں: (۱) چین و عرب کے تعلقات اور (۲) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (دو جلد)۔ پروفیسر حتّی کی مشہور تاریخ عرب کا ترجمہ تنقیدی حواشی کے ساتھ بہت دن سے مکمل ہے مگر بعض وجوہ سے چھپنے میں

تاخیر ہوئی ۔ ایک اور قابل ذکر ترجمہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کی تیسری جلد (عہد مغولاں) شائع کیا گیا ہے ۔ ادبی تنقید کے سلسلے میں انجمن کی تین کتابیں پاکستان آکر چھاپی گئیں : (۱) دهلی کا دبستان شاعری ۔ (۲) نیا ادب (۳) ارتقائی تنقید ۔ اور تینوں اپنے موضوع پر وسیع مطالعه کی آئینه دار ھیں ۔ دیوان اشرف علی فغاں اور اس کے کلام و سوانح پر مبسوط مقدمه بھی پاکستان ھی سے شایع ھوا ہے ۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا کئی کتابیں جن کی بہت مانگ تھی ازسرنو کراچی میں نظر ثانی کرکے چھپوائی گئیں ۔ جیسے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے خطبات ، چند ھم عصر ، قواعد آردو ، انتخاب کلام میر اور قدیم آردو میں سب رس ، مثنوی قطب مشتری ، خواب و خیال وغیرہ ۔ قدیم ادب کے بعض شاہ کار حکومت پاکستان کی فرمائش سے انجمن تصحیح و تحشیه کرکے چھپوا رھی ہے ۔ پاکستانی مطبوعات کی فہرست اس باب کے آخر میں ضمیمه کردی گئی ہے ۔ خاص خاص کتابوں کا آینده تبصرے میں ذکر آئے گا ۔

اگرچه پاکستان کی مطبوعه کتابوں کا سالانه اوسط هندستان کے گذشته چالیس پینتالیس برس کے اوسط سے اب بھی کم نہیں رھا لیکن جناب مولوی صاحب کے عزم و امید سے بہت فروتر ہے ۔ چنانچه ممدوح نے غور و مشاورت کے بعد آینده علمی کاموں کا جو منصوبه مرتب کیا ہے وہ نه صرف کتابوں کی نوعیت بلکه تعداد کے اعتبار سے گذشته تمام اوسطوں سے کہیں بڑھا چڑھا ہے ۔ ھم اسے اگلے باب کے آخر میں نقل کریں گے ۔ لیکن آمدنی کے چوتھائی رہ جانے اور دوسری مشکلات پیش آنے کے باعث اگر پچھلے ۴، ۵ سال میں کتابیں زیادہ نه چھپ سکیں تو بھی کراچی میں انجمن کے رسائل، کوتاھئی اشاعت کے با وجود ، دهلی کے عہد عروج تک سے بازی لے گئے ۔ ان میں سے تین سه ماھی (یعنی آردو، سائنس اور تاریخ و سیاسیات) معیار مضامین اور افادیت میں برعظیم کی کسی زبان کے رسائل سے کم نه نکلیں گے ۔ دهلی کے " ھماری زبان " کی جگه " کراچی سے نیم ماهه " قومی زبان " ۴۸ع سے جاری کردیا گیا ہے ۔ ایک ماھانه رساله "معاشیات" اپنے دهلی کے ھم نام سے زیاده مقبول و مفید نکل رھا ہے ۔ مہاجر انجمن کا بے سروسامانی کے ابتدائی سنین میں ایسے

بلند پایہ رسائل شائع کرنا ، اہل نظر کے نزدیک جناب مولوی صاحب کے دلی اخلاص کی ایک اور کرامت باہرہ شمار ہونی چاہیے ۔ یہ سب رسالے اب نسخ ٹائپ میں بہت صاف ستھرے چھپتے ہیں ۔ ٹائپ کی طباعت کے لیے انجمن ترقی اردو مدت سے اہل وطن کو توجہ دلا رہی ہے جس کے بغیر کوئی زبان جدید السنہ کی مطبوعات کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ اورنگ آباد میں اس نے اپنا مطبع قائم کیا تو ٹائپ ہی میں سب کتابیں چھاپتی تھی مگر دہلی میں دوسرے مطابع سے کام لینا پڑا اور پھر وہی پتھر کی چھپائی قسمت میں آئی ۔ کراچی میں پتھر کے چھاپہ خانہ بھی ایسے نہ ملے جو وقت پر اچھی کتابیں چھاپ دیں ۔ آخر چھوٹا سا ٹائپ کا مطبع دفتر انجمن میں قائم کیا گیا اور ایک ہی سال میں اس کی خوبئ طباعت کراچی میں ممتاز مانی جانے لگی ۔ مجلس نظما کی تحریک سے اب انجمن کے مطبع کو مزید توسیع دی گئی ہے کہ بڑے پیمانہ پر جلد چھپائی ہو اور وہ انجمن کی آمدنی کا بھی ایک ذریعہ بن جائے ۔

ضمیمہ باب ہفتم

مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

خطبات عبد الحق پہلے یہ کتاب دو چھوٹی جلدوں میں طبع کرائی گئی تھی۔ مگر اس کے نسخے مدت سے نایاب تھے اب نئے خطبات کے اضافے کے ساتھ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے انجمن کے لئے مرتب کیا ہے۔ قیمت فی جلد: ساڑھے چھ روپے۔

سب رس تصنیف: ملا وجہی۔ مرتبہ: ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب - مع مقدمہ و فرہنگ - نثر میں اردو کی سب سے قدیم تصنیف ہے۔ دوسرا ایڈیشن مع تصحیح و اضافہ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

قطب مشتری تصنیف: ملا وجہی، مصنف سب رس و شاعر دربار سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی تصنیف۔ مع مقدمہ بابائے اردو۔ قیمت پونے چار روپے۔

مثنوی گلشن عشق تصنیف: ملانصرتی ملک الشعرائے عادل شاہیہ - بیجاپور دکن - حاشیے میں قدیم الفاظ کے جدید مرادفات بھی لکھ دئے گئے ہیں۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔

دیوان فغاں مصنف اشرف علی خاں فغاں (متوفی سنہ ۱۱۸۶ھ) مرتبہ سیدصباح الدین عبدالرحمن: قیمت تین روپے۔

انتخاب جدید مرتبہ پروفیسر عزیز احمد صاحب استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن و پروفیسر آل احمد صاحب سرور استاد لکھنؤ یونی ورسٹی، عہد حاضر کے پچاس سے زائد شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

انتخاب کلام میر اردو کے لافانی شاعر حضرت میر تقی میر کا بہترین انتخاب مع مقدمہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ حجم ۳۰۰ صفحات، قیمت چار روپے۔

مثنوی خواب و خیال خواجہ میر درد رحمۃ کے بھائی خواجہ میر اثر کی مثنوی جو اردو کی چند بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ دوسری بار چھاپی گئی ہے۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

تاریخ ادبیات ایران پروفیسر براؤن کی مشہور تاریخ 'ادبیات ایران، کی تیسری جلد بعہد مغولان کا ترجمہ مترجمہ محمد داؤد رہبر صاحب قیمت دس روپے آٹھ آنے

دھلی کا دبستان شاعری یہ دھلی کے مشہور شعرا کا مستند تذکرہ ہے۔ مصنفہ ڈاکٹر نورالحسن صاحب ھاشمی قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

نیا ادب مصنف پنڈت کشن پرشاد کول۔ نئے ادب پر ایسی بے لاگ تنقید شاید اب تک نہیں لکھی گئی۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

اُردو تنقید کا ارتقا تنقید کے بتدریج ارتقا کا مکمل جائزہ از ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے۔

چین و عرب کے تعلقات مصنفہ مولوی بدرالدین بہ حنی فاضل جامعہ ازہر (مصر) و بی، اے جامعہ ملیہ اسلامیہ (دھلی)۔ قیمت مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت اسلامی ھند کی یہ معرکہ الآرا تاریخ انجمن نے خاص طور سے مولوی سید ھاشمی فرید آبادی سے لکھوائی ھے۔ قیمت جلد اول سات رپے آٹھ آنے۔ جلد دوم زیر طبع ھے۔

اصطلاحاتِ بنکاری بینکوں کے کاروبار سے متعلق جو اصطلاحات روزانہ استعمال ھوتی ھیں یہ اُن کے اُردو مرادفات کی لغت ھے۔ قیمت فی جلد چار رپے آٹھ آنے۔

نوادرالالفاظ سراج الدین علی خان آرزو کی مشہور کتاب ھے جسے ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب پروفیسر پنجاب یونی ورسٹی نے انجمن کے لئے مرتب کیا ھے۔ قیمت غیر مجلد پانچ رپے آٹھ آنے۔

کیفیہ پنڈت برج موھن دتاتریہ کیفی دھلوی نے اس کتاب میں اُردو ادب اور انشا سے متعلق اپنی زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ھے۔ قیمت پانچ رپے

علمی اصطلاحات کا مسئلہ از ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب قیمت آٹھ آنے۔

علمی اصطلاحات کی تاریخ (بہ زبان انگریزی) از ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب قیمت آٹھ آنے۔

قواعد اُردو اُردو زبان کے قواعد پر بہترین اور جامع کتاب مولفہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب قیمت بلا جلد پانچ رپے۔

اُردو قاعدہ قیمت چار آنے

اُردو کی فضیلت پاکستان کی قومی زبان کے مسئلے پر بنگالی اھل نظر کے افکار و خیالات کا مجموعہ انگریزی و اُردو اڈیشن قیمت: ایک روپیہ۔ بنگالی اڈیشن زیرطبع ھے۔

حیوانات از محشر عابدی صاحب شعبہ حیوانات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن قیمت: بلا جلد دو رپے چارآنے مجلد تین رپے۔

نباتی دباغت فن دباغت سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے خاص چیز ھے۔ قیمت مجلد پانچ رپے آٹھ آنے۔

جدید معلومات سائنس (جلد اول) مؤلف میجر آفتاب حسن صاحب قیمت مجلد نو رپے۔

قوائے طبیعیہ از ڈاکٹر صادق حسین صاحب۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

داستان طبیعیات مرتبہ نصیرالدین صاحب عثمانی استاد جامعہ عثمانیہ قیمت آٹھ رپے بارہ آنے

اصطلاحات کیمیا قیمت تین رپے۔

باب ہشتم

پچھلی کارگزاری ۔ آیندہ کے منصوبے

گذشتہ اوراق میں انجمن کی پنجاہ سالہ زندگی کے ضروری واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے تفصیلات کو نظر انداز کردیا ، تاہم بیچ کے ابواب سے ناظرین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح گاندھی جی اور کانگرس کی اردو سے مخالفت نے جناب مولوی عبدالحق صاحب کو مقابلے پر برانگیختہ کیا اور کس طرح ان کی والہانہ کوشش سے انجمن کے مقاصد ایک بڑی ملّی تحریک میں بدل گئے۔ سنہ ۱۹۳۶ء کی اردو کانفرنس ، علی گڑھ ، کو حکیم امت ڈاکٹر اقبال مرحوم نے جو پیام بھیجا اس میں صراحت کی تھی کہ زبان اردو کی حفاظت و بقا کی یہ کوشش ہندستان کے مسلمانوں کے لیے اس تحریک سے کچھ کم وزن و کم اہم نہیں ہے جسے سر سید علیہ الرحمہ نے جدید علوم کی ترویج کے لیے شروع کیا تھا۔ چنانچہ اگلے چند سال کے دو قومی نظریے کے معرکوں میں اردو بھی سیاسی جنگ کا ایک مورچہ بن گئی تھی۔ اس پہلو سے قطع نظر ، انجمن جب سے جناب مولوی صاحب کی تحویل میں آئی اور انھوں نے اردو کو اعلیٰ درجے کی علمی اور تعلیمی زبان بنانے کی جدو جہد کا آغاز کیا۔ اس کے بالواسطہ اثرات کئی رنگ میں دور دور تک پھیلے۔ قدرتی طور پر ان کا نمایاں ظہور ہم ریاست حیدرآباد میں دیکھتے ہیں جہاں مولوی صاحب محکمۂ تعلیم سے منسلک اور پہلے سے اہل حکومت میں روشناس تھے۔ ان کے سکرٹری انجمن منتخب ہونے کے دو تین سال بعد ہی محکمۂ تعلیم کی توسیع و تجدید عمل میں آئی۔ سید راس مسعود مرحوم ناظم تعلیمات مقرر ہوکر حیدرآباد آئے۔ وہ

جناب مولوی صاحب سے دیرینہ عزیزانہ قسم کے تعلقات رکھتے تھے۔ ریاست میں اگرچہ سرکاری زبان آردو تھی مگر ابتدائی تعلیم کے لیے علاقائی زبانوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اب تیسرے یا چوتھے سال سے آردو کو بھی لازمی کردیا گیا۔ اسے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کی پہلی کوشش یہ کی گئی کہ دارالعلوم کے جدید نصاب میں مغربی علوم شامل اور ان کے لیے آردو میں کتابیں لکھوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جناب مولوی صاحب نے انجمن کی سالانہ کیفیت سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ خوش خبری سنائی تھی کہ:

'' اب ان تمام علوم کی تعلیم کے لیے آردو میں کتابیں لکھوائی یا ترجمہ کرائی جائیں گی۔ اور اس کام کو انجمن ترقی آردو نے اپنے ذمے لیا ہے۔ . . اس سے پہلے جب کبھی یہ کہا گیا کہ علوم کی تعلیم اپنی زبان کے ذریعے سے دی جائے کیوں کہ غیر زبان کے ذریعے سے تعلیم دینے میں طرح طرح کے نقصان ہیں تو اکثر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ آردو میں کتابیں ہی کہاں ہیں۔ لیکن کتابیں کہاں سے آئیں جب کہ ہم نے سرے سے کبھی اپنی زبان میں تعلیم دینے کا تہیہ ہی نہیں کیا۔ یہ پہلا وقت ہے کہ دارالعلوم حیدرآباد میں اس کا فیصلہ ہوا ہے اور اب کتابیں بھی تھوڑے عرصے میں تیار ہوجائیں گی . . . . حضور نظام کی گورمنٹ کا شکریہ ہم پر واجب ہے کہ اس نے ایک ایسے کام کی ابتدا کی ہے جو ملک میں حقیقی علم اور روشنی پھیلانے کا باعث ہوگا اور آیندہ اس کی تقلید دوسرے مقامات پر بھی کی جائے گی ''۔ (رپورٹ ۱۰ء صفحہ ۱۳)۔

دارالعلوم حیدرآباد میں مذہبی علما اور مشائخ کی قدامت پرستی نے مغربی علوم پڑھانے کی تجویز بارور نہ ہونے دی لیکن آردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا اصول ارباب اقتدار کے ایسا ذہن نشین ہوگیا تھا کہ وہ ایک علاحدہ یونی ورسٹی بنانے پر تیار ہوگئے۔ محکمۂ تعلیم کے سکریٹری (سر اکبر) حیدری صاحب اور امور مذہبی کے صدر صدور (صدر یار جنگ) شروانی صاحب اس حوصلہ مندانہ اقدام کے دل سے حامی تھے۔ وزیر خزانہ (سر ریجی نالڈ) گلینسی نے مالی امداد کا یقین دلایا۔ انہی صاحبوں کے اتفاق رائے سے جامعہ عثمانیہ کی عہد آفریں تجویز

مرتب ہوکر حضور نظام کی منظوری سے مشرف ہوئی ۔ ابتدائی تجاویز اور ''عرضداشت،، کے مسودات سب جناب مولوی صاحب نے لکھے تھے ۔ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں تیار کرنے کی غرض سے جو دارالترجمہ قائم کیا گیا ، اس کی نظامت بھی اولاً انھی کے تفویض ہوئی ۔ یہی اس عظیم ادارے کی داغ بیل تھی جس نے آیندہ بیس پچیس برس میں نہ صرف ممالک ہند بلکہ یورپ میں تحسین کا خراج وصول کیا انھی دنوں ''ترک موالات ،، کی تحریک میں سرکاری مدرسوں کی تعلیم حرام قرار دی گئی آزاد قومی درس گاہیں وجود میں آئیں ۔ مہاتما گاندھی کی توجہ دوسری میدانوں میں دوڑنے کے باعث یہ ودیالے اور پاٹ شالے کس مپرسی میں رہ گئے صرف ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی جگہ جمی رہی لیکن ان سب قومی مدرسوں میں یہ اصول مان لیا گیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قومی زبان ہوگی ۔ اسی طرح شمالی ہند کی کئی سرکاری یونی ورسٹیوں نے فنون کی تعلیم کے لیے ایف اے کے درجہ تک ملکی زبان رائج کر دی تھی ۔ یہ اقدام بڑی حدتک جامعہ عثمانیہ کے کام یاب تجربےکو دیکھ کر کیا گیا اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا خود جامعۂ عثمانیہ کی تجویز و تشکیل میں انجمن ترقی اردو کی تحریک اور اس کے عالی خیال سکریٹری کا بہت اہم حصہ تھا ۔

علم و ادب کی دنیا میں انجمن کی کتابوں نے اردو نثر کا بلند معیار قائم کیا ۔ مختلف علوم پر جو کتابیں اس نے تالیف یا ترجمہ کرائیں وہ معلومات اور نگارش کی خوبی میں مغربی مطبوعات کے مماثل تھیں ۔ لسانیات اور تاریخ زبان کے سلسلے میں جو کام اس نے انجام دیا وہ اعلیٰ درجے کی علمی تحقیقات کا نمونہ ہے ۔ بے شبہ انگریزی تعلیم ، طباعت و مواصلات کی ترقی اور دوسرے قدرتی اسباب مساعد و مددگار ہوگئے لیکن غالباً کوئی صاحب نظر منصف مزاج شخص انکار نہ کرے گا کہ گذشتہ تیس برس میں انجمن ترقی اردو ادب اردو کی سب سے ممتاز رہ نما رہی ۔ خصوصیت کے ساتھ اس کے سہ ماہی اردو نے ادبی تنقید کی نئی راہیں دکھائیں ۔ بعد کے کئی اچھے رسالے اسی کے نقش قدم پر چلے اور بہ تدریج اس شعبۂ ادب نے خاص منزلت حاصل کرلی ۔ جہاں تک تاریخ زبان ، قدیم تذکروں اور دکنی کا ، نیز فارسی ادبیات کا تعلق ہے ، رسالۂ اردو کے تحقیقی مقالات کا شہرہ دور دور تک

پہنچا اور اہل علم نے اس کے نتائج کو سند مانا۔ ایسے متعدد مضامین کتابی صورت میں شائع کئے گئے اور ہمارے ادب عالیہ کا بیش قیمت جز بن گئے ہیں۔

انجمن کی مطبوعات : ۱۔ لغات

ان تمہیدی اشارات کے بعد انجمن کی پنجاہ سالہ مطبوعات پر ایک مجموعی نظر ڈالنی ضروری ہے جن کا پچھلے اوراق میں کہیں کہیں منفرداً ذکر آچکا ہے۔ ان میں سب سے پہلے لغات و فرہنگ مصطلحات کو لیجیے۔ اس ذیل میں انجمن مختلف سنین میں یہ کتابیں شائع کرچکی ہے :

(۱) انگریزی سے اردو کی بڑی (اسٹینڈرڈ) ڈکشنری
(۲) ,, ,, اسٹوڈنٹس ,,
(۳) فرہنگ اصطلاحات علمیہ : فلکیات
(۴) ,, جغرافیہ
(۵) ,, عمرانیات
(۶) فرہنگ اصطلاحات علمیہ : طبعیات
(۷) ,, ,, کیمیا
(۸) ,, ,, بینک کاری
(۹) اصول وضع اصطلاحات
(۱۰) اردو زبان میں علمی
(۱۱) اصطلاحات ۔ اس کی تاریخ
(۱۲) اردو بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم سائنس
(۱۳) فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ۔ آٹھ جلد
(۱۴) نوادر الالفاظ

ان میں پہلی کتاب متعدد اہل علم کی دس گیارہ سال کی محنت سے تیار ہوئی اور ۱۹۳۷ع میں بڑی تقطیع کے (دو کالمی) پندرہ سو سے زائد صفحات پر چھاپی گئی۔ یہ انگریزی کی جدید ترین اوکس فورڈ کن سائز ڈکشنری پر مبنی ہے جس میں تقریباً دو لاکھ انگریزی الفاظ و محاورات کے ہم معنی اردو الفاظ دئے گئے ہیں۔ ہندستان

کی کسی اور زبان میں انگریزی کی اتنی بڑی لغت موجود نہیں نہ اردو یا ہندستانی میں اس سے قبل تیار ہوئی ۔ کتاب ممالک ہند میں کافی مقبول و متداول ہوچکی ہے اور اس کا خلاصہ (اسٹوڈنٹس ڈکشنری) بھی ہزاروں کی تعداد میں چھپا ہے ۔ چند سال سے انجمن بڑے نسخے کی صحت و نظر ثانی کے بعد دوبارہ چھاپنے کی فکر میں ہے لیکن ” آزادیٔ ہند ،، کی تباہ کاری سے ابھی تک طباعت کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا ۔ بہر حال اپنی افادیت اور زبان اردو کی صلاحیت کے ثبوت میں اس شعبے میں انجمن کا یہی کارنامہ مدت دراز تک جناب مولوی صاحب کے احسان عظیم اور حُسن تنظیم کی یاد دلانے کے لئے کافی ہے ۔

اردو میں اعلیٰ مغربی تعلیم دلانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں سائنس کی جدید اصطلاحات موجود نہیں ہیں ۔ حالانکہ جب کسی زبان میں تعلیم دینے کا ارادہ کیا گیا ، تو کتابوں کے ترجمے کے ساتھ اصطلاحات کا عقدہ بھی کسی نہ کسی طرح حل ہو جاتا ہے ۔ ہماری زبان میں ایک صدی پہلے اردو کالج دھلی میں یہ تجربہ کیا گیا تھا ۔ قرن حاضر میں اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے ان مشکلات سے عہدہ برآ ہوکر دکھا دیا ۔ وہاں یورپ کے اعلیٰ تعلیم یافتوں کی متعدد جماعتیں مامور تھیں کہ اپنے اپنے علوم کی مغربی اصطلاحات کی تشریح اور ماہرین زبان کی مدد سے ان کے مترادفات فراہم یا نئے وضع کریں ۔ چنانچہ ہزاروں اصطلاحیں منظور کی گئیں اور درسی کتابوں میں استعمال ہونے لگیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن کی طرف سے اہل علم کی جماعتیں الگ قائم کیں اور ایسی لگاتار محنت وسعی سے جو انہی کا حصہ ہے ، مختلف علوم کی اصطلاحات کو مرتب کرکے چھپوایا ۔ ان کی کئی بار ترمیم و تصحیح کرائی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے ۔ انجمن کے اجلاسوں میں ، دوسرے علمی جلسوں میں ، پھر رسالۂ اردو کے صفحات میں ان علمی اصطلاحات پر جو عالمانہ مباحث اور مقالات شایع ہوتے رہے انہیں جمع کیا جائے تو ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں لیکن اوپر کی فہرست میں ہم نے ایک کتاب اور تین رسائل کو شامل کرنا ضروری سمجھا مندرجۂ بالا کتاب ” اصول وضع اصطلاحات ،، اس موضوع پر سب سے جامع اور مشہور تصنیف ہے ۔ جناب مولوی صاحب نے اشاعت کے وقت سالانہ رپورٹ (۲۳,۱۹۲۲ع) میں بایں الفاظ

اس کا تعارف کرایا تھا :

" یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے - بقول فاضل مولف ، یہ بالکل نیا موضوع ہے - میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے - نہ ایشیا کی کسی زبان میں — اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں - زبان کی ساخت ، اس کے عناصر ترکیبی ، مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے ، سابقے ، لاحقے ، مصادر اور ان کے مشتقات ، غرض سینکڑوں دل چسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں - اردو میں بعض اور بھی کتابیں ہیں جن کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں ، لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلے بلند کر دئے ہیں اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور آیندہ ترقی کے دعوے کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے - مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا - اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا گیا ہے ،،

اصطلاحات پر وہ تین رسالے جن کا نام اوپر درج ہے (۱۰، ۱۱، ۱۲) جناب مولوی صاحب نے پاکستان آکر لکھے ہیں پہلے دو میں وضع اصطلاحات کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے تیسرے میں جس کا آگے بھی ذکر آئے گا ، واضح کیا ہے کہ جدید سائنس کی اعلیٰ تعلیم نہ صرف یہ کہ اردو میں ہوسکتی ہے ، بلکہ درحقیقت جب تک اردو میں نہیں دی جائے گی سائنس کو پاکستان میں جیسا چاہیے فروغ حاصل نہ ہوسکے گا -

اردو کی تحقیق و تقویت کے لیے انجمن کا ایک اور بے مثل کام " اصطلاحات پیشہ وراں ،، کی تالیف ہے - یہ کتاب مولوی ظفر الرحمن صاحب مرحوم نے کئی سال کی جاں کاوی سے تیار کی تھی - وہ دھلی کے ایک پرانے معزز خاندان کے فرد تھے اور بعض فنون میں خود بہت اچھی مہارت رکھتے تھے - انہوں نے دو سو سے زیادہ پیشے

حرفتیں ، سپاہیانہ کھیل ، بازیاں ، فنون وغیرہ کی الگ الگ اصطلاحیں اسی پیشے یا کام کے استادوں سے تحقیق کر کے جمع کیں ۔ صدہا اوزار ، آلات ، اور ان کے اجزا کے نام اور تشریحیں لکھیں ۔ بہت سی تصویریں دے کر معنی سمجھائے ۔ پرانی لغات اور فرہنگوں سے بھی حتی الامکان مدد لی ۔ غرض پندرہ ہزار سے زیادہ ایسے الفاظ فراہم کئے جنہیں صرف کاریگر اور اسی کام کے ماہر بولتے ہیں اور وہ ہماری زبان کا ایک حد تک چھپا ہوا حصہ ہیں ۔ قدیم تہذیب کے ساتھ پچھلے دور کے پیشے صنعتیں حرفتیں بھی معرض زوال میں آگئی ہیں ۔ ان کی اصطلاحات کو عام طور پر لوگ بھولتے جاتے اور ان کے بجائے انگریزی الفاظ بولنے لگے ہیں ۔ اس کتاب نے کم سے کم علمی اور تاریخی اعتبار سے اردو کے ہزاروں الفاظ کو محفوظ کردیا اور اگر ہمارے پیشہ وروں میں تعلیم پھیلی تو بہت ممکن ہے کہ یہ پرانے الفاظ از سرنو زندہ ہو جائیں ۔

آخر میں نوادر الالفاظ کی نسبت چند الفاظ لکھنے ضروری ہیں ۔ جیسا کہ کسی گذشتہ باب میں ذکر آچکا ہے ، (فارسی میں) یہ اردو کی سب سے پہلی باقاعدہ فرہنگ ہے جو ملا عبدالواسع ہانسوی کے رسالہ " غرائب اللغات " کی تصحیح و تکمیل کے لیے ۱۱۶۵ھ میں فاضل زمانہ سراج الدین علی خاں آرزو نے تالیف کی تھی ۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب (صدر شعبہ اردو اورینٹل کالج لاہور) نے کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ اور لغات کی مدد سے تصحیح و تشریح کے ساتھ اسے مرتب کیا ۔ ڈاکٹر صاحب کا فاضلانہ مقدمہ اور حواشی ان کی دیدہ ریزی اور نکتہ رسی کے گواہ ہیں ۔ کتاب کی تیاری میں آٹھ سال صرف ہوئے ۔ پاکستان آکر چھاپی گئی ہے ۔

۲ - تاریخ زبان اور تذکرے

آٹھویں صدی ہجری میں سلطان محمد تغلق نے اہل دہلی کو جبراً دکن میں منتقل کیا ۔ یہ مسلمان اپنی ہندی بولی یعنی ابتدائی اردو کو ساتھ لائے اور انہی نے کچھ مدت بعد اس میں نظم و نثر کی کتابیں تحریر کیں ۔ یہ زبان مقامی اثرات سے متاثر ہوئی اور کوئی تین سو برس بعد سلاطین مغل نے جب دکن پر یورش کی تو اس وقت تک شمال کی بولی سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوچکی تھی اسی لیے ہندی کی بجائے اسے دکنی کہنے لگے ۔ مغل فتوحات ، خصوصاً عالمگیر کے قیام دکن پھر آصف جاہی دور میں دوبارہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد شمال سے آئی اور ان کی بولی

نے ضرور پرانی دکنی کا رواج روک دیا ۔ حتیٰ کہ عہد حاضر میں دکنی کی قلمیں کتابیں خال خال پرانے کتب خانوں یا کہیں خانقاہوں میں دبی رہ گئیں جنہیں کوئی پڑھنے اور سمجھنے والا نہ ملتا تھا ۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب کا زبان پر یہ ایک اور ایسا احسان ہے جو کبھی فراموش نہ ہوسکے گا کہ سب سے پہلے انہوں نے کمال کدو کاوش سے جگہ جگہ پر کر دکنی مخطوطات جمع کیے پھر ان کے مشکل رسم الخط کو پڑھا اور نامانوس الفاظ کو حل کرکے ان بھولی بسری کتابوں کو دوبارہ زندہ کردیا۔ مولوی صاحب کے تحقیقی مقالات اور قدیم نظم و نثرکی اشاعت نے اس بے سروپا روایت کو ٹھکانے لگادیا کہ آردو شاہ جہاں کے لشکر والوں کی زبان تھی ۔ رفتہ رفتہ یہ حقیقت جو عین عقل کے مطابق تھی واضح ہوگئی کہ مسلمان فاتحین ممالک ہند میں قیام کے بعد ہی یہاں کی ہندی بولنے لگے تھے اور وہ ہی اسے اپنی فتوحات کے ساتھ بنگال و گجرات اور دکن تک لے گئے ۔ یہ عمل مغل سلاطین کے ہندستان میں آنے سے کئی صدی پہلے سے جاری تھا جس کا صریحی ثبوت یہ دکنی کتابیں پیش کرتی ہیں ۔ اس انکشاف سے نہ صرف آردو زبان کی عمر صدیوں بڑھ گئی بلکہ ہندستان کے مسلمان کی ملی تاریخ اور تہذیبی وحدت کے مطالعے کا ایک نیا باب کھل گیا ۔ دکنیات پر جناب مولوی صاحب کے بیسیوں مضامین رسالہ' آردو میں چھپے اور جو زیادہ طولانی اور اہم تھے وہ کتابی صورت میں شایع کیے گئے ۔ ان میں خاص طور سے قابل ذکر ایک تو وہ مقبول عام رسالہ ہے جس میں ساتویں صدی ہجری سے گیارھویں صدی تک کے بزرگان صوفیہ کی لسانی خدمات کو بڑی تحقیق کے ساتھ واضح کیا گیا ہے : (''آردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام،،) لیکن ٹھیٹ دکنی کی کتابیں جن کا پڑھنا کوہ‌کندن سے کم نہ تھا ملا وجہی کی سب‌رس (نثر) اور مثنوی قطب و مشتری ہیں جو گیارھویں صدی ہجری کے نصف اول میں قطب شاہی عہد میں تصنیف ہوئیں ۔ سب رس کا کامل نسخہ ہندستان میں نہ تھا ۔ اتفاق سے برٹش میوزیم میں ملا اور اس کا عکس منگا کر یہ قدیم اور دل چسپ کتاب طبع کرائی گئی ۔ اسی قسم کی دیدہ ریزی نصرتی کے حالات اور کلام کو جمع کرنے میں پیش آئی ۔ وہ وجہی سے کم عرصے بعد کا آدمی ہے علی عادل شاہ ثانی کے دربار میں ملک الشعرا اور 'بزم و رزم' ، ہر صنف شعر میں

قدرت کاملہ رکھتا تھا۔ اس کی مثنویاں، علی نامہ اور تاریخ سکندری، بیجا پور کے عادل شاہیوں کے آخری عہد کی تاریخ کے بہترین ماخذ مانے گئے ہیں ایک مثنوی گلشن عشق کو حال ہی میں انجمن نے شایع کیا ہے۔ دکن کی چند اور کتابیں چھاپی گئی تھیں اور بعض اب پاکستان میں چھاپی جارہی ہیں۔ گیارھویں صدی ہجری کی ایک اور مشہور کتاب "خالق باری،، کا جو شمالی ہند میں تصنیف ہوی۔ یہاں ذکر کردینا چاہیے۔ اسے امیرخسرو رح سے منسوب کیا جاتا تھا۔ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے اسی ژرف نگاہی سے جو ان کا حصہ تھی اسے مطالعہ کیا اور بتایا کہ خالق باری کی زبان اکبر و جہانگیر کے عہد سے پہلے کی نہیں ہوسکتی۔ اس تحقیقی مقالے کی اشاعت کے تھوڑے ہی دن بعد جناب مولوی صاحب کو خالق باری کا ایک قدیم نسخہ ملا۔ جس میں مؤلف کا نام "ضیاءالدین خسرو شاہ،، اور سن تصنیف ۱۰۳۱ھ تحریرتھا۔ اس نے شیرانی مرحوم کی حیرت انگیز بصیرت اور تحقیق کو قطعی طور پر ثابت کردیا۔ پھر انھی کی تصحیح اور مقدمے کے ساتھ یہ کتاب انجمن ترقیٔ اردو نے شایع کردی۔

انجمن کی ایک اور عظیم لسانی خدمت ان تذکروں کی تلاش و اشاعت ہے جن میں مشاہیر شعرائے اردو کے منتخب کلام اور حالات زندگی درج ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کے نام کا حوالہ آجاتا تھا، قلمی نسخے بہت کمیاب تھے اور بعض کا نام تک معلوم نہ تھا، مثلاً میر تقی جیسے نامی گرامی شخص کی خود نوشتہ سوانح عمری "ذکر میر،، کہ محض مولوی صاحب کے اخلاص کی برکت سے انھیں مل گئی (تالیف ۱۱۹۷ھ) اور کئی اعتبار سے نہایت بیش بہا تاریخی دریافت کا مرتبہ رکھتی ہے۔ مولوی صاحب نے پرمغز و دل کش مقدمہ لکھا اور دنیائے ادب میں انجمن کو اس کے پیش کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ میر صاحب کے تذکرۂ "نکات الشعرا،، (تالیف ۱۱۶۵ھ) کو بھی مولوی صاحب ہی نے اردو شناسوں میں روشناس کیا جس کا شمار سب سے قدیم اردو تذکروں میں ہوتا ہے۔ پھر وہ میر تقی جیسے نکتہ سنج کے انتخاب اشعار کا مجموعہ ہے۔ تذکرے میں میر صاحب کی معاصرانہ چشمک اور ذاتی تعصبات کی بھی جا بہ جا جھلک نظر آجاتی ہے۔ اسی کے بظاہر جواب میں گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویاں،، لکھا تھا۔ انھی خطوط پر نواب علی

ابراہیم نے ''گلزار ابراہیم،، تالیف کیا۔ (۱۱۹۸ھ) جس میں تین سو سے زیادہ اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ یہ دونوں تذکرے اور لچھمی نرائن شفیق کا نایاب مجموعہ ''چمنستان شعرا،، علی‌ٰ ھذا قایم چاند پوری کا ''مخزن نکات،، تلاش و تصحیح کے بڑے اہتمام سے چھاپے گئے۔ تذکرہ ''گل عجائب،، اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی کی تالیف ہے (۱۱۹۴ھ) اور اس میں ہم کئی ہم‌عصر دکنی شعرا کے نام اور کلام سے متعارف ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد کا، مگر خاص گجرات کے اردو شعرا کا تذکرہ ''مخزن الشعرا،، قاضی نورالدین فائق کی تالیف بھی انجمن کی مطبوعات میں شامل ہے۔ استاد سخن مصحفی کے تین عمدہ تذکرے چھاپے گئے ہیں جن میں سے دو (یعنی تذکرۂ ہندی اور ریاض‌الفصحا) اردو شعرا اور ایک (عقد ثریا) فارسی سخن‌وروں سے متعلق ہے۔ اسی زمانے کا ایک اور قابل قدر تذکرہ شعرائے اردو، میرحسن دہلوی کی تالیف ہے جسے انجمن نے بڑی محنت سے صحیح کرکے شایع کیا۔

تذکروں کی ذیل میں چند مشاہیر شعرا پر مستقل کتابوں کا ذکر کردینا بےمحل نہ ہوگا بیجاپور کے ملک‌الشعرا نصرتی پر جناب مولوی صاحب کی کتاب کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ ٹھیٹ ہندی کے مشہور شاعر ملک محمد جائسی کے جس قدر حالات مل سکے، جائس کے کلب مصطفیٰ صاحب نے محنت و شوق سے جمع کیے اور ان کی تصانیف پر مفصل تبصرہ تحریر کیا (ریختہ کے دور میں) مرزا رفیع سودا کی سوانح اور کلام پر جناب مولوی صاحب کے لایق جوان مرگ شاگرد شیخ چاند مرحوم نے مبسوط مقالہ لکھکر اہل نظر سے تحسین حاصل کی۔ میرصاحب کے خود نوشتہ حالات (فارسی میں) چھپے، جناب مولوی صاحب نے مقدمۂ کتاب میں گویا ان کا تکملہ اردو میں کردیا ہے۔ زمانۂ حاضرہ کے نامی شعرا میں مولوی اکبر حسین اکبر کے نوجوان ہم‌نشین قمرالدین احمد صاحب نے بڑی صفائی اور لطف کے ساتھ ''بزم اکبر،، میں ان مرحوم کے ذاتی حالات لکھے اوربہت سے اشعار کی ''شان نزول،، بیان کی ہے۔ ریاض خیرآبادی کی یاد میں ان کے عزیز اور صحافی انشا پرداز رئیس احمد جعفری نے ''رند پارسا،، نہایت خوبی سے قلم بند کی۔ مگر معنوی اعتبار سے حکیم امت اقبال پر انجمن کا رسالہ سب سے بڑا چڑھا شایع ہوا جس میں ان کے تصور خودی، تصور زماں اور ان کے پیغام پر مشہور اہل علم نے اعلیٰ درجے کے مضامین لکھے، فلسفے

کے استاد ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے مولانا رومی رح اور نطشے سے اقبال کے افکار کا فاضلانہ مقابلہ کیا۔ ایک عزیز هم وطن (سیدنذیرنیازی صاحب) نے ''آخری علالت،، کے عنوان سے ذاتی خیالات و عادات کی تصویر کھینچی۔ رسالہ' آردو کا یہ خاص نمبر برابر کتابی صورت میں چھپتا رہا اور ابھی تک مقبول و مستند ہے۔

زبان کی تاریخ اور تذکروں کا تبصرہ ختم کرتے وقت گارسن دتاسی کے خطبات و مقالات (چار جلد) کا بھی ذکر کردینا چاہئے جنھیں جناب مولوی صاحب نے کئی فرانسیسی داں احباب سے ترجمہ کراکے رسالہ' آردو میں بہ دفعات اور پھر کتابی صورت میں چھپوایا۔ دتاسی، پیرس میں آردو یا ھندستانی زبان پر آج سے ایک صدی قبل درس دیتا تھا۔ پھر سالانہ جائزہ آردو کی شکل میں اس نے کوئی پچیس برس تک تحریر کا سلسلہ جاری رکھا۔ آسے آردو سے خاص دل چسپی بلکہ شیفتگی ہو گئی تھی۔ اس کے خطبات نئی آردو کی نظم و نثر کی ترقی اور نشو و نما کا مرقع دکھاتے ھیں۔ ھم عصر شعرا اور نثر نگار، ان کی تصانیف، جرائد و رسائل کے متعلق وہ حتی‌الامکان صحیح معلومات فراہم کرتا ہے اور اس کے مجموعے گذشتہ صدی کے نصف آخر کی لسانی تاریخ کا نہایت عمدہ ماخذ ھیں۔

زبان کی ساخت صرف و نحو، عروض و انشا سے متعلق سید انشا کی دل چسپ کتاب '' دریائے لطافت) تصحیح اور تحشیہ کر کے جناب مولوی صاحب نے چھپوائی پھر چند سال بعد جناب دتا تریہ صاحب کیفی کا آردو ترجمہ چھپا۔ انھی کی مشہور کتاب ''کیفیہ،، بھی انجمن کی مطبوعات میں شامل ہے، جس میں آردو ادب، صرف و نحو اور عروض پر جناب پنڈت جی نے اپنے افکار عالیہ شگفتہ پیرائے میں قلم بند کیے ھیں۔ عربی صرف و نحو پر دو مختصر مگر نہایت مفید رسالے مولانا حمیدالدین صاحب فراهی نے انجمن کو لکھ کر دئے تھے۔ لیکن آردو زبان کے اجزائے صرفی اور نحوی اصول پر سب سے مبسوط ،ساڑھے تین سو صفحے کی مجتہدانہ تالیف خود مولوی صاحب کی '' قواعد آردو ،، ہے جو تعلیمی حلقوں میں آج تک اس موضوع پر سب سے جامع اور مستند مانی جاتی ہے۔ اس میں آردو الفاظ کی ساخت، مختلف حالتیں اور تغیرات، پھر مرکبات، محاورات اور جملوں کی نحوی ترکیب پر ایسی مرتب اور مفصل معلومات فراهم کی گئی ہے کہ ایک سنجیدہ طالب علم کو فصیح زبان کے معارف سے بخوبی آگاہ

کر سکتی ہے ۔ آخر میں عروض کے ضروری اصول و قواعد بیان کیے ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب کے مطالعے سے آدمی کے دل میں آردو کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زبان دنیا کی علمی السنہ میں شمار ہونے کا حق رکھتی ہے ۔

۳- ادبی تنقید

زمانۂ حاضرہ میں تنقید، ادب کا ایک خاص شعبہ بن گئی ہے۔ یورپ میں بیسیوں کتابیں تنقید کے اصول پر لکھی گئی ہیں اور یہ اصطلاح اتنی وسعت حاصل کرچکی ہے کہ تقریظ، تعارف، تشریح، تبصرہ ایک طرف، کسی کتاب کے موضوع سے ماہرانہ واقفیت اور علمی تحقیقات اس کی شرائط میں داخل ہوگئی ہیں۔ ہندستان کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے میں یہی خیالات شائع ہوئے لیکن دیسی زبانوں کے ادبیات کی پرکھ میں آن اصول سے کام لینا، غیر معمولی ذہانت و بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان اصول پر، خصوصاً اردو ادبیات میں آن سے استفادے پر انجمن کی کوئی مستقل کتاب شائع نہیں ہوئی اگرچہ رسالۂ آردو میں وقتاً فوقتاً چند مضامین چھپے۔ البتہ ارسطو کی حکیمانہ کتاب الشعر (: ”فن شاعری،،) کا ترجمہ چھاپا گیا جس میں تنقید کے وہ نکتے بیان کیے ہیں جو آج تک فن تنقید کے اساسی اصول ہیں ۔ فاضل مترجم (عزیزاحمد صاحب) لکھتے ہیں کہ جہاں تک فن تنقید کا تعلق ہے۔ معلم اول کا یہ شاہکار دنیا بھر میں بے مثل ہے۔

انجمن کی ایک تازہ مطبوعہ ”آردو تنقید کا ارتقا،، (تالیف ڈاکٹر عبادت صاحب بریلوی) ہے، اس کے پہلے باب میں بھی اصول تنقید کی خاصی جامع بحث مل سکتی ہے۔ لیکن مذاق جدید کے مطابق، عملی تنقید میں رسالۂ آردو کو ہم اولیت کا امتیاز دے سکتے ہیں کہ ابتدا سے اس رسالے میں نئی، پرانی کتابوں پر نہایت پرُلطف و پرُمغز تنقیدیں لکھی جاتی رہیں جن سے اس کے ناظرین ہی مستفید نہیں ہوے بلکہ دوسرے رسائل اور نئے لکھنے والوں کی رہ نمائی ہوئی۔ تنقیدیں زیادہ تر خود جناب مولوی صاحب لکھتے تھے۔ ان کے دو مجموعے علاحدہ چھاپے گئے۔ ایک تراب علی خاں صاحب باز نے حیدرآباد میں مرتب اور شائع کیا۔ دوسرا انجمن کی طرف سے طبع ہوا (: ”چند تنقیدات عبدالحق،،) مگر یہ اس موضوع

پر ممدوح کی قلمی پیداوار کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ تنقید میں ایک اور درخشاں نام حافظ محمود شیرانی مرحوم کا ہے جنھوں نے رسالہ' آردو میں مولانا شبلی مرحوم کے تذکرہ '' شعرالعجم ،، پر ہنگامہ آفرین تنقید لکھی اور مولانا کے ادب فارسی میں مہارت کاملہ کا غرور باطل کیا ۔ شیرانی کی تحقیقات عالیہ نے جن مشہورعام غلطیوں کی اصلاح کی ، آن میں سب سے جھوٹی روایتیں فردوسی کے متعلق پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ فاضل مرحوم کے چار مقالے اسی زندہ' جاوید شاعر اور اس کے لا فانی کلام پر لکھے گئے ۔ انجمن کی طرف سے '' تنقید شعرالعجم ،، اور '' فردوسی پر چار مقالے ،، کتابی صورت میں چھپے ہیں ۔ شیرانی مرحوم کا ایک اور مقالہ چندر بردائی کی نام نہاد ہندی‌نظم '' پرتھی راج راسو ،، کی حقیقت کھولتا ہے ۔

انجمن کی تنقیدی مطبوعات میں مولانا حالی مرحوم کے مقالات کو بھی شامل کیا گیا ہے ۔ یہ دو جلدوں میں شائع ہوئے تھے اور دوسری جلد میں وہ سب تبصرے یا تقریظیں جمع کی گئی ہیں جو مختلف کتابوں پر آنھوں نے تحریر کی تھیں ۔ انجمن کی نئی تین کتابیں جو پاکستان آکر چھاپی گئیں ، (۱) دہلی کا دبستان شاعری (۲) نیا ادب اور (۳) آردو تنقید کا ارتقا ہیں ۔ پہلی میں دہلی کے مشاہیر اساتذہ کا فاضل مولف (ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی) نے ناقدانہ مطالعہ کیا اور '' دہلویت ،، کی ابتدا اور وہ خصوصیات بتائی لکھنؤ جو لفظی اور معنوی طور پر اہل دہلی کی شاعری کو '' لکھنویت ،، سے ممتاز کرتی ہیں ۔ یہ حصہ (باب ششم) خلاصہ' کتاب اور طلبہ کے بہت کام کی چیز ہے ۔ مختلف پہلوؤں سے اساتذہ دہلی کے کلام کے انتخابات سلیقے سے چنے گئے ہیں ۔ فاضل مقالہ نگار کو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے اس مقالے پر ڈاکٹریٹ ملی تھی ۔ خفیف ترمیم کے بعد انجمن کی طرف سے شائع کیا گیا ۔ دوسری کتاب جناب پنڈت کشن پرشاد کول صاحب کے چند تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں دور جدید کے افسانہ نویس اور '' ترقی پسند ،، ادیبوں پر گہری اورکڑی نکتہ چینی کی گئی ہے ۔ کتاب چھپنے سے کچھ پہلے بعض صاحبوں نے پنڈت جی کے سامنے صفائی پیش کی تھی مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہے کہ اس نئے ادب میں مجموعی طور پر اشترا کیت اور جنسیت کی بیجا افراط سوا کے کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔ کتاب میں مشہور

ترقی پسندوں کی مشہور تصانیف کا تجزیہ اور تبصرہ پڑھنے کے قابل ہے۔ تیسری کتاب ڈاکٹر عبادت صاحب بریلوی کی ادبی تحقیق و عرق ریزی کی یادگار ہے۔ موصوف پہلے دہلی (عربک) کالج میں شعبۂ اردو کے صدر تھے اور اب اوری انٹل کالج لاہور میں استاد ہیں۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے، اس کتاب میں اردو تنقید کی ارتقا کا ابتدا سے زمانۂ حاضرہ تک تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور اس موضوع سے متعلق مشکل سے کوئی اہم کتاب یا مضمون فاضل مولف کی تلاش سے بچا ہے۔ ہمارے تقریباً سبھی تنقید نگار مصنف اور ادیب ڈاکٹر عبادت کے زیر تنقید آگئے ہیں اور انھوں نے ہر ایک پر اپنی سنجیدہ اور معتدل رائے تحریر کردی ہے۔ طلبہ کے لیے یہ کتاب معلومات کا ایک مرتّب ذخیرہ ہے جس سے وہ یقیناً استفاد کریں گے۔

۴ - ادبیات عالیہ

ان مطبوعات انجمن میں اول تو اردو نظم و نثر کی معیاری کتابیں داخل ہیں کہ بعض کس پرسی اور گم نامی میں پڑی تھیں۔ پھر دوسری زبانوں کی شہرہ آفاق تصانیف جن میں سے اکثر اصل زبان سے اردو میں ترجمہ کرائی گئیں۔ تعداد و نوعیت میں یہ مجموعہ اب ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہوگیا ہے جسے گذشتہ تیس برس میں انجمن ترقی اردو نے اہل وطن کے لیے فراہم کیا :- (۱) جدید اردو شاعری کے باوا آدم ولی سے شروع کیجیے کہ اگر چہ اس کے حالات سبھی تذکروں میں تعظیم و ستائش کے ساتھ لکھے جاتے تھے اور تین چار (۱) بار دیوان بھی چھپ چکا تھا لیکن سوانح غلط اور مطبوعہ نسخے سب ناقص تھے۔ جناب مولوی صاحب نے صحت کے ساتھ اس کا وطن اور وفات کا سن متعین کیا اور پہلے حضرت احسن مارہروی کی تصحیح سے اور آخر میں نورالحسن صاحب ہاشمی کی ترتیب سے کلیات ولی کو چھاپ کر شائع کیا۔ رسالۂ اردو میں مختلف تحقیقی مضامین کے علاوہ مذکورۂ بالا کلیات پر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا مقالہ " دلّی کی زبان " بھی قابل مطالبہ ہے۔ (۲) قریب تر زمانے میں نواب صدر الدین خاں فائز دہلوی کا دیوان مسعود حسن صاحب رضوی (استاد لکھنؤ یونی ورسٹی) کے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ فائز کی ولادت و وفات کی صحیح تاریخیں معلوم نہ ہوسکیں مگر وہ عہد محمد شاہ کا خاندانی

---

(۱) پہلی دفعہ ولی کا دیوان گارسن دتاسی نے فرانس میں چھپوایا تھا (۱۸۳۳ء) پھر بمبئی کے مطبع حیدری میں چھپا (۱۲۹۰ھ م ۱۸۷۲ء) اس کے پانچ سال بعد نول کشور نے چھاپا۔

امیر تھا ۔ لائق مرتب اسے " شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر " قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ دیوان مختصر (کوئی تین جز کا) ہے لیکن اس پر فارسی میں ایک طولانی " خطبہ " بطور مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں شاعری کے جواز اورمحاسن و اسقام پر بحث کی گئی ہے۔ رضوی صاحب نے بڑی محنت و تلاش سے فائز کی دوسری تصانیف اور جو حالات مل سکے، جمع کیے اور اپنے حواشی اور قدیم الفاظ کی فرہنگ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ کردیا ہے۔ (۳) میر و سودا کے معاصرین میں تاباں (متوفی ۱۱۶۵ھ) کا دیوان جناب مولوی صاحب نے چند قلمی نسخوں سے مقابلہ اور صحت کرکے چھپوایا اور (۴) انعام‌اللہ خاں یقین کی چار جُز غزلیات پر لائق مرتب (مرزا فرحت‌اللہ بیگ صاحب دہلوی) نے کوئی سو صفحے کا مقدمہ لکھا یقین جوانی میں جان سے گئے (۱۱۶۹ھ) پھر بھی زبان کی صفائی میں بعض اہل نظر انھیں میر سے فائق سمجھتے ہیں۔ مشہور ہوگیا تھا کہ آن کے آستاد مرزا جان‌جان مظہر‌رح عزیز شاگرد کے لیے خود غزلیں لکھ دیتے ہیں۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں یقین کی جس طرح مذمت لکھی ہے وہ خود آن سے لوگوں کی بد ظنی اور بدگوئی کا باعث ہوئی۔ (۵) ان کے ہم عصر اشرف علی فغان کا کم یاب دیوان سید صباح‌الدین عبدالرحمن صاحب (رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ) کی‌سعی و تلاش سے مرتب ہوا۔ فغان، احمد شاہ خلف محمد شاہ کے کوکہ تھے اور خاص قلعہ معلیٰ کی زبان لکھتے ہیں۔ ان کی ظرافت و زندہ دلی مشہور تھی۔ مرہٹہ گردی نے دہلی چھڑوائی۔ عظیم آباد چلے آئے اور وہیں ۱۱۸۶ھ میں انتقال کیا۔ انجمن نے یہ دیوان، فاضل مرتب کے مقدمے اور حواشی کے ساتھ، پاکستان آکر شائع کیا ہے۔ (۶) سرآمد شعرا میر تقی میر کے باب میں انجمن کا سب سے مفید کام تو " ذکر میر " کی اشاعت ہے جس کا اوپر حوالہ آیا لیکن جناب مولوی صاحب نے آن کے ضخیم دواوین کا انتخاب کیا، بلکہ بقول شخصے عطر نکالا اور خصوصیات کلام پر مبسوط مقدمہ لکھ کر شائع کیا۔ یہ انتخاب ملک میں کافی مقبول ہوا اور اس کی چھٹی بار پاکستان آکر طباعت ہوئی ہے۔ (۷ و ۸) اسی دور کے خواجہ سید محمد میر اثر، برادر خواجہ میر درد کی مثنوی " خواب و خیال " اور مختصر دیوان بھی جناب مولوی صاحب کے دست جستجو نے گم نامی کے اندھیرے سے نکال کر اہل

شوق کے ہاتھوں تک پہنچایا ۔ تذکروں میں صرف نام اور چند انتخابی اشعار کے سوا، لوگ اُن کے کلام سے بہت کم واقف تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بھائی کی بزرگی اور میر و سودا کی شہرت کے غُل غُلے میں اُن کی شاعری پر پوری توجہ نہیں کی گئی ور نہ حق یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور لطافت میں وہ ان تینوں سے فوقیت رکھتے ہیں ۔ جناب مولوی صاحب دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ " ان کی زبان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ اردو کے کسی شاعر کو ایسی سلیس زبان نصیب نہیں ہوئی "۔ مولانا حالی مرحوم نے اپنے مقدمہ شاعری میں اشارہ کیا تھا کہ شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری پر اثر کا اثر معلوم ہوتا ہے ۔ " خواب و خیال " کے چھپنے سے یہ قیاس عین حقیقت نظر آنے لگتا ہے ۔ علی' ہذا مرزا غالب کی آخری زمانے کی بعض غزلیں اثر کے اتباع میں لکھی گئی ہیں ۔ دوم نظیر اکبر آبادی کے دو دیوان غزلیات محض اتفاق سے مرزا فرحت‌اللہ بیگ مرحوم کو حیدرآباد میں مل گئے۔ یہ پروفیسر شہباز کی عقابی نگاہ سے بھی چھپے رہے تھے جنھوں نے " حیات بے نظیر " لکھ کر سب سے پہلے " اس بازاری شاعر " کو مسند فضیلت پر بٹھایا تھا ۔ دیوان میں ایک قلمی تصویر شامل تھی اور بقول مرتب دونوں بہت عمدہ کاغذ پر غالباً کسی قدرداں ہندو راجہ کے لیے کتابت کئے گئے تھے ۔ مرزا صاحب کے مقدمے سمیت ۔ انجمن نے دونوں ایک جلد میں شائع کردئے ۔ (۱۰) متوسط دور کے جوشش عظیم آبادی کو وہیں کے قاضی عبدالودود صاحب نے ہم سے روشناس کیا ۔ وہ ایک ہندو رئیس جسونت رائے کے فرزند تھے اور لڑکپن میں اسلام لے آئے ۔ محمد روشن نام رکھ لیا تھا ۔ ہم عصر تذکروں میں مختصر حالات ملتے ہیں ۔ قاضی عبدالودود صاحب نے پورا دیوان بڑی محنت سے صحیح کیا اور ان کی سوانح اور کلام پر سیر حاصل مقدمہ لکھا جس میں پرانی (دہلی و لکھنؤ کی) زبان کی مفید بحثیں آ گئی ہیں ۔ (۱۱) انتخاب ذوق و ظفر ۔ مختصر سمجھ کر ایک جگہ چھاپ دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ یہ دو جدا گانہ انتخاب ہیں ۔ پہلا جناب پنڈت دتا تریہ صاحب کیفی نے پیش لفظ لکھ کر پیش کیا ۔ (کل صفحات) ۔ دوسرا شان الحق صاحب حقی سلمہم کی محنت و ذوق کی پیداوار ہے جس میں ظفر کے چاروں دیوان کھنگال ڈالے ہیں (۸۰ صفحات) ۔ اپنے

مبسوط مقدمے میں فاضل مرتب نے اس نظریئے کی بدلائل تکذیب کی ہے کہ استاد ذوق بہادر شاہ کو غزلیں لکھ دیتے تھے - یہ جھوٹی روایت محمد حسین آزاد نے مشہور کی تھی جو دروغ باف سے بڑھ کر بدمذاقی کی دلیل ہے - نوجوان حقی کا انتخاب اشعار عام طور سے قابل پسند قرار پایا - (۱۲) متاخرین میں وحید الہ آبادی کے حالات اور دیوان کا انتخاب علی حسین صاحب زیبا نے اور (۱۳) انتخاب داغ خود جناب مولوی صاحب نے مرتب کیا ہے - گویا اس نمکیں کلام کا نمک چن لیا ہے - (۱۴) ایک پارسی شاعر بہرام جی کا دیوان چھاپا گیا جو حیدرآباد میں ملازم رہے اور بہت صاف زبان میں غزلیں لکھتے تھے -

غیر زبان کی نظم کے دو ترجمے بھی یہاں قابل ذکر ہیں - یہ دونوں انتخاب سنہ ۳۹ع میں چھپے تھے - ایک جاپانی بچوں کے گیت ،، (دو حصے جنہیں پروفیسر نورالحسن صاحب برلاس نے مختلف کتابوں اور دوستوں کی مدد سے چنا اور سیدھی سادی آردو بحروں میں ترجمہ کیا - پروفیسر صاحب دھلی کے ایک معزز مغل خاندان کے فرد ہیں اور ٹوکیو کے السنہ' خارجہ کی درس گاہ میں کئی سال آردو کی تعلیم دینے پر مامور رہے - ان کے ترجمے کا دیباچہ پڑھنے کے لائق ہے - شروع ہی میں لکھتے ہیں کہ '' اگر کسی ملک کو بچوں کی بہشت کہا جاسکتا ہے تو وہ جاپان ہے ،، اہل جاپان بچّوں سے محبت کرنے ، ان کی راحت و آرام نیز کھیل کود کی آزادی دینے میں سب قوموں سے بڑھے ہوئے ہیں - اس فطری طریق تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں میں ابتدا سے تہذیب و خودداری کا ازخود احساس پرورش پاتا ہے - وہ ہر جگہ کھیلتے آتے ہیں مگر کبھی آپس میں بدزبانی یا مارپیٹ نہیں کرتے - شہر بھر میں کوئی بچہ روتا ہوا دکھائی نہیں دیتا - میوہ دار درختوں کی شہر میں کثرت ہے مگر کوئی بچہ پھل چرانے یا پتھر مارنے کی کوشش نہیں کرتا ! گیتوں میں انہیں خاص طور پر جفاکشی ، سپہ گری ، بہادری اور اولوالزمی کی تعلیم دی گئی ہے - (۱۵) دوسرا ترجمہ بنگال کے انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا انتخاب ہے جس میں اُن کی شاعری کے تین دور بتائے گئے ہیں - پہلا وہ جب ان پر اپنے اسلامی تخیلات غالب تھے اور انھوں نے ابتدائی نظموں میں فارسی آردو الفاظ و بحور سے بھی کام لیا - دوسرا دور '' ود روھی ،، (یعنی باغی) کی نظم سے شروع ہوا جس میں شاعر کے سینے کا

طوفانی جوشِ الفاظمیں اُبل آیا ہے ۔ تیسرے دور کو جس کی امتیازی نظم " نعرهٔ انقلاب،، ہے ، قاضی صاحب کی اشتراکیت پرستی کا زمانہ قرار دے سکتے ہیں ۔ فاضل مترجم (ڈاکٹر) اختر حسین صاحب راے پوری نے بہت خوبی سے ترجمہ کیا اور نثر اُردو میں بنگلا نظم کا آتشیں جوش پیدا کردیا ہے ۔ مقدمهٔ کتاب میں جسے مترجم نے " پیام شباب ،، موسوم کیا ، شاعر کے حالات اور خصوصیات کلام بیان کر دئے ہیں نثری ترجمہ اور انتخاب ہونے کے باوجود غالباً یہ کتاب قاضی نذر الاسلام کی شاعری کا تعارف ہے جو ابھی تک کسی زبان میں کیا گیا ہے۔ (۱۸) اُردو شعرائے عصر میں کیفی صاحب کی مثنوی ۔ (" جگ بیتی ،،) اور " سہ نظم ہاشمی ،، کے سوا مرحوم فانی بدایونی کا دوسرا دیوان "عرفانیات فانی،، چھاپا گیا (۱۹) پھر شعرائے عصر کا " انتخاب جدید ،، شائع ہوا جس میں مولانا حالی مرحوم کے بعد (۱۹۱۴ تا ۱۹۴۲ع) کے مشہور شعرا کی چیدہ نظمیں جمع کی ہیں ۔ ان میں اقبال حسرت و اصغر سے لے کر روش ، مجاز ، فیض ، فراق ، راشد ، جذبی تک سبھی شاعر آگئے ہیں ، انتخاب کلام کے ذمہ دار عزیز احمد صاحب استاد جامعہ عثمانیہ اور آل احمد صاحب سرور ، استاد مسلم یونی ورسٹی ، علی گڑھ جیسے ممتاز نئے ادیب ہیں ۔ دونوں صاحبوں کے دیباچے شروع میں کتاب کی زینت ہیں ۔ مجموعی طور پر یہ انتخاب نظم اُردو کے حالیہ ارتقا کا بہت اچھا مرقع پیش کرتا ہے ۔

نثر کی مطبوعہ کتابوں میں ایک تو وہ ہیں جو اُردو ہی میں لکھی گئی تھیں دوسرے وہ جو غیر زبانوں سے ترجمہ کرائی گئیں ۔ قسم اول میں زمانی تقدم (۲۰) " رانی کیتکی ،، کو حاصل ہے جسے انشاء اللہ خاں نے شرط لگا کر لکھا تھا کہ اس کہانی میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے گا اور پھر بھی زبان عام روز مرّہ کے خلاف نہ ہوگی ۔ یہ ایک مختصر خیالی افسانہ ہے اور مصنف نے انشا پردازی کی صنائع بدائع کے طور پر تحریر کیا تھا ۔ لیکن ڈیڑھ سو برس سادہ اُردو کا تاریخی نمونہ دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ رسم پرستی کی وجہ سے لوگ فارسی زبان کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے ورنہ ان کی اپنی زبان میں اظہار خیال کی بخوبی صلاحیت آگئی تھی ۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں نے ادھر توجہ کی تو فوراً اُردو کتابیں اور اخبار لکھے جانے لگے ۔ انھی میں نثر کی نفیس کتاب (۲۱)

" باغ و بہار "، تھی جس کے چار درویش کا قصہ گھر گھر سنایا جاتا تھا - جناب مولوی صاحب میر اَمن کی زبان و بیان کے شروع سے دل دادہ ہیں - خاص طور پر ایک نسخہ تیار کیا اور اس پر ناقدانہ مقدمہ لکھا - مولانا حالی کے مقالات (دو جلد) کا اوپر ذکر آچکا ہے - ان کی جاودانی یادگار (۲۲) " حیات جاوید "، کمیاب ہوگئی تھی - اسے بھی انجمن کی طرف سے چھاپا گیا - (۲۳) فصیح الملک داغ کی نثر صرف ان کے خطوط میں ملتی ہے - جناب احسن مارہروی نے استاد کے مکاتیب " انشائے داغ " کے نام سے جمع کئے، انجمن سے چھپوائے ہیں - (۲۴) ادیب فاضل عبدالرحمن بجنوری مرحوم انجمن کے واسطے دیوان غالب کا ایک پر تکلف نسخہ تیار کر رہے تھے، اسی کے لیے اپنا مشہور مقدمہ " محاسن کلام غالب "، لکھا تھا - یہ " نسخہ حمیدیہ "، میں پہلے بھوپال سے شایع ہوا مگر پھر انجمن نے جداگانہ کتاب کی صورت میں چھاپ دیا ہے - (۲۵) ایک ادبی تحفہ اشرف صبوحی صاحب کی کتاب " دلّی کی چند عجیب ہستیاں "، ہیں - (۲۶) مگر چند صفحوں کے آیینے میں انسانی سیرتوں کی تصویریں دیکھنی ہوں تو اس کا ہماری زبان میں غالباً سب سے اچھا مجموعہ جناب مولوی صاحب کی کتاب " چند ہم عصر "، ہے - اسے بڑی قبولیت حاصل ہوئی - پاکستان آکر چند اضافے کئے گئے اور تیسری بار طبع کیا گیا ہے -

(۲۷ تا ۳۰) عربی ادبیات عالیہ سے تین ترجمے جو انجمن نے چھپوائے، لائق ذکر ہیں - ان میں سے " اخوان الصفا "، کا اُردو ترجمہ فورٹ ولیم کالج میں مولوی اکرام علی صاحب نے ۱۸۱۰ء میں کردیا تھا انجمن کی طرف سے دوبارہ صحت کرا کے طبع کیا گیا - کتاب الاغانی کی روایات (رنات المثالث . . .) کا دو جلدوں میں رئیس احمد صاحب جعفری نے ترجمہ کیا - مگر سب سے ضخیم اور شہرہ آفاق کتاب " الف لیلہ "، ہے جس کے انگریزی ترجموں سے جو خود مکمل نہ تھے، دو تین ناقص اُردو ترجمے ہوئے تھے - انجمن ترقی اُردو کے لیے ڈاکٹر منصور احمد صاحب پروفیسر مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ نے اصل عربی سے پوری کتاب کا ترجمہ کیا اور وہ سات جلدوں میں چھاپا گیا ہے - انہی ڈاکٹر صاحب کا ایک اور معرکہ الآرا ترجمہ (۳۱) " بقول زرتشت "، ہے جو اصل جرمن سے اُردو میں منتقل کیا گیا - نطشے کی اس کتاب، سے پچھلی صدی میں یورپ کے اخلاق و عقائد (رسمی) میں زلزلہ سا آگیا

تھا - '' فوق الانسان ،، اور ایک برتر نسل کے تصورات اسی کے فلسفے نے پھیلائے مادی قوت کو اصل '' حق ،، ثابت کیا - گذشتہ خونی محاربات کا ایک محرک اس کی تعلیم سمجھی جاتی ہے - خالص ادبی اعتبار سے ترجمہ نہایت اعلیٰ درجے کا ہوا جسے ہم اردو زبان کی قوتِ اظہار کی مثال میں پیش کرسکتے ہیں - دو قابل مطالعہ کتابیں فارسی ادب سے ماخوذ ہیں : (۳۲) حکایات رومی (دو جلد) جس میں مثنوی مولانا روم رح کی صرف وہ دل کش تمثیلی حکایات چن کر ترجمہ کی گئی ہیں جو اخلاق حسنہ کا سبق دیتی ہیں - اسی طرح (۳۳) عوفی کی '' جوامع الحکایات ،، کا خالص تاریخی انتخاب پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کی مدد سے اردو میں ترجمہ کرایا گیا (دو جلد) دونوں ترجمے پاکیزہ زبان میں چھاپے گئے ہیں - (۳۴) سنسکرت سے کالی داس کے مشہور و معروف ناٹک '' شکنتلا ،، کا ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بہت خوب ترجمہ کیا - انہی کا ایک اور ترجمہ روسی ادیب '' گورکی کی آپ بیتی ،، تین جلدوں میں چھپ کر مقبول ہوا - یہ انگریزی کی وساطت سے اردو میں لایا گیا اور انسانی زندگی کے مصائب و مشاہدات کی عجیب و غریب داستان ہے - (۳۶) ڈاکٹر صاحب کا اپنی زبان کو ایک اور قیمتی خراج '' گڈ ارتھ ،، کا ترجمہ (''پیاری زمین ،،) ہے جس پر مصنفہ کو نوبل پرائز ملا تھا (۳۸) جرمانیہ کے فلسفی شاعر گوئٹے کے شہکار '' فاوسٹ ،، کے اصل جرمن سے ترجمے کے لیے ہم ڈاکٹر عابد حسین صاحب (استاد جامعہ ملیہ ، دھلی) کے منت کش ہیں - کتاب پر ان کے بسیط مقدمے نے اس کی افادیت بڑھادی ہے (۳۹) اطالیہ کے نامی شاعر دانتے کی ''دوائن کومیدی،، کو اصل زبان سے ایک اور نوجوان لائق ادیب عزیز احمد صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ) اردو میں لائے اور اپنی مفصل تمہید میں کتاب اور مصنف کے حالات بیان کئے - (۴۰) جدید یورپ کا مشہور ڈراما '' معمار اعظم ،، از ابسن) کا بھی عزیز احمد صاحب نے انگریزی سے ترجمہ کیا مگر اس کی خاطر ناروی زبان پڑھی اور مصنف کے وطن کی سیاحت کرنے گئے - (۴۲) اسی دور کے ایک جرمن افسانہ نویس جورج مارسن آئرس کے ایک تاریخی ناول کا ڈاکٹر (کرنل) لطافت حسین خاں مرحوم نے ''دختر فرعون،، کے نام سے دو جلدوں میں ترجمہ کیا اور خود بھی تاریخی حواشی تحریر کئے - کتاب میں مصر ، یونان و ایران قدیم کی تہذیب و معاشرت کا حیرت انگیز مرقع دکھایا گیا ہے جو مصنف کی تاریخ و اثریات میں غیر معمولی بصیرت کا ثبوت ہے -

....

اسی فصل کی ذیل میں ہم وہ مطبوعات شامل کئے دیتے ہیں جو دوسری زبانوں اور اُن کے ادبیات پر انجمن نے شائع کیں ، یہ موضوع رسالۂ اردو کے احاطے میں داخل تھا - کئی مضامین اسی میں بہ اقساط چھپے اور بعد میں کتابی صورت میں نکلے - (۴۳) ان میں پروفیسر مجیب صاحب (استاد جامعہ ملیہ دہلی) کا روسی ادب پر تبصرہ سب سے طولانی تھا اور بعد میں دو جلدوں میں چھاپا گیا - (۴۴) ترکی ادبیات پر بڈاپیسٹ یونی ورسٹی کے استاد جولیس جرمانس کے تین لکچروں کا ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوا - (۴۵) جناب مولوی صاحب کا مقالہ " مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر "، اسی ذیل میں قابل ذکر ہے - (۴۶) اسلامی ہند میں ہندوؤں نے فارسی ادب کی جو خدمات انجام دیں ، انہیں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب (استاد اوری انٹل کالج ، لاہور) نے بڑی محنت اور سلیقے سے یکجا مرتب کیا اور حکومت پنجاب سے بھی انعام لیا تھا - بعد میں انجمن کی طرف سے چھاپا گیا (: " ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ") - (۴۷) خود ایرانی ادبیات پر انجمن نے پروفیسر براؤن کی مشہور تالیف اردو میں ترجمہ کرائی - اس کی آخری جلد " ادبیات ایران در عہد جدید "، کو وہاج الدین صاحب (استاد اورنگ آباد کالج) نے فصیح اردو کا لباس پہنایا اور " ادبیات ایران بہ عہد مغولاں "، محمد داؤد صاحب رہبر نے ترجمہ کی جو اپنے والد ماجد پروفیسر اقبال کے فرزند رشید ہیں - مرحوم اقبال ، براؤن کے شاگرد اور اس معرکتہ الآرا تاریخ ادب کی تالیف میں کچھ دن تک استاد کے مددگار تھے - لہذا لائق مترجم کا دعویٰ کہ براؤن اُن کے دادا پیر ہوتے ہیں، کچھ غلط نہیں ہے - یہ جلد علمی تحقیق اور تاریخی معلومات کے لحاظ سے جس قدر ممتاز ہے ، اسی قدر ترجمہ کرنے میں اور اصل اشعار و اعلام کی صحت میں دشواری تھی- نوجوان مترجم اپنے مرحوم اور فاضل زمانہ والد کی مدد سے ان مشکلات پر غالب آئے- کتاب انجمن نے پاکستان آکر شائع کی ہے-

۵ - تاریخ و عمرانیات

انجمن ترقی اردو نے تاریخ و سوانح نیز متعلقہ علوم پر تقریباً پچاس نئی کتابیں اردو میں چھپوائیں مگر ذیل میں ہم صرف ممتاز چیدہ مطبوعات پر مختصر تبصرہ لکھنا کافی سمجھتے ہیں - اس مد کی چار کتابیں انجمن کے پہلے دور علی گڑھ میں شائع ہوئی

تھیں (۱) رہ نمایان ہند - (۲) امرائے ہنود - (۳) نپولین اعظم - (۴) تاریخ تمدن، حصۂ اول) - ان کا تذکرہ کتاب کے پہلے باب، صفحہ ۱۹ پر آچکا ہے - آخرالذکر کتاب کے ترجمے کی تکمیل جناب مولوی صاحب کے زمانے میں ہوئی - اسی موضوع پر پروفیسر ہالینڈ کی '' مختصر تاریخ تمدن ،، کا ترجمہ چھاپا گیا - مگر ترجموں میں خاص طور پر قابل ذکر انجمن کی مطبوعات یہ ہیں:

۱- کتاب الہند ، علامہ بیرونی کی بے مثل کتاب جو ہندوؤں کے مذہب و معاشرت قانون ، علوم اور فلسفے پر نہایت مستند ماخذ تسلیم کی جاتی ہے - عربی سے دو جلدوں میں سید علی اصغر صاحب نے ترجمہ کی - اس کی تصحیح بڑی احتیاط سے کرائی گئی - محض جناب مولوی صاحب کی دُھن اور مسلسل کوشش سے یہ کام سات سال میں انجام کو پہنچا کیوں کہ بعض مشکل عبارتیں اور مختلف علوم (ہیئت، ریاضی ، فلسفہ) کی اصطلاحیں، مترجم کے قابو میں نہ آسکتی تھیں - ماہرین کی مدد اور یورپی تراجم سے مقابلہ کرنا ضروری تھا اور یہ سب انتظام خود جناب مولوی صاحب کے ذمے تھے- ایک اور قدیم عربی کی کتاب ''اخبار مجموعہ،،(تاریخ اندلس) کا ترجمہ چھاپا گیا - ۳- ابن القفطی کی مستند کتاب '' تاریخ الحکما،، کا ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق (استاد کیمبل پور کالج) نے ترجمہ کیا اور فاضلانہ مقدمے اور حواشی سے اسے مزین کیا - کتاب میں ابتدائے تاریخ سے سنہ ۶۴۴ھ تک نامی اطبا کے حالات جمع کئے ہیں -

۴ - سفر نامہ ناصر خسرو کا ترجمہ مولانا عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ نے کیا ۵ - افلاطون کی مشہور کتاب '' ری پبلک ،، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (صدر جامعہ ملیہ) نے '' ریاست ،، کے نام سے ترجمہ کی - ۶ ڈین مارک کے پروفیسر کرسٹن سین نے قدیم ایران کے ساسانی خاندان کی تاریخ تیس برس کی تحقیق و تلاش سے تالیف کی کہ اس سے بہتر اور جامع کتاب اس موضوع پر کسی زبان میں نہیں لکھی گئی تھی پروفیسر محمد اقبال مرحوم نے اصل فرانسیسی سے شگفتہ اردو میں منتقل کیا کیا اور انجمن سے چھپوایا - ۷ - فرانسیسی زبان سے کلدانی ، اشوری فنیقی اقوام پر ایک اور تاریخ '' ملل قدیمہ ، ترجمہ کی گئی - پلوتارک یونانی کی تاریخی سوانح اسہات کتب میں شمار کی جاتی ہیں اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اس دل

چسپ ، اثر انگیز کتاب کا بہت کچھ اثر تسلیم کیا گیا ہے ۔ اس کا آردو ترجمہ چار جلدوں میں چھپا اور ابھی ایک حصہ باقی ہے ۔ ۹ ۔ علم الاقوام پر آردو میں پہلی مستند اور جامع کتاب ایک آسٹروی فاضل (بیرن عمر ایہرن فیلس) نے انگریزی میں انجمن کے واسطے تالیف کی تھی ، اس کا ترجمہ ڈاکٹر عابدحسین صاحب نے دو جلدوں میں کیا ۔ ۱۰ ۔ پروفیسر لیکی نے یورپ کے اخلاق و تمدن کی فلسفیانہ تاریخ لکھی ہے جو انگریزی زبان کی منتخب کتاب مانی جاتی ہے ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے نہایت خوبی سے اس کا دو جلدوں میں انجمن کے لیے ترجمہ کیا ۔ ۱۱ ۔قریبی زمانے میں خالدہ خانم ادیب کا سیاحت نامہ " اندرون ہند " آردو لباس میں پیش کیا گیا ۔

تالیفات میں (۱۲) انجمن کی مطبوعہ " تاریخ مگدھ " ملک بہار کی سرگزشت ہے ۔ لائق مولف (مولوی فصیح الدین صاحب) نے ، ماقبل تاریخ زمانے سے اپنے زمانے تک کے واقعات بڑی محنت اور احتیاط سے جمع کر دئے ہیں ۔ ۱۳، ۱۴ ۔ اسی ملک کے نامی فرماں روا " اشوک اعظم " اور بدھ مت " پر ڈاکٹر حفیظ سید صاحب (استاد الہ آباد ، یونی ورسٹی) نے دو مبسوط مقالے آردو میں لکھے ہیں ۔ ۱۵ ۔ " یونان قدیم " کی ایک مختصر تاریخ اپنے طرز نگارش اور ایشیائی نقطہ نظر کی حمایت کے باعث پسندیدہ قرار پائی ۔ ۱۶ ۔ حسن برنی صاحب نے البیرونی کی سوانح اور تصانیف پر خاصی مفصل کتاب تالیف کی ۔ ۱۷ ۔ "تاریخ دستور ہند " میں ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ) نے ابتدا سے ۱۹۳۵ع تک انگریزوں کے نافذ کردہ دساتیر کی کیفیت تحریر کی ہے جسے اکثر مدارس میں داخل نصاب کیا گیا ۔ ۱۸ ۔ جاپان کے حالات ، تمدن و ادب پر بدرالدین صاحب فضلی نے جو وہاں کی ٹوکیو یونی ورسٹی میں استاد رہے ، معلومات افزا کتاب لکھی ۔ تاریخ کی دو ممتاز اور ضخیم کتابیں پاکستان آکر شائع کی گئیں :۔ ۹ ۔ " چین و عرب کے تعلقات " جسے چین کے ایک مسلمان فاضل بدرالدین حئی صاحب نے آردو زبان میں تالیف کیا ۔ آنھوں نے جامعہ ازہر سے عربی میں فضیلت کی سند لی ، پھر جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی اور زبان آردو کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ یہ محققانہ تاریخ جو کسی زبان میں بھی اس کی زینت مانی جاتی ، آردو ہی میں لکھنی پسند کی انجمن کی طرف سے مسودے کی نظر ثانی کرائی گئی اور تذکیر تانیث جیسی فروعی غلطیاں بنادی گئیں ورنہ تمام

عبارت فاضل مولف کی اپنی لکھی ہوئی ہے ۔ کتاب کے لکھنے میں چینی ، عربی فارسی اور یورپی زبانوں کے مستند ماخذوں سے مدد لی گئی ہے ۔ قبل اسلام عرب اور چین کے مواصلات اور تجارتی تعلقات کا حال بیان کرنے کے بعد پھر الگ الگ ابواب میں مسلم عرب اور چین میں سیاسی ، تجارتی دینی ، تہذیبی روابط کی تاریخی کیفیت لکھی اور ان عمرانی اور ملی اثرات پر نہایت پرمغز بحث کی ہے ۔ کتاب کے مطالعے سے بہت سی عام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور خود اسلامی تاریخ کا ایسا پہلو نظر کے سامنے آجاتا ہے جس کی طرف پہلے بہت کم توجہ کی گئی تھی بلکہ اس بارے میں اردو خوانوں کی معلومات ہی کچھ نہ تھیں ۔ ہند و پاکستان کے مسلمانوں کو فاضل مولف کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ایسا یادگار علمی تحفہ خود انہی کی زبان میں پیش کیا ؟ ۔ راقم الحروف نے انجمن کے لئے ''تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت،، دو جلدوں میں تیار کی ۔ پہلی جلد (عہد کشور کشائی) میں ، ہندستان کی ماقبل اسلام تاریخ کا خلاصہ لکھ کر محمد ابن قاسم سے اورنگ زیب عالم گیر تک کے حالات لکھے ہیں اور مسلمانوں کی ہند میں فتوحات اور آبادکاری کے ساتھ ان کے تمدن و معاشرت اور اقتصادی اور تہذیبی احوال کو جہاں تک مختلف ذرائع سے مل سکے ، فراہم کرنے کی کوشش کی ہے ۔ پہلی جلد ۱۹۵۱ میں شائع ہوئی اور اکثر تبصرہ نگار حضرات نے پسند کی ۔ جناب مولوی صاحب نے اس کی ترتیب و تحقیق نیز طرز بیان کی بطور خاص تحسین فرمائی ۔ دوسری جلد کی اشاعت میں مطبع کی عجیب بدمعاملگی سے تاخیر ہوتی رہی ۔ اس میں عالم گیر کے بعد سے بنائے پاکستان تک کے واقعات ہیں ۔ ہندی مسلمانوں کی مذہبی ، تعلیمی اور سیاسی تحریکات پر تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے ۔

٦ ۔ جدید سائنس و فلسفہ

نئے تجربی علوم اور فلسفے پر انجمن کی مطبوعات تعداد میں زیادہ نہیں مگر اکثر اونچے معیار کی ہیں ۔ جامعہ عثمانیہ میں ان مضامین پر بہت سی درسی کتابیں ترجمہ کرائی گئیں اس لیے بھی کفایت اسی میں نظر آئی کہ انجمن عام دل چسپی کی علمی کتابوں پر اکتفا کرے ۔ اول اول نئے طرز کی کتاب '' فلسفہ جذبات ،، چھپی تھی جس پر خاصا ہنگامہ برپا ہوا ۔ لیکن مطالب سے قطع نظر ؛ ادبی اعتبار سے یہ شگفتہ علمی

نثر کا نمونہ ہے اور فاضل مولف (مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی) نے مغربی نظریات اور فلسفے کی اصطلاحات کو اس خوبی سے اپنایا ہے کہ مطلق اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ تاریخ فلسفہ پر ایک اور ادبی رنگ کی تالیف، جو کافی مدت کے بعد انجمن نے شائع کی، " داستان دانش "، ہے۔ یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ) کی علمی انشا پردازی کی یادگار ہے جس میں فلسفے کی ابتدا، ارتقا، مشہور نظریات و مکاتب کا حال تاریخی ترتیب کے ساتھ سلیس زبان میں پیش کیا اور ان پر ناقدانہ بحث کی گئی ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر ایسی جامع کتاب غالباً کوئی نہیں لکھی گئی۔ یہ مولف کی وسعت نظر اور سالہا سال کی محنت کا ثمر ہے۔ " مکالمات افلاطون "، ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے ترجمہ کئے ہیں۔ ان میں سے بعض پہلے بھی اردو رسائل یا کتابوں میں چھپے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے بڑی صحت اور علمی بصیرت سے یہ مکمل اور بیش بہا ترجمہ اردو ادب کو دیا۔ اسی طرح یورپ کے نامی فلسفی کانٹ کی سب سے اعلیٰ تصنیف کا ترجمہ " تنقید عقل محض "، کے نام سے کیا۔ مجذوب فلسفی نطشے کی ایک کتاب " بقول زردشت "، کے ترجمے کا اوپر ذکر آچکا ہے " ہماری نفسیات "، کے نام سے ایک درسی کتاب کا ترجمہ بھی انجمن نے شائع کیا۔

فلسفے کی " داستان دانش "، کی طرح، انگریزی کی " میتھے میٹکس فورملینز "، کا اردو ترجمہ " داستان ریاضی "، چھاپا گیا جس میں حساب کے خشک مضامین اور اصول نہایت سادہ اور دل چسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ اس ترجمے کی نظر ثانی ڈاکٹر رضی الدین صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ) نے کی تھی۔ خود ڈاکٹر صاحب موصوف کا عطیہ " اضافیت "، ہے جس میں یہ جدید اور دقیق مسئلہ عام فہم زبان میں اس طرح لکھا ہے کہ معمولی ریاضی داں اور تعلیم یافتہ شخص اس کے ضروری مطالب اور نتائج کو سمجھ سکتا ہے۔ زندگی کی ابتدا اور تدریجی نشو و نما کا حال ایک باتصویر مقالہ " حیات کیا ہے ؟ "، سناتا ہے۔ " حیوانیات "، اور حیوانی دنیا کے عجائبات "، اسی شعبے کی دو کتابیں ہیں۔ نباتات پر دو دل چسپ کتابیں (: علم نباتات اور پودے . . .) چھپی ہیں۔ "طبقات الارض"، اوربرقیات پر (" بجلی کے کرشمے") اور معدنی اور نباتی دباغت پر دو ماہرانہ کتابیں ہماری مطبوعات میں داخل ہیں۔ " بچے کی نگہداشت "، اور " ہماری غذا "، انجمن نے ماہرین فن سے بطور خاص

سادہ زبان میں لکھوائی ہیں ۔ زندگی کے متعلق جدید تحقیقات کا خلاصہ پروفیسر نصیر احمد صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ) کی کتاب "مکالمات سائنس" میں قابل مطالعہ ہے ۔ انہی کی ایک ضخیم تالیف " طبیعات کی داستان " حال میں کراچی سے شائع کی گئی ہے ۔ سائنس کی ایک اور جامع کتاب " جدید معلومات سائنس " طباعت اور تصاویر کے خاص اہتمام سے انجمن نے چھپوائی ہے ۔ یہ آفتاب حسن صاحب (صدر اردو کالج کراچی) کے علمی شوق و محنت کا نتیجہ ہے جس میں کائنات ، زمین ، حیات اور موالید ثلاثہ پر تازہ ترین تحقیقات کو سلیس اردو میں منتقل کیا گیا ہے ۔ موصوف رسالہ سائنس کے مدت سے مدیر رہے اور مغربی علوم کی بذریعہ اردو تعلیم دینے اور تحریر میں لانے کی خاص مشق رکھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انجمن کے تازہ رسالے : " اردو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم سائنس " کا دوبارہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا جسے پاکستان کے بعض معترضین کے جواب میں جناب مولوی صاحب نے شائع کیا ہے ۔ اس میں مولوی صاحب کے نو سوال اور سائنس کے اساتذہ اور مستند اہل علم کی طرف سے ان سوالات کے جواب درج ہیں ۔ ان صاحبوں نے اپنے تجربات اور قطعی دلائل سے واضح کیا ہے کہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم ہمارے ملک میں اردو کے ذریعے ہونی چاہیے ۔

۷ ۔ معاشیات ، تعلیم وغیرہ

یورپ میں قومی دولت اور آمد و خرچ کے مسائل پر ایک مدت سے غور و بحث ہو رہی ہے ۔ " اقتصادیات ملکی " (= پولی ٹکل اکونومی) باقاعدہ مستقل علم بن گیا ہے جس کے واسطے اردو میں علم المعیشت یا معاشیات کو زیادہ موزوں اصطلاح سمجھنے لگے ہیں ۔ انجمن کے لیے مولانا الیاس برنی صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ) نے سب سے پہلے اس نام سے ایک مفصل کتاب تحریر کی ۔ معاشیات کے اصول اور مبادی بتائے اور یورپ ، خصوصاً برطانیہ کے تجربات و تحقیقات سے جو نتیجے اخذ ہوتے ہیں انہیں پیش کیا ۔ ایک اور کتاب کچھ مدت بعد " معاشیات کی ماہیت اور اہمیت " چھاپی گئی ۔ پھر اس علم کے مختلف موضوعات پر (ہمارے مزدور ۔ ہماری ریلیں ۔ ہمارے بینک) کئی مفید کتابیں نکلیں ۔ دہلی ہی میں جناب مولوی صاحب نے ایک ماہنامہ " معاشیات " جاری کیا تھا جس میں معاشی مسائل پر بحث اور تازہ معلومات چھاپی جاتی تھی ۔ اب یہ رسالہ انجمن کے دفتر کراچی سے شائع ہوتا ہے اور اہل علم خصوصاً

جامعی طلبہ اور اساتذہ اسے پسند کرتے ہیں۔

فلسفی اسپینسر کی کتاب کا ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" علی گڑھ کے دور میں چھپا اور بہت مقبول ہوا تھا۔ دہلی میں جرمن ماہر تعلیم جورج کرشین اسٹائنر کی ضخیم تصنیف اصل زبان سے اردو میں منتقل کی گئی۔ اس میں تعلیم کے ذہنی، اخلاق، علمی، عملی ہر پہلو پر ایسی تحقیق کے ساتھ جو صرف جفاکش جرمنوں کا حصہ ہے، بحث کیا کی ہے گویا بال کی کھال کھینچ لی ہے۔ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب نے اس کا ترجمہ کیا۔ انجمن سے دو جلدوں میں شائع کی گئی۔ اردو میں ایک نئے طرز کی کتاب "تعلیمی نفسیات" تالیف ہوئی جس میں بچوں کے مذاق اور طریق تعلیم پر نہایت مفید معلومات جمع کی گئی ہے۔ جاپان کے جدید تعلیمی نظام پر (سر) سید راس مسعود مرحوم نے جو اسی مشاہدے کے لیے ریاست حیدرآباد سے وہاں بھیجے گئے تھے، مفصّل کتاب لکھی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ (= "جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق") انجمن نے شائع کیا۔ صحافت نویسی کی تعلیم پر چودھری رحم علی صاحب الہاشمی نے ایک دل چسپ کتاب تالیف کی جو ان کے عملی اور تعلیمی تجربات کا خلاصہ ہے۔ انہی کی ایک اور معلومات عامہ کی کتاب "۱۹۴۱ء کی مردم شماری" بھی انجمن کی فرمائش سے لکھی گئی جس میں ہندستان کی آبادی، السنہ اور خواندگی کے متعلق مفید و مستند اعداد دئے ہیں۔ لیکن زبان کی تحقیقات کے بارے میں سب سے کارآمد سلسلہ "جائزۂ زبان اردو" کے نام سے تیار کرایا جارہا تھا جس کی صرف پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس میں جناب مولوی صاحب کے حسب ہدایت، ان کے سوال نامے کے جواب میں راج پوتانے کی تمام دیسی ریاستوں (اور اجمیر) کی کیفیت صحت کے ساتھ قلم بند کی گئی تھی کہ وہاں اردو کی پہلے کیا حالت تھی اور پھر کن وجوہ سے کس حد تک متغیر ہوئی۔ ہر جگہ مختلف اہل علم و آگاہی نے حالات فراہم کئے اوراس طرح بیش قیمت تاریخی معلومات کا یہ مجموعہ مرتب کر کے چھاپا گیا تھا۔

—0—

مذہبی مباحث اور قانون پر بھی تین چار کتابیں طبع ہوئیں (= القول الاظہر، حقیقت اسلام، قانون جنایات، وغیرہ) زبان، رسم الخط، اور لسانی مسائل پر

علاحدہ رسائل شائع ہوتے رہے۔ پھر خود رسالۂ اردو اور اخبار ہماری زبان یا قومی زبان میں بارہا ایسے مضامین چھپے جو مستقل کتابوں کی قدر و منزلت رکھتے ہیں ۔ اس مختصر کتاب میں ان سب کا احاطہ کرنا دشوار ہے ، مذکورۂ بالا مطبوعات پر بھی مفصل تبصرہ نہیں کیا گیا ۔ ایسے ناظرین جن کو انجمن کے صرف عام حالات سے دل چسپی ہے، طوالت سے گھبرائیں گے۔ ہمارا مقصد بھی اس باب میں انجمن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات کا یکجائی خاکہ پیش کردینا ہے کہ قومی زبان ، بلکہ یوں کہیے کہ قومی تہذیب اور ذہنی ترقی کے رمز شناس غور کریں کہ گذشتہ پچاس ، خصوصاً آخر کے چالیس برس میں اتنا مفید مسلسل کام ممالک ہندستان کے کس علمی ادارے نے انجام دیا ہے ؟ بے شبہ انجمن کی تمام سرگرمیاں ، اس کی پوری زندگی اور نشو و نما شخص واحد کے غیر معمولی اخلاص و انہماک ، ذاتی قابلیت اور غیر منقطع جد و جہد کی رہین منت ہیں ۔ یہ شخصیت ، اسلامی ہند میں بے غرض خدمت اور ایک ملی مقصد کے لیے اپنی ذات کو وقف و فنا کردینے کی حیرت انگیز مثال بن گئی ہے ۔ ان اوصاف اور ذاتی کمالات کی تصویر کھینچنا جناب مولوی صاحب (متعنا اللہ بطول بقائہ) کے سیرت نگار کا کام ہے۔ ہمیں یہاں انجمن ترقی اردو سے بحث ہے کہ پچاس برس کے کام دیکھ کر اسے قوم کا مفید ترین مثالی ادارہ کہنا بجا ہوگا ۔ اب یہ فرض اہل پاکستان ہی پر عائد ہوتا ہے کہ ایسے گراں بہا ادارے کو پوری قوت سے قائم و دائم رکھیں اور اس کے شاندار علمی اور تعلیمی منصوبوں کو بروے کار لانے میں دل و جان سے مدد کریں ۔

پنج سالہ علمی منصوبہ

انجمن کا تعلیمی نصب العین پاکستان میں اعلیٰ درجے کی یونی ورسٹی (یا یونی ورسٹیاں) قائم کرانا ہے جس میں علم و فن کی انتہائی تعلیم و تحقیقات کا ذریعہ اردو زبان ہو ۔ باب ہفتم میں انجمن کے اردو کالج کراچی کی کیفیت عرض کی گئی ہے ، جہاں جدید " فنون " کی جامعی تعلیم (ایم اے تک) اردو میں دی جارہی ہے ۔ تین چار سال میں طلبہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہوگئی ہے اور اب اس میں مغربی سائنس کی جماعتیں (ایف ایس سی) بھی کھول دی گئی ہیں ۔ ایک حد تک انہی تعلیمی مقاصد کو تقویت دینے کے لیے اور مہیندی اہل علم سے مشاورۃ اور غور

و بحث کے بعد انجمن کا پنجسالہ علمی منصوبہ مرتّب ہوا ہے۔ یہ علاحدہ چھاپ کر شائع کیا جاچکا ہے۔ یہاں ہم اس کا ضروری خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ منصوبے کے تمہیدی فقرات یہ ہیں:

”انجمن ترقی اردو کی شروع سے کوشش و آرزو ہے کہ ہماری زبان دنیا میں سب سے ترقی یافتہ زبانوں کی طرح علم کی دولت سے معمور ہو۔ پاکستان کی آزاد مملکت قائم ہونے کے بعد یہ مقصد ایک ضروری فرض بن گیا ہے کیوں کہ اب ہمیں اقوام عالم کی مجلس میں عزت کا مقام حاصل کرنا ہے اور یہ مرتبہ صحیح معنی میں حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہماری قومی زبان اعلیٰ تہذیب اور جدید علوم کی زبان نہ تسلیم کرلی جائے۔ اس مقصد کے لیے انجمن اب تک جو خدمت انجام دے چکی ہے، بزرگان قوم کو موقع ملے گا کہ انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی پر اس کا جائزہ لیں۔ اس غرض سے انجمن کی سوانح اور جدو جہد کی ایک مختصر مگر جامع روداد علاحدہ مرتب کی گئی ہے۔ لیکن جن علمی کاموں کا اس نے اب بیڑا اٹھایا ہے اور آئندہ چند سال کے اندر انہیں تکمیل کو پہنچا دینا چاہتی ہے، ان کا خاکہ ذیل میں اہل علم اور اکابر ملت کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اسے بغور ملاحظہ کریں اور اپنے تعاون اور مشورے سے انجمن کو مستفید فرمائیں“۔

پہلے چند لغات تیار کرنے کی تجویز کی گئی ہے یعنی:—

(۱) لغت کبیر اردو، جو بڑی تقطیع کے تقریباً آٹھ ہزار صفحات پر آٹھ جلدوں مین چھاپی جائے گی۔ پہلی لغات سے الفاظ و محاورات زیادہ ہونے کے علاوہ ان الفاظ کی اصل اور تاریخ بتائی جائے گی۔ جدید علمی اصطلاحات شامل کی جائیں گی۔ اس لغت کے لیے پہلے سے وافر مصالحہ جمع کیا جارہا ہے۔ توقع ہے کہ جناب مولوی صاحب کی نگرانی میں دو مدد گار پانچ سال میں کتاب کی تکمیل کرسکیں گے۔

(۲) مصطلحات علوم جدیدہ۔ ”ایک اہم اور بنیادی کام جدید علوم کی مصطلحات کی جامع لغات شائع کرنا ہے جو سائنس اور زبان کے ماہرین کے اشتراک عمل سے تیار کی جائے گی“، اس غرض کے لیے چند مترجم اور ایک مدیر اعلیٰ،

نیز مناسب عملہ مقرر کرنا ہوگا۔ ماہرین کے مشورے کے لیے سفر خرچ اور ضروری کتابوں کی خرید کے معقول مصارف برداشت کئے جائیں گے۔ پوری کتاب ہزار ہزار صفحات (تقطیع کلاں) کی کم سے کم چار جلدوں میں چھاپی جائے گی۔

منصوبے میں عربی اردو لغت (۲ جلد) اردو انگریزی لغت ، اور (۳) اردو بنگالی لغت کی تالیف و طباعت کے بعد ، ایک خاص تجویز ''کتب اردو کی مکمل فہرست'' تیار کرنے کے متعلق تحریر ہے :۔ ممالک ہند میں اتنی وسعت اور کثرت آبادی کے باوجود بڑے کتب خانے معدودے چند اور کتب اردو کے ذخیرے نہ ہونے کے برابر تھے ۔ پاکستان میں لاہور کے دو سرکاری کتب خانوں کے سوا کوئی قابل ذکر ذخیرہ نہیں پایا جاتا ۔ اس کمی سے بڑی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ پڑھے لکھے اشخاص بھی اردو ادبیات کی وسعت اور اس کے گذشتہ کاموں کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے ۔ انجمن ترقی اردو کئی سال سے اس فکر میں رہی کہ سب کتابیں ایک جگہ جمع نہ کرسکے تو کم سے کم ایک جامع فہرست کتب تفصیل و تحقیق سے مرتب کرکے چھاپ دے جس سے ہماری قومی زبان کا علمی مرتبہ واضح ہو ۔ اس فہرست کی دو جلدیں صرف مخطوطات کے نام ، مقام اور کیفیت بتائیں گی ۔ کم سے کم چار جلدوں میں مطبوعہ کتب کی مضمون وار فہرست دی جائے گی ۔ ہر جلد بڑی تقطیع کے تقریباً پانچ سو صفحات پر چھپے گی اور یقین ہے کہ اعلیٰ درجہ کا ماخذ معلومات ثابت ہوگی ....
(۷) ایک '' تاریخ ادب اردو '' دس جلدوں میں تالیف کرنی مقصود ہے جس میں ہر دور کے تمام اردو مصنفین کے حالات اور تصانیف بیان کی جائیں اور ادبی تحریکات کا جائزہ لیا جائے (۸) آخر میں ایک ضخیم و جامع '' تاریخ ممالک عالم '' کی تجویز درج ہے جس میں نوع انسان کی ابتدائی سرگزشت کے بعد مشہور اقوام و ممالک خصوصاً موجودہ اسلامی ملکوں کی تاریخ اس طرح لکھی جائے گی کہ ہر جلد بجائے خود مکمل ہو اور سب مل کر مربوط سلسلہ بن جائیں ۔ یہ قاموس تاریخ بارہ جلدوں پر مشتمل ہوگی ۔

پنج سالہ منصوبے کا دوسرا اور علمی اعتبار سے اہم تر حصہ سائنس کی مجوزہ کتابوں کی صراحت کرتا ہے ۔ اس کی مسلمہ طور پر نوقسمیں ہوتی ہیں :۔ (۱)

عام سائنس (۲) زراعت ، باغ بانی ، جنگلات (۳) حیاتیات ، موالید ثلاثه - (۴) طب اور فعلیات (۵) ریاضی اور فلکیات (۶) طبعیات (۷) کیمیا (۸) ارضیات و جغرافیه (۹) انجنیری ، صناعات - هر قسم کے لیے درسی ، معلوماتی اور عام فهم کتابیں اور هر علم کی شاخ کے واسطے الگ الگ مقالات و رسائل تیار کرنے کا مفصل نقشه بنایا گیا هے - مجموعی طور پر درسی کتابیں ، ۳۰ (تخمینه صفحات ۱۰ هزار) علمی کتابیں ، ۴۰ (صفحات ۳۶ هزار) خاص موضوعات ، ۹۰ کتابیں (۱۳ هزار صفحات) عام فهم اور متفرق کتابیں ، ۵۴ (۱۹ هزار صفحات) غرض سائنس پر کُل ۲۲۰ نئی کتابیں لکھوائی جائیں گی - اس کام کے لیے لامحاله تجربه کار اهل علم کی ایک جماعت اور معقول عمله فراهم کرنا هوگا - سائنس کی جدید ترین مستند کتابوں اور ماهرین فن سے مدد لی جاے گی - سائنس کی مجوزه کتابوں کی تیاری اور طباعت کے مصارف کا تخمینه گیاره لاکھ اور قسم اول کی ادبی کتابوں کا چھ لاکھ تیس هزار روپیه کیا گیا هے مدت کار پانچ سال قرار دی گئی هے - مطبوعه منصوبے کے الفاظ میں : " اس طرح ، ادبی اور سائنس کی پیش نظر جمله کتابوں کی تیاری میں کوئی ساڑھے تین لاکھ روپیه سالانه کا خرچ آئے گا جو علم اور قومی زبان کی ترقی کے لیے کوئی بڑی رقم نهیں هے جب که هم سمجھتے هیں که ان کتابوں کے شائع هو جانے کے بعد هماری زبان دنیا کی علمی السنه کی صف اول میں شامل هونے کا استحقاق حاصل کرلے گی . . . و ماذلک علی الله بعسیر ! "

انهی کلمات پر ، اس مخلصانه گزارش کے ساتھ که محبان وطن اور اپنی ملت کے سچّے بهی خواه جناب مولوی صاحب کے منصوبۂ عالیه کو حقیقت ثابته بنانے میں مدد فرمائیں ، انجمن ترقی اُردو کی یه پنجاه ساله روداد تمام کی جاتی هے -

Vol 32 JULY & OCTOBER 1953 Nos. 3 & 4

THE QUARTERLY JOURNAL

URDU

Golden Jubilee Number:
"Fifty Years History of the Anjuman"

●

—Compiled by—

Syed Hashimi Faridabadi
Joint Secretary Anjuman Taraqqi Urdu Pakistan

PUBLISHED BY
ANJUMAN TARAQQI-E-URDU
PAKISTAN

Price Rs. 2-8

Anjuman Press, Lawrence Road, Karachi-3